

شہرِ کونک

ابو دھیرے! من فضل بادشاہ

کے تاریخی سیب فرا
اور غم و غم و غم

شہر کا بیسرا احمد

RC

2933

شہر اولیاء

یعنی

اجودھیا و فیض آباد کے بزرگان دین و مشائخ
علماء و شہداء کے حالات اور اس توأم شہر
کے
نشیب و فراز کی مستبر آموز تار و پود

مرتبہ

(ڈاکٹر) دبیر احمد

ناشر: دانش بکڈ پوچوک ٹانڈہ (فیض آباد)

نظام پرنسٹن ٹانڈہ فیض آباد

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام مصنف _____ ڈاکٹر دبیر احمد
نام کتاب _____ شہر اولیاء
مطبع _____ نشاط آفٹ پریس ٹانڈہ ضلع فیض آباد
ناشر _____ دانش بکڈپو ٹانڈہ فیض آباد
تعداد اشاعت _____ ایک ہزار
قیمت _____ ۲۵/-
سنہ اشاعت _____ ۱۹۹۱ء
ایڈیشن _____ بد سوم

فہرست مضامین

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
۲۲	نظم و ضبط کے لئے فوج	۱۷	تفصیلات متعلقہ کتاب لہذا	۱
۳۶	نواب ابوالمنصور صفدر جنگ	۱۸	فہرست	۲
۲۷	نواب صفدر جنگ - کردار و شخصیت	۱۹	الحمد للہ	۳
۴۵	بنگلہ سے فیض آباد تک	۲۰	ایک بات	۴
۴۵	فیض آباد کی کشش و قدر دانی	۲۱	شہر اور دھ اور آریہ قوم	۵
۴۸	ولادت شجاع الدولہ	۲۲	عزم و حوصلہ کا صلہ	۶
۴۹	خاندان وزارت میں شادی	۲۳	رام چند رجبی کا مثالی کردار	۷
۵۲	سرہند کی فتح	۲۴	کھجنگ کی دین	۸
۵۲	صوبیدار سے نواب وزیر	۲۵	اجودھیہ سے مسلمانوں کا تعلق	۹
۵۶	نواب صفدر جنگ کی موت	۲۶	یہ جائے عبرت ہے	۱۰
۵۷	مصلحت وقت کی مجبوری	۲۷	سلطنت اور دھ کا قیام	۱۱
۵۸	ناگفتہ بہ	۲۸	ہریانہ الٹک - شخصیت و کردار	۱۲
۶۰	قیح افعال کے پیشرو	۲۹	ہریانہ الٹک پر الزام	۱۳
۶۲	شجاع الدولہ - بد عہد و بیرحم	۳۰	معافیاں اور جاگیریں ضبط	۱۴
۶۳	ایک منفرد زاد راہ	۳۱	اور جب شام ہو گئی	۱۵
۶۳	شجاع الدولہ - بیماری و موت	۳۲	یہ دور اندیشی تھی	۱۶

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۳۳	شجاع الدولہ کے متوقع جانشین	۶۵	۵۱	شام اودھ — مرحوم فیض آبادی کی	۹۴
۳۴	مرزا یحییٰ علی خاں		۵۲	ایکے وقتوں کے ہیں یہ لوگ	۹۷
۳۵	مرزا سعادت علی خاں	۶۷	۵۳	مسجد ٹاٹ شاہ — اور ٹاٹ شاہ	۹۸
۳۶	نواب شہامت علی خاں	۶۸	۵۴	ٹاٹ شاہ کا حجر آباد رہا	۱۰۱
۳۷	آصف الدولہ کی نسبت شادی	۷۰	۵۵	ٹاٹ شاہ مسافر خانہ	۱۰۲
۳۸	خزاں بردوش بہار	۷۳	۵۶	موتی مسجد — علاقہ موتی مسجد	۱۰۳
۳۹	آصف الدولہ کی ہوس حکمرانی	۷۳	۵۷	بہاروں کا یہ مسکن	۱۰۴
۴۰	اور تیرگی حکمران ہو گئی	۷۵	۵۸	وقت کتنا بدل گیا	۱۰۵
۴۱	طوفان گذر جانے کے بعد	۷۶	۵۹	مولانا شاہ نیاز احمد	۱۰۶
۴۲	فیض آباد — ہو سیکم کے بعد	۷۹	۶۰	یہ وقت کی بات ہے	۱۱۰
۴۳	مرحوم فیض آباد	۸۳	۶۱	بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے	۱۱۲
۴۴	معذرت	۸۵	۶۲	گڈڑی بازار بنام بوبہ بازار	۱۱۳
۴۵	یہ تو ام شہر ہے	۸۵	۶۳	فن تعمیر کا نمونہ — خورد محل	۱۱۶
۴۶	ان کا ذکر		۶۴	یہ خورد محل ہے !	۱۱۷
۴۷	یہ فیض آباد ہے	۸۷	۶۵	ان راستوں سے	۱۱۸
۴۸	نواب حسن رضا خاں شخصیت تحاریر	۸۸	۶۶	مالک کی مسجد	۱۱۹
۴۹	مستر جون برٹلو کا مشورہ	۹۰	۶۷	گنبد بخشی بابا	۱۲۱
۵۰	جمہور جماعت — فیض آباد میں	۹۲	۶۸	جنگی شہید کا مزار	۱۲۳

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
۱۲۹	مسجد حاجی اقبال خواجہ سرا	۸۷	عجیب قبریں	۶۹
۱۵۰	حوض مسجد حاجی اقبال خواجہ سرا	۸۸	تخریر یا نشانات	۷۰
۱۵۱	درگاہ حضرت بڑی بوا صاحبہ	۸۹	سونے کے سکوں کا دھینڈ	۷۱
۱۵۲	مرمت درگاہ حضرت بڑی بوا	۹۰	خزانہ کاراز کھل گیا	۷۲
۱۵۳	بڑی بوا صاحبہ کی توجہ کا اثر	۹۱	مستندہ کی ایمر جنسی میں	۷۳
۱۵۴	بڑی بوا کا سالانہ عرس	۹۲	خزانہ کی سرکاری تلاش	۷۴
۱۵۴	مزار الہی بخش مجذوب	۹۳	بھوٹ جو پچ پر بھاری رہا	۷۵
۱۵۶	تین بزرگوں کی قبریں	۹۴	افواہ سے حقیقت تک	۷۶
۱۵۷	غیر معروف مقبرے	۹۵	اور پچ کیا ہے !؟	۷۷
۱۵۷	تالاب حاجی اقبال خواجہ سرا	۹۶	بکسر کی جنگ کا اثر	۷۸
۱۵۸	مزار لعین دلے بابا	۹۷	شجاع الدولہ نواب تھے	۷۹
۱۵۹	شہداء کی کرامت	۹۸	راجا گاجا شہید	۸۰
۱۶۱	وقف باری تعالیٰ قبرستان	۹۹	سید سالار کے جہاد کے شہداء	۸۱
۱۶۱	مزار مالک شاہ مجذوب	۱۰۰	چاہ صحت	۸۲
۱۶۲	سنگی لوح	۱۰۱	حاجی اقبال خواجہ سرا کا مقبرہ	۸۳
۱۶۳	نعل شاہ باز قلندر کا چلہ	۱۰۲	مسلم شہید خانہ بڑی بوا	۸۴
۱۶۵	بھائی خاں شہید کی درگاہ	۱۰۳	کچھ اور مقابر	۸۵
۱۶۶	مزار نعل خاں شہید	۱۰۴	یہاں دھینڈ ہے یہی پتہ معلوم	۸۶

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱۰۵	درگاہ حضرت شہید علیہ السلام	۱۶۶	۱۲۳	مزار پاتی شاہ	۱۸۵
۱۰۶	مسجد محمد علی گنگ	۱۶۷	۱۲۴	روضہ زین العابدین	۱۸۶
۱۰۷	مزار حضرت شہید علیہ السلام	۱۶۸	۱۲۵	مسجد حضرت زین العابدین	۱۸۸
۱۰۸	مزار حضرت ایوب علیہ السلام	۱۶۹	۱۲۶	مزار بنی بنا شاہ	۱۸۸
۱۰۹	مزار حضرت جلال الدین	۱۷۰	۱۲۷	مزار سید جلال شاہ	۱۸۸
۱۱۰	چاہ شفا	۱۷۱	۱۲۸	مزار شاہ بدیع الدین	۱۸۹
۱۱۱	ایک شگ کی کتبہ	۱۷۲	۱۲۹	مقبرہ تین درویش	۱۹۰
۱۱۲	مزار خلیفہ حضرت نظام الدین اولیاء	۱۷۳	۱۳۰	نوکری قبر	۱۹۲
۱۱۳	مزار اولیاء اللہ	۱۷۴	۱۳۱	کشتی نوح کی حقیقت اور تلاش	۱۹۳
۱۱۴	بزرگوں کے مزارات	۱۷۵	۱۳۲	کشتی نوح اور کوہِ اراراط	۱۹۴
۱۱۵	گدی شاہ کا قبرستان	۱۷۶	۱۳۳	کوہِ اراراط کی ایک اور تصدیق	۱۹۵
۱۱۶	مسجد پانچی شاہ	۱۷۷	۱۳۴	حکومت ترکی کے ماہرین کا خیال	۱۹۵
۱۱۷	خانقاہ و مزارات سید رحیم الدین وغیرہ	۱۷۸	۱۳۵	اخبار گنگز ہر لڈ کی اطلاع	۱۹۶
۱۱۸	مزار میر جینا	۱۷۹	۱۳۶	شہنشاہ روس کی دلچسپی	۱۹۷
۱۱۹	مزار پانچی شاہ	۱۸۰	۱۳۷	کشتی نوح کی اطلاع اُسٹریا ریڈیو سے	۱۹۷
۱۲۰	مزار بہار شاہ	۱۸۱	۱۳۸	حکومت ترکی کے سرے کا نتیجہ	۱۹۸
۱۲۱	مزار مکی شاہ	۱۸۲	۱۳۹	کشتی نوح کوہِ جودی پر	۱۹۸
۱۲۲	مزار قطب شاہ	۱۸۳	۱۴۰	کشتی نوح کا عرض و طول	۱۹۹

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱۴۱	ہواست یوزورستی کے ذکر کا بیان	۱۹۹	۱۵۹	بند گنبد	۲۱۸
۱۴۲	آری جیوڈینک قبر گاہ کے آہرن	۱۹۹	۱۶۰	مزار کمال الدین خبید	۲۲۳
۱۴۳	کشتی نوح موجود ہے۔ مگر کہاں؟	۲۰۰	۱۶۱	مسجد قلعہ مبارک	۲۲۴
۱۴۴	کیوڑا مسجد	۲۰۱	۱۶۲	مسجد سورگ دوداری	۲۲۵
۱۴۵	مزار تقی الدین اودھی	۲۰۲	۱۶۳	ایک عالیشان مسجد	۲۲۶
۱۴۶	درگاہ علم بخش		۱۶۴	یہ بھی ہوا تھا	۲۲۸
۱۴۷	مزار خواجہ کڑے شاہ	۲۰۳	۱۶۵	مسجد امیر الدولہ حیدر بیگ	۲۲۹
۱۴۸	مزار قاضی طیب	۲۰۶	۱۶۶	مقبرہ امیر الدولہ حیدر بیگ	۲۳۱
۱۴۹	خور دکر	۲۰۶	۱۶۷	مزار و مقبرہ شاہ ابراہیم	۲۳۲
۱۵۰	مزار علار الدین خورسانی	۲۰۷	۱۶۸	مزار شاہ علی اکبر چشتی مودودی	۲۳۳
۱۵۱	مزار مسافر شاہ	۲۰۸	۱۶۹	مزار پیر کشانی	۲۳۴
۱۵۲	مزار شمس الدین فریادرس	۲۱۱	۱۷۰	چاہ صحت	۲۳۵
۱۵۳	مزار سید شاہ عثمان	۲۱۳	۱۷۱	خانقاہ و مزار شاہ فتح اللہ	۲۳۶
۱۵۴	مزار جمال ادیب	۲۱۵	۱۷۲	مرمت خانقاہ شاہ فتح اللہ	۲۳۷
۱۵۵	مزار حضرت کمال الدین	۲۱۶	۱۷۳	مزار شاہ قاسم	۲۳۸
۱۵۶	مسجد فریدی	۲۱۶	۱۷۴	درگاہ حضرت مخدوم بندگی نظام	۲۳۸
۱۵۷	مزار فرید الدین قتال	۲۱۷	۱۷۵	مزار شاہ درویش	۲۳۹
۱۵۸	مزار کالے پہلوان	۲۱۷	۱۷۶	مزار چپ شاہ وغیرہ	۲۴۰

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱۷۷	خانقاہ شاہ مظفر	۲۵۰	۱۹۵	مزار نور الدین شہید	۲۷۱
۱۷۸	مزار شاہ عبدالحق	۲۵۱	۱۹۶	سبب تعمیر جامع مسجد بابری	۲۷۵
۱۷۹	مزار شاہ جمال گوجری	۲۵۲	۱۹۷	ہنویان گڑھی کی تعمیر کا حال	۲۷۹
۱۸۰	بابری مسجد	۲۵۵	۱۹۸	واجہ علی شاہ کے زمانہ کا پہلا معرکہ جہاد	۲۸۲
۱۸۱	مزار پیر نصیر الدین	۲۵۷		از مولوی عبد الکریم	
۱۸۲	مزار بزرگ نصیر الدین	۲۵۷		از منشی رام سہائے تنہا	
۱۸۳	مزار قاضی قدوسی	۲۵۸		از محمد نجم العفیٰ خان	
۱۸۳	مزار خواجہ ہٹی شاہ	۲۶۰		از مزار جب علی بیگ سرود	
۱۸۵	مزار یقین شاہ	۲۶۱	۱۹۹	واجہ علی شاہ کے زمانہ کا دوسرا معرکہ جہاد	۲۹۸
۱۸۶	ہنویان گڑھی			ربطابق تاریخ اودھ	
۱۸۷	شاہ محمد یار کا قبرستان	۲۶۳		افضل التواریخ	
۱۸۸	قبر شاہ سبحان	۲۶۴		فسانہ سعادت	
۱۸۹	مزار سید السلطان حضرت مولیٰ عاشق	۲۶۵	۲۰۰	مولوی سید محمد مجتہد العصر	۳۱۸
۱۹۰	مزار عثمان شہید	۲۶۶	۲۰۱	حدیقہ شہیدار کی تحریر	
۱۹۱	مزار حضرت جلال شاہ	۲۶۷		چند حقائق متعلقہ جہاد مولوی	
۱۹۲	مقبرہ شاہ ادیس	۲۶۸		ایسے ہی	۳۲۷
۱۹۳	مزار عاشق شاہ	۲۶۹			
۱۹۴	مزار سید عالم	۲۷۰			

عکسِ ناشی

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ قدر دانوں نے اس کتاب (خبر اولیاء) کا نہایت گرجبوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ اور ایک قلیل ترین مدت میں اس کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ اس حوصلہ افزائی اور قدر دانی کیلئے ہم اپنے تمام معزز قدر دانوں کا دلی شکر یہ ادا کرتے ہیں۔

کتاب کی زبردست مانگ کے پیش نظر اس کا دوسرا ایڈیشن مفید اضافوں اور تصحیح کے بعد پیش کر رہے ہیں۔ یہی قومی امید ہے کہ یہ اضافہ شدہ دوسرا ایڈیشن پہلے ایڈیشن کے مقابل میں زیادہ مفید اور معلوماتی ثابت ہوگا۔ اور قدر دانوں میں شرفِ قبولیت حاصل کرے گا۔

ناشر

بہارِ پریس

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْحَمْدُ لِلَّهِ

الْحَمْدُ لِلَّهِ کہ ذاتِ ہے ہمتا کی عنایتِ ہے پایاں نے میرے جذبِ بادیہ پائی
کی اس حاصلِ آبدہ پائی دِشہرِ ادبیار کو کسی کے نام معنون کرنے کی توفیق نہ دے کر غیرت
خودداری کے وقار کی آبرورکھ یا اور اَلْحَمْدُ لِلَّهِ کی حقیقت و عظمت کو سمجھنے کی عظیم
سعادت سے نوازا۔

سید

الْحَمْدُ لِلَّهِ

”تعریف اللہ ہی کیلئے ہے“ یہ ایک حقیقت ہے جس سے
مخلوق پرستی کی جڑ کاٹ جاتی ہے۔ دنیا کی ہر چیز جس شکل میں بھی
کوئی عسّٰن کوئی خوبی کوئی کمال رکھتی ہے، اس کا سرچشمہ
اللہ تعالیٰ ہی کی ذاتِ پاک ہے۔ کسی مخلوق کا کمال ذاتی نہیں۔
ہم اسی کے احسان مند اور شکر گزار ہیں۔ وہی ”خالقِ کمال“ ہے۔

ایک بات

”ان کو یاد رکھئے جنہوں نے اپنا آج، ہمارے کل کے لئے وقف کر دیا جنہوں نے اپنی باتیں اس لئے جاگتے گزاریں کہ ہمارے دنوں کا کالک دور ہو جائے۔ جنہوں نے اپنا آرام اس لئے تھج دیا کہ ہماری بے آرامیاں ہمیں تھکا نہ دیں۔ جنہوں نے اپنے انکار سے، اپنے کردار سے، چراغ روشن کئے کہ ہماری دنیا اندھی اور اندھیری نہ رہے۔“

علم تاریخ کے ہر طالب علم کو معلوم ہے کہ قوموں کی تاریخ میں اخلاقی اور دینی و روحانی حیثیت سے مد و جزر آتے رہتے ہیں۔ کوئی دور اخلاقی اور دینی و روحانی ترقی و مد و جزر کا ہوتا ہے۔ کوئی زمانہ اخلاقی اور دینی و روحانی تنزل و انحطاط کا ہوتا ہے۔ لیکن تاریخ کا طالب علم ان تغیرات و انقلابات کا خوگر ہوتا ہے۔ اس کی نگاہ میں ان اشیاء و افراد کی کوئی خاص اہمیت اور وقعت نہیں ہوتی جس کی بنا پر وہ کسی قوم کے اخلاقی اور دینی و روحانی انحطاط و تنزل سے خوف بندہ ہو۔

کسی قوم میں انقلابات و تغیرات اور انحطاط و تنزل کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی جتنی کہ اس بات کی اہمیت ہوتی ہے کہ اس قوم کے ضمیر میں زندگی کے کتنے آثار باقی ہیں؟ اُسے اپنے صالح اسلاف کے اعمال و افعال اور کردار و تعلیمات سے ابھی کتنا قرب و تعلق باقی رہ گیا ہے؟ کسی قوم کی اصل قوت حیات، اُس کے صالح بزرگوں اور

اسلاف کے اعمال و افعال اور کردار و تعلیمات ہی اصل "سرمایہ" ہیں۔ اگر اسلاف کا یہ "سرمایہ" کسی قوم میں محفوظ ہے تو اس قوم کی خودکشی یا موت کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا لیکن اقوام عالم کی تاریخ گواہ ہے کہ قوموں کی تاریخ، بد قسمتی سے کبھی وہ دور بھی آ جاتا ہے، جب کسی قوم کے پاس سب کچھ موجود ہوتا ہے لیکن ان کے صالح بزرگوں اور اسلاف کا "سرمایہ" نہیں ہوتا۔

جو قوم اپنے محسنوں کا اعتراف نہیں کرتی، اپنے لئے جینے والوں کو یاد نہیں رکھتی وہ اپنی ذات کے خول میں بند ہونے والوں کی افزائش کرتی ہے۔ افراد اپنے اپنے مفاد کے بندے بن جائیں تو قوم کا مفاد پائندہ نہیں رہتا۔ اور افراد کی زندگی قعر مذلت کی گہرائیوں میں بھٹکنے لگتی ہے۔

بد قسمتی سے، آج ایسی ہی کچھ صورت حال مسلمانوں پر بھی مسلط ہوتی جا رہی ہے وہ اپنے صالح اسلاف کے کارناموں، صحابہ کرام، رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین، بزرگان دین، اور اولیاء اللہ کی تعلیمات و انعال، وسیع الشرب، اخوت و محبت اور ایثار و قربانی کے زریں کارناموں سے دن بدن بے خبر ہوتے جا رہے ہیں اور ان سے محبت و عقیدت روز بروز کم سے کم ہو رہی ہے۔

اسلام کی اشاعت کے لئے سرکارِ دو عالم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اور اصحاب رسول اللہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین)، اور ان کے بعد بزرگان دین اولیاء اللہ، صوفیائے کرام اور اکابر مسلمان حکمرانوں نے جس قدر جاں فشائیاں کی ہیں اور مصیبتیں اٹھائی ہیں وہ اسلام کی تاریخ کا ایک تحیرانزا روشن باب ہے۔ یہ ایک سلیم شدہ حقیقت ہے کہ انسان جس قدر اپنے صالح بزرگوں سے اُنس

پیدا کرتا ہے، اتنا ہی اُس میں ان کے اوصافِ حمیدہ کی تقلید اور تعلیمات پر عمل کرنے کا مادہ تبدیل ہوتا جاتا ہے۔ بزرگوں کے آثار و مزارات کی زیارت سے قلب کی صفائی ہوتی ہے۔ روح بالیدگی حاصل کرتی ہے اور اُسے وہ کیف و سرور حاصل ہوتا ہے جس سے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کی توفیق عطا ہوتی ہے۔ تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ جس قدر بزرگانِ دین، اولیاء اللہ اور علماء و فضلاء اور صوفیاء و فقراء ہندوستان میں گزرے ہیں اتنے سرزمینِ غرب کو چھوڑ کر دنیا کے کسی اسلامی ملک میں نہیں گزرے خصوصاً شہرِ اودھ (اجودھیا) میں تو اس قدر اولیاء اللہ، بزرگانِ دین، علماء و فضلاء اور صوفیاء و فقراء پوند زمین ہیں کہ اکثر قدیم کتابوں میں اس شہر (اجودھیا) کو مدینۃ الاولیاء اور "خوردکھ" کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ اس سرزمین میں کیسے کیسے صاحبِ ہلال و جمال اولیاء اللہ، علماء و فضلاء اور بزرگانِ دین مدفون ہیں اس کا صحیح علم اللہ تعالیٰ ہی کو بہتر ہے۔

سرزمینِ شہرِ اودھ (اجودھیا) اور اس کے قرب و نواح میں جن بزرگانِ دین اولیاء اللہ اور علماء و صوفیاء و فقراء کے مقابر، مزارات اور خانقاہوں نیز مسلمان حکمرانوں کے تعمیر کئے ہوئے مقابر، مزارات اور خانقاہوں وغیرہ کی تعمیرات، جن کے ورودیوار کے آثار و باقیات میں عہدِ رفت کی لاتعداد تلخ و شیریں داستانیں بند ہیں اور جن کا ذکر متناف قدیم کتابوں میں مرقوم ہے یا جو سینہ بسینہ چلی آنے والی رہا ہے اسے معلوم ہوا، ان کے آثار و باقیات کو تلاش و تحقیق کے بعد، ان کے صحیح محل وقوع، اب اس حالت میں ہیں، پہلے کس حالت میں تھے؟ موجودہ پوزیشن کیا ہے؟ — مختصر حالات و اثرات مع حواشی ذمہ دارانہ احتیاط اور ممکنہ تحقیق و سند کے بعد۔ تحریر کرنے کی کوشش کیا ہے؟

امید ہے کہ زیر نظر کتب شہر اولیاء چھ موقوف کے شوقیادریہ پائی کی حاصل آبد پائی ہو
علم تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اور اولیاء اللہ و نیر گاہین دین سے عقیدت
رکھنے والے اصحاب کے لئے مفید ثابت ہوگی۔

اس حقیر کاوش میں جہاں ایک طرف مولوی فضل الرحمن، طارق منظور، زبیر احمد
دشادہ پریس ٹانڈہ، بی این بیگم، فریدہ بونٹ، زبیر احمد مسلم نسوان اسکول، ذغیرہ کی حوصلہ افزائی
شال میں وہی دور رسر جاکچھ اپنوں کے جذبہ حسد کا بھی اچھا خاصہ داخل ہے جن کی حوصلہ شکن
کوشش نے میرے عزم و ارادہ کو آہنی مزاج عطا فرمایا۔

بات ادھوری رہ جائے گی اگر ماسٹر عبدالجبار صاحب انچارج مسلم یتیم خانہ
ٹبری بو صاحب، ڈاکٹر سرور احمد خان، ایڈووکیٹ (فیض آباد) اور محمد باشم انصاری
محمد شفیع، نثار احمد فیض آباد، رحمت اللہ انصاری صاحب (جو دھیا) کا ذکر نہ کروں جی رہنمائی میں مجھے تمام
مزارات، مساجد اور تباہ ویرباد مدارس و خانقاہوں کے آثار و باقیات دیکھنے کی
سعادت نصیب ہوئی۔ اور قریبین و تنویر احمد صاحبان کا ذکر
بھی ضروری ہے کہ انھوں نے تصحیح و پرورش ریڈنگ کے صبر آزماء اصل کو برے
عزم و حوصلہ اور صبر و استقلال سے انجام دیا۔

دشادہ

۲۶ اپریل ۱۹۸۳ء جمعہ

سکشاں
ٹانڈہ ۲۲۳۱۹۰
فیض آباد (لوہی)

جس عظمت رفتہ کا نشان آئے تھے کل دیکھ
چلتے ہیں لئے پھر تجھے اے دل، وہیں چل دیکھ
اتر پردیش کے قابل دید اور عبرت آموز تاریخی و مذہبی تقدس کے حامل مقامات
میں شہر اودھ (اچودھیا) اور فیض آباد کو ایک مخصوص اور منفرد حیثیت حاصل ہے۔

شہر اودھ اور آریا قوم

اچودھیا (شہر اودھ) کی اہمیت اور تقدس اہل ہنود کے لئے اس بنا پر ہے
کہ اس سرزمین پر شری رام چندر جی آریائی نسل کے سورج جمنی خاندان کے ایک
راجہ، راجہ دسرتھ جی کے گھر میں تریتا جگ^۱ کے آخری زمانہ میں اوتار کے روپ میں

۱. ہشت مہینے کے قریب کے موجب رام چندر جی کی پیدائش تریتا جگ (वृताजग)
کے آخری زمانہ میں ہوئی تھی۔ تریتا جگ کی مدت بارہ لاکھ چھیانوے ہزار سال تھی۔ کلجگ
(वृताजग) کا زمانہ جو اس وقت چل رہا ہے اس کی مدت چار لاکھ تیس ہزار برس
تباہ لگتی ہے۔ سن بھری کے حساب سے سترہ ہجری تک زمانہ کلجگ کا پچھ ہزار ایک سو پچیس
ہزار برس عیسوی کے مطابق ۱۹۷۷ء میں تقریباً پانچ ہزار پانچ سو چودہ سال گزر چکے
ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک طویل مضمون الفرقان لکھنؤ کے اپریل ۱۹۷۷ء کے شمارہ
کے صفحہ ۲۱ پر بھی شائع ہو چکا ہے۔ ————— مؤلف۔

جنم لیا تھا۔ آری انگوٹوں نسل سے تھے جو شمال مغرب بعید کے علاقوں سے "علاقائی تقاضوں" کے دباؤ سے تنگ ہو کر ترک وطن پر مجبور ہوئے تھے اور درہ خیبر کے راستے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔ یہ لوگ نہ صرف شکل و صورت، رنگ و روپ اور ڈیل ڈول ہیں قدیم ہندوستانی باشندوں سے بہتر تھے بلکہ اپنی جرأت و شجاعت، عزم و حوصلہ اور تہذیب و تمدن کے لحاظ سے بھی انھیں یہاں کے قدیم باشندوں پر برتری و فوقیت حاصل تھی۔

ہندوستان کے قدیم باشندوں کی واہمہ پرست ذہنیت و مزاج اس حقیقت اور صداقت کو قبول کرنے کا مستعمل نہ ہو سکا کہ آریوں کی فتح و نصرت کا یہ سیلاب ان کے عزم و حوصلہ کی پختگی اور جرأت و شجاعت کا مہول منت ہے۔

عزم و حوصلہ کا صلہ

یہ آریوں کی فہم و فراست اور تجربات و دانائی کا کرشمہ تھا کہ انھوں نے اپنے بلند و بالا قد، انتہائی صاف و سرخ رنگ و روپ اور موروثی شجاعت و مردانگی نیز جفاکی و بربادی کی اعلیٰ انسانی صفات کو یہاں کے قدیم ہندوستانی باشندوں کے سامنے ان کی واہمہ پرست فطرت و مزاج کو مغلوب اور متاثر کر کے، اپنے آپ کو کچھ اس انداز اور حیثیت سے پیش کیا کہ وہ ان کو ایک مافوق الفطرت ہستی سمجھ بیٹھے اور بجائے اس کے کہ اپنی شکست و ہزیمت کے اسباب و علل کا جائزہ لے کر مستقبل میں ہوائی اقدامات کے وقت ان تجربات سے رہنمائی حاصل کرتے، انہوں نے ایک شکست خوردہ اور مغلوب قوم کی غلامانہ ذمیت کے انداز فکر سے اپنی شکست و ہزیمت کے گہرے

زخموں کو، بجائے مندمل کرنے کہ سعی کے صرف زخموں کے درد و میس کے افاقہ کے لئے جس مسکن مرہم کو تلاش کیا وہ اجتماعی قومی مفاد کے لئے، ممکن ہے کہ اُس وقت یہ رضی ملور ہے۔ کچھ وقفہ کے لئے "مسکن" ثابت ہوا ہو، لیکن اس کے اثرات مابعد اجتماعی قومی مفاد کے لئے خاصیتاً زہر قاتل تھے۔

یہ جہالت کے قدیم باشندوں کی شکست خوردگی اور غلامانہ ذہنیت کا عطیہ تھا جو ان کی موروثی واہمہ پرست فطرت نے خوف و ہراس کے شدید جذبات کے دباؤ سے مغلوب ہو کر، آریوں کے عادات و خصلت اور ان کے غزم و حوصلہ کی پختگی کو آیات غیر انسانی ہستی کا کائنات سمجھ کر اس طاع اجتماعی قومی احساس شکست و ذہنیت کی تسکین و دُخوں کا مداویہ فارغین (آریوں) کو کسی آسمانی مخلوق کی اولاد سمجھ لیا۔ اور ان کے فاتح قائدین اور سورماؤں کو اوتار اور دیوتا تسلیم کر کے، اپنے آبائی دیوتاؤں اور اوتاروں کی طویل صف میں شامل کر لیا۔ اور بے چوں و چرا اطاعت و فرمانبرداری کی محنت کا ہماری جہ کم طوق، انتہائی خندہ پیشانی کے ساتھ اپنی گونوں میں ڈال کر، ہمیشہ کے لئے سر نیاز خم کر لیا۔

رام چند رجبی کا مثالی کردار

اس سرزمین شہر اودھ ۱۶ جودھیا، میں شری رام چند رجبی نے والدین کی اطاعت و فرمانبرداری کی جو نملی اور قابل تقلید مثال قدیم ہندوستانی معاشرہ میں پیش کیا وہ یہاں کی آبادی کے لئے قطعی اجنبی تھا۔ اور شاید اس حقیقت کا اظہار بھی بے محل نہ ہو گا کہ آریوں کی آمد سے قبل کے ہندوستان کی قدیم تاریخ یا روایات میں ایسی

کوئی ایک بھی مثال نہیں ملتی جس میں کسی بیٹے نے اپنے باپ کے انتہائی نامعقول اور غیر منصفانہ حکم کی بجا آوری کے لئے اس قدر خندہ پیشانی اور سعادتمندی کے ساتھ سر تسلیم خم کیا ہو۔

رام چند رچی اطاعت شعاری و فرمانبرداری اور منشاءے مشیت پر راضی بہ رضا رہنا نیز ان کے ایشار و قربانی کے بے مثال کارنامے نہ صرف اس دور ہی میں لائق ستائش تھے بلکہ آج کی مضطرب انسانیت کے درد و کرب کا علاج بھی اس میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔

کلمجگ کی دین

آتے ہوئے کلمجگ اور جاتے ہوئے تریتا جگ کے طوفان فیز حالات کے تیز و تند دھاروں کے درمیان، سیتا جی کے ایشار و قربانی کے وہ پر خلوص والہانہ جذبات جس نے رام چند رچی کی زندگی کی پریچ شاہراہ کے ہر اندھیرے اجالے موڑ پر روشنی و سایہ بن کر رفاقت کا قابل تقلید حق ادا کیا ہے۔ سیتا جی نے "راج محل" کے عیش و آرام کو اپنے رفیق حیات کے قدموں میں ڈال کر ثابت کر دیا کہ ایک مشرقی ہندوستانی عورت، خواہ وہ "بہورانی" ہو یا "راج ماتا"، کا مقام معراج کیا ہے؟ یہ ایک عملی درس تھا جسے ایک مشرقی عورت نے "دیوی" کے عظیم مرتبہ سے بلند تر ہو کر دیا تھا۔ اور شاید اس وقت معاشرہ کی اصلاح کے لئے ایسے ہی عملی درس کی ضرورت رہی ہو۔

شہر اودھ (اجودھیا) کی سرزمین پر ہجرت اور لچھمن کی شخصیتیں بھی اپنے

اپنے کردار کی بلندی کی وجہ سے، ہمیشہ اُس تابندہ ستارہ کی طرح آسمان انسانیت کی بلندیوں پر چمکتی رہیں گی جو بھڑکے بھٹکے انسان کو اس کی کھوئی ہوئی منزل کا پتہ دیتے رہتے ہیں۔ بھرت اور لچمن نے برادرانہ شفقت اور شرم و حیا کے مشرقی تپا کے آداب و لحاظ کے وہ مثالی کردار پیش کئے ہیں جن کی عظمت و افادیت کی صدا ہر عہد کے انسان کی معاشرتی زندگی کی مشاطگی کرتی رہے گی۔

کلمبک کے نیاں سال کے طویل ترین زمانہ کے اثرات نے رآم و ستیا کے پیار و محبت، ایثار و قربانی، اطاعت شعاری و فرمانبرداری، شرم و حیا اور شفقت و

رفاقت کے زریں کارناموں کو، بے حس مورتیوں بھرے منہوں کے اس شہرے، اپنے سنگی جوں کی طرح، ان عظیم شخصیتوں کے کارناموں کو بھی بے جان بنا ڈالا۔ آج رآم اور ستیا کے وطن میں ان کی عملی تعلیمات کا کوئی شناسا نہیں۔ ان عظیم و پریشان شخصیتوں کا ترتیب دیا ہوا خول آج بس سرزمین پر عنقا ہے۔ رآم کا وجود حیا تو آج بھی وہی ہے، لیکن نہ کہیں رآم کی اطاعت شعاری و فرمانبرداری کا یہاں کوئی ادنیٰ سا پر تو ملتا ہے اور نہ ستیا کی عفت و عصمت اور خود پرہیزگی و غم گساری کا کہیں نام و نشان۔ نہ جدت کی شفقت و مروت کی کہیں جھلک ملتی ہے، نہ لچمن کے حاذ و پاس ادب اور غیرت و شرافت کا شاہ۔ آج کو شلیا کے منہ و تحمل اور صبر و استقلال کی آبرو کو، اسی نگر کے باسی، سر بازار نیلام کرتے ہیں۔ کو شلیا کے حفظ و ناموس کا تحفظ کرنے

والا کوئی ایک فرد بھی یہاں نظر نہیں آتا، حالانکہ

ہر برہمن پسر لچمن و رآم است اینجا

اجودھیائے مسلمانوں کا تعلق

آرام و یقین کے اخلاف کے اس شہر سے مسلمانوں کا کس قدر گہرا تعلق رہا ہے؟ اس کا اندازہ اس ناقابل تردید حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ جس قدر اولیاء اللہ بزرگان دین، علما و فضلا اور موفیاء و فذرائس سرزمین کے بانیوں کو کفر و شرک اور جہل و ضلالت کے گھٹا ٹوپ اندھ دیاں سے نکالنے اور فسق و فجور کے دلدل میں ڈوب مرنے سے بچانے کے لئے اندرون و بیرون ملک سے یہاں تشریف لائے، اتنے ہندوستان کے کسی خطہ اس پر نہیں آئے۔ ان کے برگزیدہ بندوں کو اس سرزمین کی تقدس و عظمت اور آرام و یقین کے وطن کے بانیوں کو کفر و شرک کی آلودگیوں سے بچانے اور پاک رکھنے اور ہزاروں مجبور محض خداؤں کے سامنے سر جھکانے کے بجائے صرف ایک خدا سے وحدہ لا شریک کی بارگاہ میں سجدہ ریز کرانے کی کتنی سڑپ تھی؟ ان کے دلوں کو شمع وحدانیت سے منور کرنے کی کتنی متناہی؟ اس کا صحیح اندازہ کرنا قطعی محال ہے۔ اسکی اصلاح اور ترویج نفس کی کتنی فکر دامن گیر تھی؟ ان سب کی گواہ وہ دو گز زمین ہے جس کے نیچے وہ آرام فرما ہیں اور جن کے اوپر ان کی قبریں بنی ہوئی ہیں۔ ان کے رشد و ہدایت کے مرکز، انکی خانقاہیں، ان کی تعمیر کی ہوئی پر شکوہ مساجد اور غز اخانوں کے آثار و باقیات، آج بھی اپنی زبان بے زبانی سے اپنے پر خلوص عزائم اور جدوجہد کی داستان سنا رہے ہیں۔ زمانہ کے بیدرد ہاتھوں تباہ کی ہوئی کی ہوئی خانقاہیں، ویرانی

مدارس و مساجد کے کھنڈرات . حدنگاہ تک پھیلے ہوئے قبرستانوں
اور گور غریباں میں آرام فرما اللہ کے برگزیدہ اصحاب کی قبروں پر نور الہی
کے نزول کا منظر . وسیع و عزیز قبرستانوں میں جہاں حسرت و پاسائیں
ڈوبی ہوئی رقت انگیز خاموشی کی حکمرانی ہوئی چاہئے تھی ، وہاں بھر وقت
ایک عجیب پر وقار اور ناقابل بیان ، رونق از نور نفاظاری رہتی ہے . ان
وسیع و عظیم قبرستانوں میں وہ جلیل القدر بستیاں پیوند زمین میں ہیں جس کے
جہاں سے آج ہی وقت کے چٹکی زبلا کو کا زہرہ آب ہوا جاتا ہے . یہاں کہیں
رب و جلال سے سرنگوں رہتی ہیں۔

بھابھ ایک ویرانہ ہے لیکن جو بھی آتا ہے

قدم زیدہ ، زیدہ ، نلہ زیدہ و زیدہ

یہ جاکے عبرت ہے

یہ شہرِ اجداد دھیا ، جو قابلِ تحسین بھی ہے اور جائے عبرت بھی یہاں وہ
لوگ بھی دفن ہیں جو اپنے مائتبیات میں زمانہ کا رخ موڑ دیا کرتے تھے . جنکی
بیم و شکستگی سے زندگی و موت کا خیر مقدم کیا جاتا تھا اور وہ لوگ بھی
پیوند زمین ہیں جنہوں نے محض اللہ کی رضا اور خوشنودی کے حصول کے لئے
گم کردہ راہ لوگوں کو اپنی آخری سادوں کا پیغام حق پہنچاتے رہے ، اور یہیں
پیوند زمین ہوئے . کس قدر عبرتناک منظر ہے یہاں کا ؟ موری اہم
شیشم کشن ، اعلیٰ جان دیوہ کے دیوہ پھل دشت کے یہ پر وقار منگل اور ان کی خوش
میں پیوہوں کی عطریں کیاریوں کے بجائے ، خود روخار دلہ پودوں کی گنجائ

جھاڑیاں جو ہر اتفاقاً گذرنے والے کے قدم قدم پر سبز رہ جاتی ہیں اور اس کے دامن کو پکڑ کر کہنا چاہتی ہیں :-

دیکھو انہیں جو دیدہ عبرت نگاہ ہو

یہ فخر، مہند و سسان میں صرف سر زمین اودھ جو دھیا، کو حاصل ہے کہ اس کی آغوش میں نہ صرف دو جلیل القدر انبیاء (علیہم السلام) محو خواب ہیں جن کے فیوض و برکات کا لازوال چشمہ آج بھی اپنے تمام جہاد و جلال کے ساتھ رواں دواں ہے ؛ بلکہ بشمار اویس اللہ بزرگان دین، صوفیا و صلحا اور فقراء و شہداء بھی یہاں زیر زمین آرام فرما ہیں جن کے تصرفات اور عنایات و توجہ سے بیشمار مخلوق خدا بلا عاظ کا فو و مشرک، ملحد و موحد، حسب استطاعت و بقدر ظرف، گل مراد سے اپنے دامن آرزو کو بھر رہی ہے اور اپنی تنگ دامانی پر شرمسار بھی ہے کہ :-

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی ہے

سلطنت اودھ کا قیام

اجودھیا شہر سے چار میل یا تقریباً چھ کلومیٹر مغرب، دریائے گھاگرا یا سر جو ندی کے داہنے کنارے پر اٹھارہویں صدی عیسوی کی ابتدائی دہائیوں کے درمیان جو سر زمین شاہان مغلیہ کی شان و شوکت اور جہاد و جلال کی نشاۃ ثانیہ

بکر شمالی ہندوستان کے "نق اقبال" پر جلوہ فگن ہوئی، وہ "جنگل" کے کیستی تھی۔
 جسے میر محمد امین نیشاپوری (سعادت خاں، برہان الملک، جو نہایت ہوشیار
 تیار مغز، ہر می و تیغ زن تھے اور دنیا میں بخت رسا اور طالع سکندری لیکر
 آئے تھے، ۱۷۰۸ء مطابق ۱۱۲۰ ہجری میں تن بہ تقدیر گھر سے نکلی کر
 جنت آزمائی کے لئے ہندوستان آئے اور بعد کو سلطنت نوابین اودھ کے
 بانی مہمان ہوئے۔

برہان الملک شخصیت و کردار

سعادت خان برہان الملک طبعاً مذہبی آدمی تھے اور اپنے آبائی عقیدہ (امامیہ
 کے فیض آباد) میں نام "جنگل سبتی" یا "جنگل" تھا، لکن بعد کا دبستان شاعری و تاریخ
 وجود صیام منفہ منش لپھی نارائن، مطبوعہ لپھی پریس گوئڈہ، سن طباعت ۱۹۲۳ء
 صفحات ۵۰۴۔

۴۔ میر محمد امین نیشاپوری (سعادت خاں برہان الملک) میر محمد نصیر امیرانی کے
 کے بیٹے تھے اور امامیہ مذہب کے پیرو تھے۔ مولف تاریخ اودھ نے جو بیس واسطوں
 سے جناب امام موسیٰ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے فرزند جناب زید (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے
 ملایا ہے جو قطعی غلط اور وصفی ہے۔ (دیکھئے مقدمہ بادشاہ بیگم)

کہتے ہیں کہ ایک دن اپنی بیوی زہوان کبریٰ میر محمد یوسف جاگیردار ایران کی
 دختر تھی اور میر محمد امین نیشاپوری انہیں کے بدلتکدہ پر بحیثیت خانہ داماد رہتے تھے
 — مولف کی زبان سے انتہائی تضحیک آمیز کلمات سن کر تامل لائے۔ صبر ضبط

مذہب) میں پختہ تھے۔ ان میں سنجیدگی و متانت بدرجہ کمال تھی بقول مقدمہ نگار
 گایارہ ماہ بخت آزمائی کے لئے آوارہ وطنی پر کمر باندھا۔ بہادر شاہ کے زمانہ
 یعنی ۱۷۸۸ء مطابق ۱۱۲۰ ہجری میں تن بہ تقدیر گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور
 ہندوستان آئے۔

شیخ تصدق حسین نے لکھا ہے کہ بعض مورخین کے نزدیک میر محمد امین
 نیشاپوری کے ہندوستان آنے کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے نیشاپور میں کوئی
 ٹھیکہ لیا تھا۔ جس میں بہت زیادہ خسارہ ہوا تھا۔ چنانچہ مرزا محمد یوسف جاگیردار
 (یعنی اپنے خسر) کی مان کے زیورات فروخت کر کے نہ نقصان ادا کیا، اور شرم
 کی وجہ سے ہندوستان چلے آئے (صفحہ ۱۴) لیکن مورخین کے اس بیان کو
 تسلیم کرنے میں مولف کتاب ہذا کوتاہل ہے کیونکہ ہندوستان آنے کے بعد میر
 محمد امین نیشاپوری (سعادت خاں برہان الملک) نے کبھی ایران کا رخ کیا ہی نہیں
 اگر بات صرف زیورات کے فروخت کر ڈالنے کے جرم تک ہی محدود ہوتی تو نواب دہ
 ہونے کے زمانہ میں زیورات کے قرض کو باسانی ادا کر کے سرخ روئی حاصل کر سکتے تھے
 میر محمد امین نیشاپوری نے ہندوستان آنے کے بعد، پہلے نواب سر ملند خاں (جو
 خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی کی اولاد سے تھے۔ ان کی شادی معزالدین جہاندار شاہ،
 بادشاہ دہلی کی دختر جہاں آرا بیگم سے ہوئی تھی) — قیصر التواریخ و تاریخ بیگمات اودھ
 در بیان افضل بیگم) عویہ دار گجرات کے یہاں سترہ روپیہ سکہ رائج الوقت ماہوار
 پر "میر منزل" (یعنی شاہی خیمہ نصیب کرنے والے عملہ کا افسر) کی خدمت پر مہر ہوئے
 (تاریخ ضیعی میں لکھا ہے کہ سترہ روپیہ ماہوار پر فراشوں میں ملازمت کی تھی) —

وقائع دلیپیر" — یہ زمین و طباط اور اودھ العزم و عالی حوصلہ، ہوشیار
 مولف، ۱۱۳۰ مطابق ۱۱۳۱ھ میں دہلی آنے اور فرشتہ کے زمانہ میں ایک نئی
 منصب حاصل کیا۔ مابعد محمد شاہ، جنکو اکثر مورخین نے محمد شاہ رخیلا لکھا ہے،
 شہنشاہ دہلی کو لقب الملک، امیر الامراء حسن علی خاں و حسین علی خاں، سادت
 بارہ درجنوں نے دربار دہلی میں اپنا اس قدر رزق ہمار کھا تھا کہ کڑکے تارخ میں انہیں
 بادشاہ سلاطینک سیکر کی ۱۱۳۰ء میں بھی لکھا گیا ہے "مولف" کے آئینہ بچوں سے
 پتہ لے نالوں ماں دراز، وادہ عام یہ حیدر کلانی رزقہ کیسا اشیوں میں، ایک شخص
 بھی تھے۔ چنانچہ ۱۱۳۰ء مطابق ۱۱۳۱ء میں میر محمد امین نیشاپوری کو سعادت فرا
 کے خطاب سے سرفراز فرما کر آگرہ کا گورنر اور مہتمم خاصان شاہی مقرر کیا تا سیکر
 اودھ صفحہ ۲۱

جس وقت صوبہ اودھ سے رعایا کی سرکشی اور منتطیں کی بد انتظامی کی خبریں
 میں شہنشاہ دہلی حضرت محمد شاہ کے کانوں تک پہنچیں تو سعادت خاں کو برہان الملک کا
 خطاب دیکر محمد شاہ بادشاہ نے ۱۱۳۰ء مطابق ۱۱۳۱ء میں محمد شاہ کو برہان الملک کا
 نیشاپوری کو برہان الملک کا خطاب دیا تھا۔ اودھ شاہی کا پس نظر تھا
 صفحہ ۲۱ از سید عجزیہ صوفیہ اور از حرمہ بن خرم و نشق کو قائم کرنے کے لئے
 اودھ روانہ کیا (مولف بیگمات اودھ نے اودھ میں آنے کا سن ۱۱۳۱ء لکھا
 ہے جو شاید کتابت کی غلطی ہے)۔ مولف، برہان الملک نے لکھنؤ میں
 شیخ زادوں کو زیر کر کے بیخج محل اور مبارک محل نامی مشہور عمارتیں رو در توت محل
 کیں اور صوبہ میں امن و امان بحال کر کے رعایا میں جان و مال اور عزت و آبرو
 کے تحفظ کا اعتماد بحال کیا۔

بیدار مغز، منتظم، جری اور تیغ زن ہونے کے ساتھ فطرتاً ساوگی پسند اور

میر محمد امین نیشاپوری، سعادت خاں برہان الملک نے اپنی نوابی کے سات سال کے زمانہ کا زیادہ حصہ اجودھیا میں گزارا۔ اجودھیا شہر سے تقریباً چھ کلومیٹر پیچھے، دریائے گھاگھرا کے کنارے پر اپنا مسکن بنوایا تھا۔ یہ مسکن کوئی آراستہ و تیراستہ کوٹھی یا سبھی سجائی حویلی نہ تھا بلکہ پھوس کا بنا ہوا ایک صاف ستھرا جھونپڑا تھا جو ایک مسطح اور بلند مقام پر بنا ہوا تھا جس کے چاروں طرف مٹی کی طویل و عریض دیوار کھینچ کر، چاروں گوشوں پر، چار برج بنائے گئے تھے۔ اس چار دیواری کے وسط میں، اتر جانب، ایک خس پوش چھپر کا بنگلہ تھا جو میر محمد امین نیشاپوری، سعادت خاں برہان الملک کا محل تھا۔ اس چار دیواری کے اندر تین وسعت تھیں کہ سوز پیدل، اصل پیدل اور توپ خانوں وغیرہ کی گنجائش تھی۔ بنگلات کے لئے بھی اسی طرح کے خس پوش بنگلے بنے ہوئے تھے۔ سعادت خاں برہان الملک تو اپنا زیادہ وقت صوبہ (اودھ) کے مختلف علاقوں کے دورے میں گزارتے تھے لیکن جب صوبہ کے نظم و نسق اور امور سلطنت سے فرصت پاتے تو اسی خس پوش محل میں آکر قیام کرتے تھے۔ ان خس پوش جھونپڑوں کی مناسبت سے اس نئی بستی کا نام "بنگلہ بستی" یا "بنگلہ کی بستی" پڑ گیا تھا۔ (ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)۔ جو نواب ابوالنصور صفدر جنگ کے ابتدائی عہد تک "بنگلہ" ہی کے نام سے مشہور تھا۔ یہی "بنگلہ کی بستی" اودھ کا اولین دار الخلافہ تھی آہستہ آہستہ "بنگلہ کی بستی" کے چاروں طرف امراء، روساء، معززین اور کاروبار لوگوں نے مکانات اور بازار بنائے۔ اس طرح "بنگلہ کی بستی" میں آبادی و رونق کار و زبیر و زامنا اضافہ ہونے لگا۔

جفاکش تھے۔ انسا کلو پیڈیا آف اسلام کے مقدمہ نگار نے برہان الملک کے متعلق لکھا ہے کہ:

”برہان الملک یوں تو بھلے آدمی تھے مگر حرب جاہ اور

”بنغلہ کی بستی“ کے گرد جو مٹی کی کچی دیوار کا حصار بنا ہوا تھا وہ تقریباً چھ میل کے رقبہ کو محیط کئے ہوئے تھا۔ اس حصار کے باقیات آج بھی طویل اور لمبہ ٹیلوں کے سلسلہ کی شکل میں موجود ہیں (صاحب احوال و واقعات، نے دیوار کی اوپر کی چوڑائی بیس باقد اور اونچائی کا وسطینت بیس باقد بتلایا ہے۔ — مولف) مولانا عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے کہ — ”فصیل شہر کا آثار زمین کے پاس چاہے جتنا ہو، درمیان میں دشن گز سے کم نہ تھا۔ جو اوپر پہنچ کر پانچ گزرہ گیا تھا۔ اس فصیل پر باقاعدہ اور بے قاعدہ دونوں طرح کی فوجوں کے دستے رات بھر روندتے پھر کرتے اور ہاجا پر عودیتے۔ ‘باقاعدہ’ سپاہیوں کی وردی لال تھی اور ‘بے قاعدہ’ سپاہیوں کی وردی سیاہ۔ انھیں سپاہیوں کی ضرورت سے برسات میں جا جا چھپر ڈال دیئے جاتے تھے۔ مگر برسات ختم ہوتے ہی آگ لگنے کے اندیشے سے وہ لازمی طور پر اتار ڈالے جاتے۔ چنانچہ صرف فصیل کی دیواروں کے لئے ہر سال تقریباً ایک لاکھ چھپر ڈالے جاتے اور چار مہینے بعد نوچ کر پھینک دیئے جاتے (گزشتہ لکھنؤ صفحہ ۱۲)۔

اس حصار کے باقیات لائقِ دالے بابا کے مزار سے پورب، جاپانالہ سے بالکل متصل پچھم جانب میلوں لہجہ ٹیلوں کے سلسلہ میں آج بھی موجود ہیں۔ — مولف)

خود مطلبی ان میں بے پناہ تھی۔ حسین علی خاں جیسے شخص کو
جنگ حاشیہ نشین اور موردِ عنایت رہے تھے، نہ بنشہ
باوجود ان کے شیعہ اور سید ہونے کے بھی، ان کی جان لئے
بغیر نہ چھوڑا۔“

انس کا وپیڈیا آف اسلام جلد ۱ صفحہ ۱۳۳۰

وقائع دلیپزیر کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ برہان الملک کو جب
سلطنت کے کاموں سے فرصت ملتی تو مذہب تشیع کی تبلیغ اور اشاعت
کی کوشش کرتے۔ خواجہ موسیٰ خاں نقشبندی مشائخ کے خاندان سے تھے اور
کٹر سنی تھے، انھیں کی صحبت میں شیعہ ہو گئے تھے، لیکن بقول سید
غلام حسین طباطبائی ”بکمال انظار“ ان کی اولاد میں جو کھلی شیعہ تھیں، انہیں لکھنؤ
میں جاگیر ملی تھی۔

برہان الملک پر الزام

برہان الملک پر ایک الزام یہ بھی لگایا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی عہداری
کے سنی علماء اور ان کے مدارس کی جاگیریں و وظائف اور معافیاں بکھٹ کر لئے تھے یہ تمام
سنی علماء جو شب و روز درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ جب جاگیریں ضبط ہو گئیں اور
وظائف بند ہو گئے اور معافیاں ختم ہو گئیں تو علماء کا وہ طبقہ یا گروہ جو جاگیروں کی
آمدنی اور وظائف کے سہارے فکر معاش سے آزاد زندگی بسر کرتا چلا آ رہا تھا،

برہان الملک کے کردار کی ہستیوں اور اخلاقی کمزوریوں کے عظیم انبار
میں کچھ ٹکڑی اور سے متعلق اوصاف حید کے روشن ستارے بھی ہیں۔ انہیں کسی خارجی
جذبات کے تحت دایستہ طور پر کسی خاص مصلحت کی بنا پر نظر انداز کرنا،
برہان الملک پر ظلم نہ سہی لیکن انصاف کا گلا گھونٹنے کے مترادف تو
ضرور ہے۔

ہم برہان الملک کے غسیر دانشندانہ طرز عمل اور عوامی جذبات و
مفاد کے خلاف پالیسیوں کی حمایت نہیں کرتے اور نہ انہیں حق بجانب سمجھتے
ہیں لیکن ہم انہیں کسی خارجی جذبات پر مغلوب ہو کر خواہ مخواہ مبطعون کرنا
دیانت داری کے خلاف اور قلم کے وقار کے منافی سمجھتے ہیں۔

قبل اس کے کہ ہم خواجہ موسیٰ خاں کے شیوہ ہونے اور سستی علمائے کے مدارس
کی جاگیروں اور معانیوں کی ضبطی اور قدیم وظائف کے بند کرنے کی وجوہات کا
سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیں ہم یہ حقیقت واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ:-

”جب مذہب کی پشتی پر حکومت ہوتی ہے تو حالت

اندیشہ ناک ہو جاتی ہے۔ میرا اس سے یہ مطلب نہیں کہ

سلطنت اور مذہب کے مقابلہ میں کبھی جبر و تعدی سے

کام لیا جاتا ہے یہ ہے کہ جاہ طلبی اکثر لوگوں کی نیت کو جو اعتقاد

کے کچے بوتے ہیں ڈانواں ڈرل کر دیتی ہے۔ ایسا ہی ہر جگہ ہوا۔“

(مقدمہ مائثر اکرام از ڈاکٹر موسوی عبدالحی)

اسی جاہ طلبی کی مکروہ خواہش کی تکیل کے لئے خواجہ موسیٰ خاں اور

ان کے جیسے نہ جانے کتنے مفاد پرست سنیوں نے دنیوی شان و شوکت اور
تکبر آفریں رعب و جلال کے حصول کے لئے اپنے آبائی مذہب کو خیر باد کہہ کر
حاکم وقت کا مذہب اختیار کر لیا تھا اور جلد تر تکمیل مفاد کے لئے جس قسم کے
ارذل جذبات و افعال کا مظاہرہ، حاکم وقت کی خوشنودی کے لئے کیا ہے، یہی
تفصیل سے تاریخ کی کتابوں کے اوراق سیاہ ہیں۔ خواجہ موسیٰ اور ان کے جیسے دوسرے
تمام ابن الوقت لوگوں کی تبدیلی مذہب نہ برہان الملک کی صحبت کے اثر سے
ہوئی تھی اور نہ کسی مجبور و تعدی کے خوف و ہراس سے بلکہ اس تبدیلی مذہب کے
اصل محرکات اُن کے غبی مقاصد کا جلد تر موقع حصول رہا۔ اسلئے برہان الملک کی
شخصیت کو اس سلسلہ میں خواہ مخواہ مورد الزام ٹھہرانا ان پر سراسر ظلم اور نا انصافی ہے۔

مدارس کی معافیاں اور جاگیریں کیوں ضبط کی گئیں

اب رہی سنی علما کے وظائف بند کرنے اور ان کے مدارس کی معافیاں اور جاگیریں
ضبط کرنے کی بات، اس کے لئے ہمیں اس وقت کے درپیش ملکی، سیاسی اور
معاشرتی حالات اور ایک نوزائیدہ سلطنت کے استحکام کی لازمی بنیادی ضرورتوں
کے اہم ترین مسائل پر بھی غائر نظر رکھنا چاہئے۔

تاریخ اودھ کا ایک عالمہ و طاہر نام بھی جانتا ہے کہ جس وقت برہان الملک
نے "بگٹہ کو اپنا مستقر بنایا تھا، اس وقت یہ تمام علاقہ غیر آباد جنگل تھا۔" بگٹہ کی

۸۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبد الحق مرحوم نے مائثر الکلام کی ترتیب دیکر شائع کیا ہے
اودھ اس کا مقدمہ بھی آپ ہی نے تحریر فرمایا ہے۔ مولف -

بستی شیعوں کی بستی نہ تھی چند افراد جو میر محمد امین نیشاپوری سعادت خاں
 برہان الملک کے فوجی تھے اور کچھ معتبر امرار جو ایرانی تھے وہی شیعہ (مذہب امامیہ
 کے پیروں تھے۔ البتہ لکھنؤ میں مغلیہ زمانہ سے کچھ شیعہ خاندان آباد تھے، جنکی
 علیحدہ ایک فرقہ کی حیثیت سے کوئی سماجی اور سیاسی پوزیشن نہیں تھی۔
 ان دونوں مقامات پر ہندوؤں اور مسلمانوں کی آبادیاں تھیں۔ اس عہد میں
 بھی ان علاقوں میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ مسلمان اقلیت میں ہونے کے
 باوجود صاحب اقتدار تھے چونکہ خاص آبادی ہندوؤں اور مسلمانوں کی تھی اسلئے انہیں
 کے علماء اور پنڈت، یا مندروں کے مہنت حکومت کے وظیفہ خواہ تھے انہیں
 علماء اور پنڈتوں کے مدرسوں یا ٹھٹھالاؤں کو انکی ضروریات کی کفالت کے لئے بھاگیں
 مل ہوتی تھیں۔ برہان الملک کے ابتدائی دور حکومت میں، جیسا کہ ہم پہلے بتا
 چکے ہیں کہ فیض آباد میں نہ شیعوں کی کوئی خاص آبادی تھی اور نہ ان کی نمایاں اہمیت
 تھی۔ نہ علی گڑھ کی بسندی کا وہ جذبہ تھا جو آج ان میں پایا جاتا ہے اور نہ ان کے علیحدہ
 مدارس تھے۔ شیعہ بھی سنیوں ہی کے مدارس میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اعلیٰ
 تعلیم کے لئے فرنگی محل کا دروازہ ان کے لئے بھی کھلا رہتا تھا۔

اور جب شام ہو گئی

جب جاگیریں اور معافیاں ضبط ہوئیں اور وظائف بند کئے گئے تو انکی
 ضرب براہ راست مدارس اور خانقاہوں پر پڑی پسند توں کے پاٹھ شالاؤں اور
 مندروں کے مہنتوں پر بھی اس حکم کا نہبردست اثر پڑا تھا۔ انکی تفصیل

اکثر تاریخی کتابوں میں موجود ہیں اور اس جگہ کا بیان جاسے موضوع سے غیر متعلق ہیں،
 — مولف، سیکڑوں سالوں سے سایہ میں پردہ پوشی پانے والی طبیعتوں کو آفتاب
 کی تہا زت کا علم ہوا۔ تن آسانیوں کے سارے مزے جاتے تھے۔ چہرے کا نور
 ریاضت و مجاہدہ کی خشک جھریوں میں تبدیل ہونے لگا۔
 دی زمانے کی گریزشیں پہ غالب آتا ہے
 جو ہر نفس سے کرے جادواں پیدا (اقبال)۔

یہ دور اندیشی تھی

صوبہ اور دہ میں پھیلے ہوئے مدارس پانڈے شالادوں کی فیکٹریوں سے عالم فاضل
 پنڈت و تاتاری جگر نکلنے والے طلباء کی تعداد یقیناً برابن ہا تک جیسے بیدار مغز اور
 دور اندیش شخص کی تشویش کا باعث ہوئی ہوگی اور انہیں اس مسئلہ پر تنجید کی
 کیسا دھور کرنے پر مجبور کیا ہوگا کہ اگر ملکہ و فساد پنڈتوں اور شائستہ یوں کی روز بروز بڑھتی ہوئی
 پیداوار کی یہی رفتار رہی تو ساری سلطنت میں حشرات الارض کی طرح
 انکی بہتات ہو جائیگی۔ یہ غبار غم عالم و فاضل اور پنڈت و شائستہ کیلئے درس و تدریس
 کی آسای ملاس و پاڈے شالادوں میں کہاں سے پیدا کی جائے گی؟ اور نئے نئے مدارس
 و پاڈے شالادیں کھول کر حکومت اپنے خزانہ پر کتنا بوجھ ڈالتی رہے گی؟

آج ہندوستان کی قومی حکومت بھی ملک میں تعلیم یافتہ ہر مذہب کا لوگوں کی یکساں سے پریشان
 ہے۔ انھیں ہر مذہب کا رہنے پانے ملک میں مختلف منصوبے بھی چلائے جا رہے ہیں لیکن "پیداوار"
 کی بہ نسبت "بھائی" کی رفتار کافی سست ہے اور اس نمان میں تو یہ مسئلہ اب بھی زیادہ گہیر رہا ہوگا۔
 اب ہم اس کی کفایت کا سارا بوجھ مسلمان قوم نے اپنے مضبوط کندھوں پہ اٹھایا ہے۔

اس زمانہ کے مدارس کے اساتذہ کرام اور طلباء، مہمانِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام پر حکومت کی عطا کردہ جاگیروں، معانیوں اور وظائف سے جیسی پر تکلف اور بیفکری کی زندگی بسر کرتے تھے وہ حکمران طبقہ کو بھی یسر نہ تھی۔ کروڑوں روپے کے وظائف اور جاگیروں و معانیوں کی آمدنی ان مدارس کے اساتذہ خصوصاً اور طلباء عموماً تین تین گھنٹے "قیلور" کر کے زبردستی مبہم کرتے تھے۔

معاشرہ میں علماء و فضلا کی پروقاہ سماجی حیثیت سے لوگ اس قدر متاثر تھے کہ متوسط اور فراع طبقہ کے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اپنے لائق بچوں کو عالم و فاضل بنانے کیلئے کوشاں تھی (اباں بچے عموماً خانقاہوں میں کچھ دن ٹریننگ کیلئے بھیج دیے جاتے تھے پھر ذاتی اثر و رسوخ اور وابستہ خانقاہ کی نسبت سے جلد ہی "مرشد بن جاتے تھے۔ مواف)۔ مسلمانوں میں یہ عام جذبہ پیدا ہو گیا تھا کہ عار و قاضی بکر کسی مدرسہ سے وابستہ ہو کر یا نئے مدارس قائم کر کے حکومت و وقت و وظائف و جاگیریں بیکر ساری زندگی عیش و آرام کی بیفکر زندگی بسر کرنے کیلئے اس سے بہتر اس وقت کوئی دوسرا موزن ذریعہ معاش نہ تھا۔ اور حقیقتاً تھا بھی ایسا ہی۔

نظم و ضبط کیلئے فوج کی ضرورت تھی

برہان الملک کے پاس صرف چند ہزار فوجی تھے جن میں زیادہ تر بچھی علاقے کے پٹھان و افغان، کچھ مغل اور تھوٹے سر علاقائی لوگ اور وہ بھی اپنی ذاتوں کے جو قابل اعتماد نہ تھے۔ "مواف" فوجی تھے جو صوبہ اردھ جیسے وسیع علاقے کی انتظامی ضرورت اور گرد و نواح کے سرکش زمینداروں کی سرکوبی کے لئے قطعی ناکافی تھے۔ یہاں

۔ مدارس اور پانچ سالوں کے پھیلے ہوئے جاں سے اعلیٰ ذاتوں اور طبقات کے معبر فوجی ملازم
 ناممکن نہیں تھا دشوار تر ضرور تھا۔ ایسی صورت حال میں ایک دور اندیش حکمران
 کو ملکی مفاد اور نظم و ضبط کے استحکام کے لئے جو قدم اٹھانا چاہئے تھا، وہ
 برہان الملک نے اٹھایا اور جس علاقے سے کبھی چند سو سپاہیوں کا ملنا دشوار تر
 تھا، بیس تیس سال کے اندر ہی، اسی علاقہ کے رہنے والے شہر بنار صرف
 پیادہ سپاہیوں کی زبردست فوج فیض آباد میں ہی رہنے لگی تھی! ۱۱

۱۲۔ نواب شجاع لدوہ کے قبضہ میں جو فوج صرف فیض آباد میں موجود رہا کرتی تھی
 مجموعی تعداد تھی:۔ سرخ وردی والے تیس سو باقاعدہ اور سیاہ وردی والے چالیس
 سو بے قاعدہ پیادے تھے۔ جسکے پہ سالار سیاح احمد بانسی والا تھے (گزشتہ لکھنؤ صفحات ۱۱۸
 ۱۱۹)۔ نادر شاہ کوئی ایٹک کی آمد سے قبل ۱۷۵۷ء میں جب دلی کی سلطنت صرف نام کی
 باقی رہ گئی تھی اس وقت برہان الملک لدوہ کے صوبہ دار کے بجائے نیم خود مختار صوبہ دار
 بن چکے تھے۔ ۱۷۵۷ء میں:۔ پانچ تھائی دلی میں بسلسلہ حملہ نادر شاہ دلی میں مقیم تھے
 (مقدمہ نگار وقائع دہلیہ نے لکھا ہے کہ برہان الملک بار بار تقاضہ کرنے کے بعد سب
 آخر میں دلی میں اپنی فوج لے کر آئے تھے صوفیہ) انہوں نے اپنے کردار کی کڑی دیکھ بھال
 اخلاقی پستی کا اتنا گھناؤنا مظاہرہ کیا کہ دلی کی بیگناہ رعایا پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ نادر شاہ
 اس بات پر راضی ہو گیا تھا کہ اگر اسے پچاس لاکھ روپیہ تادان جنگ مل جائے تو وہ کرنال
 سے ہی واپس چلا جائے گا۔ (بادشاہ بیگم اور وہ میں تحریر ہے کہ پانچ کروڑ روپیہ
 بطور تادان جنگ وصول کر کے، کرنال ہی سے واپس جانے کا عزم کر چکا تھا صوفیہ)
 ہٹا ہر تمام معاملات طے ہو چکے تھے۔ لیکن سعادت خاں برہان الملک نے نادر شاہ کی

نواب ابوالمنصور صفدر جنگ

فیض آباد کی قدیم "بنگلہ بستی" کے بسا نے والے میر محمد امین نیشاپوری
سعادت خاں برہان الملک کے انتقال کے بعد ۱۱۵۲ھ کے بھانجے اور کزنزادہ
داماد میر منصور علی خاں "پسر مرزا جعفر بیگ جو برہان الملک کے بہنوئی تھے،
مسند نشین ہوئے۔ اور ۱۱۵۳ھ مطابق ۱۷۴۰ء ہجری میں "بنگلہ کی بستی" کو

خوشنودی اور تقرب حاصل کرنے کیلئے یا مندر سلطنت کی اینٹ اینٹ بجنے کیلئے اس سے کہہ
دیا تھا کہ اُس نے پیاس لاکھ روپیہ تیار کر کے بیٹے کا فیصلہ کے سخت ترین دھوکا کھایا
سبے کیونکہ اگر وہ دہلی پہنچ جائے تو اسکو کم از کم بیس کروڑ روپے اور بیشمار نقد و جو اسرا بہتہ آئینگے۔
تاریخ مظفری میں یہ واقعہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

— سعادت خاں برہان الملک نادر شاہ ابرقن
در اخلاف شاہجہان آباد ترغیب نمود۔ داد نمکرامی ادا کرد و خزان
و دقائن آبخارا گوش زد کرد۔ —

(بحوالہ شاہ بیگم اودھ صفحہ ۱۷)

سعادت خاں برہان الملک کے اسی سبز باغ دکھانے کے بعد نادر شاہ سیدھا
دن پہنچا اور قتل عام کا اعلان کر کے ہزاروں معصوم و بے گناہ انسانوں کو گاجرمولی کی طرح
کٹوا ڈالا۔ جس مکر و مہاد کے حصول کے لئے جبرہان الملک نے نادر شاہ کو دہلی کی تباہی
ویرانی اور قتل و غارتگری پر آمادہ کیا تھا، اُس کے نتائج یقینی طور پر برعکس متوقع تھے۔
(لکھنؤ کلابستان شاعری صفحہ ۱۸) کیونکہ دہلی کے شاہی خزانہ میں بیس کروڑ روپے نقد

فیض آباد کا نام لکھ کر نوابین اودھ کی شان و شوکت کا مثالی نمونہ بنانے کا سنگ بنیاد
رکھا۔

نواب صفدر جنگ — کردار و شخصیت

نواب ابوالنصور صفدر جنگ میں اُنکے ماموں، سعادت خاں برہان الملک
کی خیر رقم تھی ہی کہاں جو نادر شاہ کو ملتی؟ دہلی کے شاہی خزانہ میں جو سب سے بڑی
رقم جمع ہوئی تھی وہ شہنشاہ شاہجہاں کے عہد میں جمع ہوئی تھی اور وہ بھی سولہ کروڑ روپے
تھی اس لئے نادر شاہ کو دہلی کے شاہی خزانہ سے بیس کروڑ روپے لینے کا کوئی امکان ہی
نہیں تھا۔

دہلی پر حملہ کرنے سے قبل نادر شاہ نے میر محمد امین نیشاپوری، سعادت خاں برہان الملک
سے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے پاس لاکھ روپیہ تاوان جنگ لیکر واپس جانے کی نصیحت
کر کر دہلی پر حملہ کر رہا ہے۔ اگر خدا نخواستہ شاہی خزانہ سے بیس کروڑ روپیہ کی رقم نہ
ملی تو وہ اُن (برہان الملک) سے وصول کر لے گا۔ برہان بنا سعادت خاں برہان الملک نے
نادر شاہ کے ہاتھوں اپنی تذلیل و توہین کے اندیشہ سے نہ ہر کا پیالہ پلکی کہ ۱۹ مارچ ۱۷۳۹ء
مطابق ۲۰ رذی الحجہ ۱۱۵۱ھ بمطابق بروز دوشنبہ اپنے سفینہ حیات کو بحر فنا میں غرق کر
لیا۔ دی فرسٹ ٹو نواب آف اودھ از ڈاکٹر آشیر واری لال شریواستو،
تاریخ وقائع دلپذیر کے مقدمہ نگار نے لکھا ہے کہ سرطان کا پھوٹا پھوٹنے سے
زہر کا مادہ ان کے جسم میں پھیل گیا تھا جس سے ان کی موت واقع ہو گئی (صفحہ ۷۱) لیکن
حالات و واقعات پر نظر رکھتے ہوئے وقائع دلپذیر کے مقدمہ نگار کی بات ہے وزن معلوم
ہوتی ہے کیونکہ برہان الملک کی غداری کا چہرہ چاند توں زبان خلق پر رہا۔ اسی زمانہ کے کسی شاعر

جو اُس زمانہ کے باختیار امرار کا طغرائے امتیاز تھا، سے ہمیشہ متفر رہے۔ اُنکی

محلہ کہتے ہیں۔ لکھنؤٹی اسٹیشن کے پاس ایک یلغ "باغ شیر جنگ" کے نام سے اب تک موجود ہے۔ مولف (میر نثار محمد فائز محمد باقر مخاطب بہ "سیادت خان" کے لڑکے اور میر محمد علیخان جو وزیر ایران کے داماد تھے) شیخ تصدق حسین صاحب نے لکھا ہے کہ میر نثار محمد خاں "گو شیر جنگ" کا خطاب حضرت محمد شاہ بادشاہ دہلی نے عطا فرمایا تھا۔ مولف، ان کا (میر نثار محمد خاں کا) اور مرزا منصور علی خاں (نواب صفدر جنگ)، ہمیشہ زادہ و داماد سعادت خاں برہان الملک سے زبردست مقابلہ رہا۔ میر نثار محمد خاں شیر جنگ کا دعویٰ تھا کہ از روئے شریعت انہیں مسند نشین ہونا چاہئے اور صفدر جنگ کہتے تھے کہ میں سعادت خاں برہان الملک کا ہمیشہ زادہ اور داماد ہوں اس لئے مسند صوبیداری مجھے ملنا چاہئے۔ آخر شش صفدر جنگ کی چال چل گئی۔ اُن کا پلہ بھاری بڑ گیا۔ انہوں نے سب سے بڑی اور زوردار سفارش یعنی دو کردہ روپیہ کی نذر نادر شاہ کی خدمت میں گزاری اور قرعہ انتخاب انھیں کے ناکہ پڑا اور خلوت صوبیداری سے سرفراز ہوئے۔

۱۶۔ بہمانی نے لکھا ہے کہ خراسان میں ثبوت شرف کے پاس فیض آباد نام کا ایک قصبہ ہے۔ یہاں کی آب و ہوا بڑی اچھی ہے۔ خوبزہ و غیرہ پھل یہاں عمدہ اور کثرت سے ہوتے ہیں۔ صفدر جنگ نے اس بستی کے نام پر اپنے بساے ہوئے شہر کا نام فیض آباد رکھا تھا وہ پچھلے اسے "بنگلہ" کہتے تھے۔ ۱۲۲۶ھ مطابق ۱۸۰۰ء تک بنگلہ اور فیض آباد دونوں نام زبان پر جاری تھے۔ دشریحات وقائع عالم شاہ

صفدر ۱۱، ۱۲

۱۷۔ میر محمد امین نیشاپوری سعادت خاں برہان الملک نے چار شادیاں کی تھیں۔ پہلی شادی ایران ہی میں اُن کے خویش میر محمد یوسف جاگیردار ایران کی لڑکی سے

مجلس ہووے۔ عجب سے ہمیشہ خالی رہی۔

ہوئی ہو۔ اسی کے یکے میں بطور "خانہ و اماڈر" ہتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اسی ایرانی بیوی کی تیج زبہن کا چرکا کھا کر، آوارہ وطن پر کمر باندھا اور ہندوستان آئے دہندوستان آنے کے بعد موصوف نے کہیں ایران کا رخ نہیں کیا اور کہیں اس ایرانی بیوی کی کھوج خبر لی تاریخ میں اس بیوی کے متعلق کوئی تفصیل نہیں ملتی جس سے معلوم ہوتا کہ ایران میں اس خلیفہ کا کیا حشر ہوا۔ — مولف،

ہندوستان میں سعادت خاں برہان الملک نے تین شادیاں کی تھیں پہلی شادی نواب کلب علی خاں کی دختر سے کی تھی جو سروراز الملک نواب حسن رضا خاں کے صاحبزادے تھے اور دہلی کے ایک عزیز باشندہ و شاہی عہدہ دار تھے۔ اس بیوی کا انتقال شادی کے چند ہی دن بعد ہو گیا تھا۔ دوسری شادی سید طالب محمد آصف جاہ کی صاحبزادی سے کی تھی جس سے چار لڑکیاں اور دو بچے پیدا ہوئے۔ تیسری شادی سے تین بچے ہوئے۔ چار بیگم ۱۔ بیگم بیگم بیگم ۲۔ بیگم بیگم بیگم ۳۔ بیگم بیگم ۴۔ اور ایک لڑکا پیدا ہوا تھا جو سن طفولیت میں چھوٹ کر مر گیا تھا۔ (سعادت صفحہ ۲۸) تیسری شادی ۱۱۴۱ء مطابق ۱۱۳۲ء میں ہوئی۔ نواب محمد نقی خاں صوبیدار ابراہ آباد کی دختر سے کی (جو شادی کے تھوڑے ہی دن بعد ملک بدر ہو کر صدارت کی تھیں۔ — مولف) اس شادی میں برہان الملک کو جہیز میں ایک کنسیر بھی ملی تھی جس کا نام صدیہ خانم تھا۔ بیوی کے انتقال کے بعد صدیہ خانم نے نواب موصوف کے تصرف میں آکر رہیں چنانچہ ان دونوں کے تعلق سے ۱۱۴۱ء کے آخری ایام میں صدیہ خانم کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام صدیہ انسار رکھا گیا۔ گھروالے اُسے بیگم سے "مٹی بیگم" کہتے تھے۔ تفسیر الغافلین از مرزا ابوطالب مترجمہ

نواب ابوالنصور صفدر جنگ بھی مذہبی آدمی تھے اور اپنے آبائی عقیدہ

سٹرولیم ہوئے)

۱۱۲۴ء مطابق ۱۱۳۵ھ ہجری میں جب کینز لادی صدر النساء کی عمر بارہ سال کی ہو گئی تو برہان الملک نے اپنی ہمشیرہ خورد کو جو مرزا جعفر قلی بیگ خاں سے منسوب تھیں ایران سے ملوا کر اس ہی (صدر النساء) کی شادی ان کے بڑے مرزا منصور علی خاں (نواب صدر جنگ) سے کر دی اور صدر النساء کے بجائے "صدر جہاں" کے نام سے موسوم ہو گیا۔ سسرال سے "نواب بیگم" کا خطاب عطا ہوا۔ (تاریخ بیگمات اور صفحہ ۲۲)۔
عماد السعادت میں صدر جہاں کی ماں کے متعلق تحریر یہ ہے:

"ولادت آں درد دریائے سیادت و عصت از لطف عقیقہ محترمہ خانم
صاحبہ اتفاق افتادہ کہ قبرہ اش در باغی کہ شہرت بہ باغ طرائف و
تعمیر پذیرافت۔"

(عماد السعادت صفحہ ۷۷ مطبوعہ منشی نو کشور پریس)

لکھنؤ سال طباعت ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۴ء)

صاحب عماد السعادت نے خانم صاحبہ کے نام و نشان کو ظاہر نہیں کیا اور نا ہی سید کمال الدین حیدر نے اپنی کتاب قیصر التواریخ میں خانم صاحبہ کے نام و نسب پر کوئی روشنی ڈالی ہے۔ البتہ مرزا ابوطالب خفہانی نے تفسیح الغافلین میں اس راز پر سے اس طرف پردہ اٹھایا ہے:

"سعدت خاں برہان الملک کی بیٹی نواب مرحوم (شجاع اللہ ولد ہرک)
والدہ ایک جاہلہ کے بطن سے تھیں۔ جو بروقت شادی نہ

(تشیع) میں پختہ تھے لیکن اس میں نہ شہار الدولہ جیسا مجنونانہ جوش تھا اور نہ
سعادت خاں کو نیز میں ملی تھی۔

تاریخ آصفی (اردو ترجمہ) کے صفحہ ۲۹ پر نواب صفدر جنگ کے ذکر میں لکھا
ہے کہ سعادت خاں کی بیٹی مرحوم نواب شہار الدولہ کی ماں ہیں اسی خاندان کی ایک
کنیز ہیں۔

مرزا ابوطالب کی عبارت پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب عماد السعادت نے
انتہائی فصیح و بلیغ اور معنی خیر انداز میں صرف چند جملوں میں اس مفہوم کو دکر دیا ہے جو مرزا
ابوطالب نے واضح اور مرتع الفاظ میں ادا کیا ہے۔

خدیجہ خاتم کی قبر، امین الدولہ پارک (لکھنؤ) میں ایک بہت بڑی چوڑی ڈھانچہ واقع
ہے جس کو عوام ناواقفیت کی بنا پر "شہید مرد" کی قبر سمجھ کر بھول چڑھاتے ہیں یہ روشنی
کرتے ہیں۔ اپنے زمانہ زوال میں خدیجہ خاتم نے اس جگہ ایک باغ لگا کر ایک مسجد اور حمام
مسماۃ خدیجہ کنور کی معرفت جو قوم کی برہمن (پنڈیتان یا پڑائیں) تھی، تیار کرایا تھا (بعد کو
جے کنور مسلمان ہو گئی تھی۔ ملاحظہ) جس سال مسجد بن کر تیار ہوئی، اسی سال خدیجہ خاتم
کا انتقال ہوا۔ اُن کا یہ باغ ان کی دکنی آرام گاہ قرار پایا مگر مسجد پڑائیں کی مسجد کے
نام سے مشہور ہو گئی۔ آج کل لوگ اس مسجد و جنوں کی مسجد کہنے لگے ہیں۔ لوگ یہاں آکر
منیس اور مرادیں مانگتے ہیں۔ خدیجہ خاتم کی قبر زریب مقبرہ بنا ہوا تھا ۱۲۷۵-۱۲۸۵ھ میں
منہدم ہو گیا۔ موجودہ سرکاری شہر نکلتے سے مسجد جو اس قبر اور مقبرہ کے مجسم جاذب تھی،
شہر کے دوسری طرف ہو کر فیرانہ مقبرہ سے بالکل جدا ہو گئی۔

جناب شیخ تصدق حسین صاحب نے زمانہ مابعد میں، خدیجہ خاتم کے اس باغ

آصف الدولہ جیسی مذہبی تشدد کا کو عنصر۔ وہ نہایت معتدل مزاج، شریف النفس اور نیک طبیعت انسان تھے۔

شاہ حمزہ نے اپنی کتاب کشف الاستار (جلد ۲ صفحہ ۸۷) میں لکھا ہے کہ جس وقت نواب صفدر جنگ نے سنا کہ ان کے فوجیوں نے مارہرہ (ضلع ایٹہ) کے شرفا کی عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر لیا ہے اور ان کی املاک و گھر بار لوٹ لیا ہے تو انھیں سخت دلی تکلیف ہوئی اور فوجیوں کی اس ناشائستہ حرکت اور برہنہ پھان کی جو حالت ہوئی تھی وہ ان کے ہمعصر مورخ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

”تمام شب و روز بریں ماجرا ملول و اکثر گریاں بود و طعام خورد۔“

(شاہ بیگم اودھ صفحہ ۷۸)

کے متعلق لکھا ہے کہ امجد علی شاہ بادشاہ اودھ نے یہ تمام املاک اپنے وزیر اعظم مولوی امداد حسین خاں، امین الدولہ کو عطا کر دیا تھا جنھوں نے اس بارغ کو اپنے نام پر ”امداد باغ“ رکھا مگر ۱۹۱۳ء میں لکھنؤ میونسپل بورڈ نے یہ تمام املاک و آراضی لے کر ایک پارک بنوا دیا جس کا نام مولوی امداد حسین خاں، امین الدولہ کی یاد میں ”امین الدولہ پارک“ رکھ دیا گیا امین آباد کا محلہ بھی نواب امین الدولہ مرحوم کے نام پر آباد ہوا ہے۔ (بیگمات اودھ: در بیان ”نواب صدر جہاں بیگم“)

بنگلہ سے فیض آباد تک

نواب ابوالنصور صفدر جنگ کے عہد میں فیض آباد کی آبادی اور رونق میں روز افزوں اضافہ ہونے لگا تھا۔ امرار، خواص، افسران لشکر کے علاوہ عوام بھی "بنگلہ بستی" کے ارد گرد بسنے لگے تھے۔ نواب موصوف کی حوصلہ افزائیوں اور قدر شناسیوں کی وجہ سے فیض آباد میں علوم و فنون کے یکتائے زمانہ اور ممتاز و اہل حرفہ کا اجتماع شروع ہو گیا تھا۔ دہلی کی تباہی و بربادی کے بعد تمام اہل علم و ماہرین فن کی نگاہیں فیض آباد کی طرف لگی ہوئی تھیں، جو بچپن کی منزلوں کو انتہائی عجلت و سرعت کے ساتھ طے کر کے عنفوان شباب کی ہنگامہ خیزیوں میں قدم رکھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ دہلی کے اطباء، شعراء اور علماء و فضلاء وغیرہ نے فیض آباد کا رخ کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ دن بھی آگیا کہ فیض آباد شاہجہان آباد کی ہمسری کرنے لگا۔

فیض آباد کی کوشش و قدر دانی

جلدی وہ دن بھی آگیا جب شرفائے دہلی اور ان کے اعزہ و اقارب بائیں فائر پسے، ہاتھوں میں چاندی کی شاندار پھڑپھڑانے لگے۔ دہلی میں آشوب زمانے اُٹھے اور مرجلے خوفزدہ، زرد چہرے فیض آباد میں گھل اٹھے۔ خوف و ہراس اور اندیشہ فکر کی بیدار کی ہوئی چہرے کی زردی شگفتگی و شادابی میں بدل گئی۔ دہلی کے نوادرین، شرفاء، رؤسا و غیرہ کو دیکھ کر ایسا اندازہ ہوتا تھا کہ یہ "بنگلہ بستی"

کافیض آباد نہیں دہلی ہے۔ کچھ جانے پہچانے اور کچھ اجنبی و سنجیدہ اور متین قہرے
 ذرق برق لباسوں میں ملبوس، ایک دوسرے سے خندہ پیشانی اور کشادہ دلی
 سے ملتے اور معانقہ کرتے۔ ایک دوسرے کی خیر و عافیت دریافت کرنے کے
 بعد معلوم کرتے کہ اس "عروس البلاد" میں تشریف آوری کب ہوئی؟ —
 کوئی سفر کو آرام و اطمینان سے طے ہونے کا ذکر کرتا تو چہرے کھل اٹھتے اور شکر
 بجالاتے۔ جب کوئی سفر کے مصائب اور افتاد بیان کرتا تو شگفتہ چہرے متین و
 سنجیدہ ہو جاتے اور صبر و شکر کی تلقین کرتے۔ ہر شخص فیض آباد کی قدر شناسیوں
 اور حوصلہ افزائیوں کا مدح خواں تھا۔ باشندگان فیض آباد کی کشادہ دلی اور پزیرائی
 کے سبھی لوگ رطب اللسان تھے۔

ایمان فیض آباد نے جس خندہ پیشانی سے دہلی و لکھنؤ کے لوگوں کی پزیرائی

کیا، انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا، عنایت و نوازشات کا وہ سلوک روا کیا کہ دہلی کی
 تباہی و بربادی اور اجڑنے کا غم جاتا رہا۔ اہل خانے دہلی کے مطب کی سابقہ شان
 و شوکت بدستور سابق ہو گئی۔ شعرائے دہلی نے یہاں کی شعر و شاعری کی محفلوں
 کو وہ رونق بخشی جو کچھ دہلی ہی کا حصہ تھی۔

بہر حال نواب ابوالنصور صفدر جنگ، فیض آباد کے محلوں کی ترتیب

کاری، تزئین و آرائش وغیرہ پر اس قدر توجہ مبذول کئے ہوئے تھے کہ لوگوں
 کو گمان ہو چلا تھا کہ جلد ہی فیض آباد، دہلی ثانی بن جائیگا۔

فیض آباد کی زیب و زینت اور اس کی منصوبہ بند آباد کاری اور اسے

"عروس البلاد" بنانے میں صرف نواب ابوالنصور صفدر جنگ کا ذہن ہی نہیں

کار فرما تھا بلکہ اس کی اصل محرک انکی چھیتی بیوی "صدر جہاں" (نواب بیگم) صاحبہ تھیں جن کے پیار و اخلاص نے دونوں سیاں بیوی کو ایک جان و قالب کر دیا تھا۔ نواب بیگم صاحبہ نہایت فیاض، حلیم، مخیر، نیک سیرت، وفا شعار اور مطیع و فرمانبردار بیوی تھیں۔ شیخ تصدق حسین نے نواب بیگم صاحبہ کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"نواب ابوالمنصور صدر جنگ نے باوجود دولت و ثروت
بر خلاف دیگر اکابر، صرف صدر جہاں بیگم پر ہی قناعت کی۔ نہ
کوئی دوسرا محل نہ کیا نہ کبھی کسی عورت کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا۔"
(صفحہ ۲۲)

سیہ غلام علی نقوی کا تاثر یہ ہے:

"حیا و آدمیت اور متنفذی آن نشد کہ سولہ جلیلہ عقیفہ
بادیگر نے سروکار بہم رساندے"

۱۸۔ سید اقبال احمد نے تاریخ دار السورہ جونپور میں لکھا ہے کہ جس زمانہ میں فرشتہ آباہی
بٹھانوں کے یثد نواب احمد خاں بخش نے اودھ پر قبضہ کر لیا تھا اسی دوران نواب صدر جنگ نے
جونپور کے ایک متول رئیس شیرزاں خاں کی لڑکی سے شادی کی تھی اور صاحبہ زماں خاں
جو شیرزاں خاں کے بھتیجے تھے، انہیں اس بابت پر آمادہ کیا تھا کہ وہ فیض آباد، اعظم گڑھ
اور بنارس پر قبضہ کرے۔ صدر جنگ نے صاحبزماں خاں کے ساتھ ایک کثیر فوج بھی کر دی
تھی۔ تاریخ دار السورہ جونپور مصنفہ سید اقبال احمد صفحات ۲۲۰، ۲۲۱۔ مطبوعہ نامی پریس
لکھنؤ

۱۹۔ عماد السعادت صفحہ ۳۶۔ مطبوعہ فشی نو لکھنؤ پریس لکھنؤ، سال طباعت

ولادت نواب شجاع الدولہ

شادی کے دسویں سال یعنی ۱۷۳۲ء مطابق ۲۸ رجب
 ۱۱۴۴ھ ہجری بروز منگل (شنبہ) الشہرب العزت نے نواب یگم صاحب کو ایک
 چاند سا نور نظر اور نعت جگر عطا فرمادیا۔ صاحبزادہ کا نام جلال الدین حیدر رکھا گیا۔
 یہ ولادت باسعادت دہلی میں 'محل داراشکوہ' میں واقع ہوئی تھی۔ جو شہنشاہ دہلی
 نے میر محمد امین نیشاپوری، سعادت خاں برہان الملک کو دہلی میں قیام کرنے کے لئے
 عطا فرمایا تھا۔

۲۰۔ جلال الدین حیدر (شجاع الدولہ) کی تاریخ تولد یہ ہے۔

بدولت خانہ نواب منصور پتہ برآمد آفتاب از مطلع نور

۱۱۴۴ھ ۱۲۴۹ھ ۱۳۸۰ھ ۱۴۹۰ھ ۱۵۶۷ھ ۱۶۲۲ھ

(تاریخ اور وہ مختص صفحات ۶۲، ۶۳، ۱۸۶)

۲۱۔ 'محل داراشکوہ' شاہزادہ داراشکوہ کا محل تھا جسے شاہجہاں بادشاہ نے بنوایا تھا۔

داراشکوہ، شہنشاہ شاہجہاں کا بیٹا تھا۔ جو ہر درشنہ کی رات صفر کی انیسویں تاریخ ۱۰۲۲ھ

(مطابق ۱۱ مارچ ۱۶۱۵ء — مولف) میں ممتاز محل کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔ (تذکر جہانگیری)

سبحان رائے بھٹاری نے داراشکوہ کی پیدائش کی تاریخ ۱۹ صفر ۱۰۲۲ھ ہجری (مطابق

(غلامہ التواریخ) مگر شہنشاہ جہانگیر کے بیان کے پیش نظر شری

سبحان رائے بھٹاری کی تاریخ کوئی اہمیت نہیں رکھتی بلکہ بالیقین سہو قلم معلوم ہوتی ہے۔

۲۲۔ شعبان ۱۰۴۲ھ ہجری (مطابق یکم فروری ۱۶۲۲ء — مولف) بروز جمعہ، نادرہ بانو بنت

سلطان پرویز بن جہانگیر کے ساتھ بڑی شان و شکوہ کے ساتھ شادی ہوئی (ڈبوشی) میں نے

خاندان وزارت میں شجاع الدولہ کی شادی

جب صاحبزادہ جلال الدین حیدر (شجاع الدولہ) کی عمر چودہ سال کی ہوئی تو ان کی شادی اُمّت الزہرہ کے ساتھ ہوئی جو محمد اسحاق خاں شوستری، مؤسس الدولہ کی نور نگار اور مرزا محمد خاں شوستری النخاطب بہ محمد اسحاق خاں بنیم الدولہ کی ہمیشہ اور

درمیل بائیں رائفیل ڈاکٹری میں سہو ۱۲۲ھ تکھ دیا ہے۔ سرف سن ۱۷۵۴ء میں شہنشاہ شاہ جہاں نے ولیمبرہ مقرر کیا اور ڈھان لاکھ روپے کی قیمت کا غامت اور ایک لاکھ شہزادہ روپے کا سر بند اور شاہ بند اقبال خطاب مٹا کر کے اپنے تخت کے برابر سونے کی کرسی پر بیٹھنے کا حکم دیا (کاریغ مظفری)۔ ۱۷۵۰ء کے آخر میں پپاسی ڈاری تیس ہزار سوار اور دو سپہ سالار پہ منصب عطا کیا۔ اور جنوری ۱۷۵۰ء میں ساٹھ ہزاری تیس ہزار سوار کا منصب دیکر تیسس کر ڈرام کا علاقہ اور ایک کر ڈرامہ نقد اور بیارہ صوبہ مزید غایت کیا۔ اس زمانہ میں شہنشاہ شاہ جہاں سخت بیمار ہو کر کام کرنے سے معذور ہو چکا تھا۔ دارالشلوہ نے باپ کی محبت اور اس کی انتہائی کر دہی سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ اس راہ کا پہلا قدم بھائیوں کے کانٹے کو راہ سے ہٹانا تھا۔ رنگ زیب سیاسی لحاظ سے تمام بھائیوں میں نمایاں تھا۔ دارالشلوہ نے پہلے اسی کو نشانہ بنایا۔

شاہ جہاں بستر عالت پر بیٹھے بیٹھے صلح و صفائی کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ آخر کار سب بھائیوں نے دارالشلوہ کے صلابت محاذ قائم کر دیا، اور نتیجہ اُسے ہر سو کے میں شکست۔ مقدمہ بران۔ وہ ۲۰ مئی ۱۷۵۹ء (مطابق ۲۰ اگست ۱۷۵۹ء)۔ سرف بروز دو شنبہ گرفتار کر کے دہلی لایا گیا۔ خضر آباد کی عالتوں میں سے خواجہ پادہ کی ایک عالت جو کافی مضبوط تھی۔

نہر شاہ بادشاہ کی منہ بولی بہن تھیں۔ اس شادی میں خورد شہنشاہ دہلی حضرت محمد شاہ بادشاہ
بنفیس انیسویں تارکین درات و عمائدین سلطنت انیسویں تارکین درات و عمائدین سلطنت

جبل خندہ تارکین درات و عمائدین سلطنت انیسویں تارکین درات و عمائدین سلطنت
۱۰۵۹ء۔ مولف، کورہ شلوہ کو قتل کر دیا ایک اور نقش بایر کے مقبرہ میں سپرد
خاک ہوئی۔ مالکیت: زمزم محمد کاظم صفیہ ۱۰۲۰ء۔ مالکیت: مارا زب مد خان صفحہ ۴۰۔ تاریخ مظفری
و آئینہ نجات وغیرہ

مولانا تیار علی خاں دہلوی نے تاریخ عالم شامی مصنفہ کشور فراتی میں صفحہ ۱۵۰
پر تشریحات کے تحت یہ زمانے میں کہ تمام تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۰ ذی الحجہ کو بدھ کا دن
تھا۔ مالکیت: بدھ کے دن کے آخری حصے میں قتل کا حکم دیا۔ ۱۰۰ ہجرات کی رات شروع ہوئے
پر در شلوہ کو قتل کر دیا گیا صرف دو کتابوں میں اس سے اختلاف پایا ہے۔ پہلی کتاب تاریخ توحیدی
ہے ۱۰۱۱ سن ۱۰۶۹ء کے تحت لکھا ہے کہ ۲۲ ذی الحجہ شب چاند کو یہ واقعہ پیش آیا۔
سیر التاریخین نے آخر روز چاند کو وقت قتل قرار دیا ہے۔ لیکن ان اختلاف سے کہیں زیادہ
جستہ انجیز منتخب للباب (تصنیف خانی خاں) مطبوعہ ۱۸۶۹ء۔ کالج پریس، کلکتہ، صفحہ ۸۰ کا
یہ بیان ہے کہ ماہ ذی الحجہ کے وسط میں (یعنی ۱۵، ۱۶، ۱۷ کی تاریخوں میں) سے کسی ایک تاریخ کو
در شلوہ گرفتار ہو کر دہلی آیا۔ تارکین درات و عمائدین سلطنت انیسویں تارکین درات و عمائدین سلطنت
تشریح کنس خضر آبادی میں۔ ادبائے شہر نے یہ دیکھ کر محافظہ دستہ پر گندک اچھالی۔ دوسرے دن
بادشاہ کے حکم سے اس سرکش گروہ کا سرغنہ ہیبت خاں کی قتل کر دیا گیا۔ اور اس کے دوسرے
زن کر دی، بچہ کا آخر تھا۔ در شلوہ بھی، دار و بدینی کے جرم میں مشغول ہو گیا۔

آخری زمانہ کی یہ شادی بھی یادگار زمانہ ہوئی جس میں 'بقول سید غلام علی خان نقوی چھاپیس'

نہایت مختصر کتاب کے ہی بیانی کے مشابہت و نفرت تو یہاں آصفیہ شہ قیامس و دیگر
میں نال شرور، فوری شدت، مغرور، ہر گھاپے جس سر میں نہم کی چاند رات کو طرز الحکومہ
کا واقعہ نقل بتاتے ہیں۔

مردان قیام میں آؤ، غرضی رحمت سے تزیینت و قانات کا رشتہ ہی صفحہ ۱۰ پر تو یہ فرماتے ہیں کہ
بہت مدد یک یہ ستارین کا تختہ کون ہی بہت نہیں کرتے۔ اور روزیہ رشتہ اور اولیٰ شب
پیشہ کے سنی بہ ہی سوسنے ہیں یہی ہی دھن کا جو درجہ قیام ہو یا ہے تاریک تاریکی
کے ۱۰ روزی الحو بقید شب پیشہ کا یہ ملک بہت رہا ہے وقت سے پوری تاریک کا آغاز ہوا
رہا ہے چنانچہ بہت ہی رات کے بعد ہی ہوا تو ہمیشہ یا تھا اس سے اس نے ۱۰ تاریک
تو رہے لہذا وہی سورجوں نے ۱۰ تاریخ اچھی ہے انھوں نے اپنے ذہن میں بدستہ کا دن
رکھا۔

اور شہزادہ صوفی منشا شاہ وہ تھا۔ ابتدا میں سلسلہ قادریہ میں شاہ بدش کے ارجمند
معین ہوا تھا۔ سکینہ آریا اور محبت جوانی اسی وقت کے تھی۔ اس نے تاریف کی تھیں بعد
از اس ہندو صوفی وہ دیوہ پورا تھیں مذہب سے آزاد ہو گیا۔ درباری ارا اور عالم مذہبی رہا یا
اس باعث اس سے بدظن تھی۔

دارِ خلدہ نشاء بھی تھا۔ قادری تخلص کرتا تھا۔ مختلف جمعوں اور تہذیبوں میں اسکے اشعار بلند مقام پر پہنچے ہیں۔ مولانا شبلی رحیم نے اس کے مکمل دیوان کا نسخہ شریف علی حسن منشاہی نے اس کے سابق پرنٹنگ فکری شمس الدین ہند کے پاس دیکھا تھا۔

دہلی وغیرہ کے ہمراہ نواب ابو النصور صفدر جنگ کو بھی مقابلہ کیلئے بھیجا تھا ۲۸
 اس جنگ میں نواب صفدر جنگ کی بائیں آنکھ میں دشمن کا ایک تیر لگا جس سے
 نیکی ایک آنکھ جاتی رہی۔ نواب قمر الدین خاں اعتماد الدولہ، وزیراعظم دہلی اس
 جنگ میں کام آئے۔ اعتماد الدولہ نواب قمر الدین خاں وزیراعظم کے ہلاک ہو جانے
 کے بعد شاہی فوج میں بددلی کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ لیکن نواب صفدر جنگ کی
 بروقت تدبیر اور کوشش سے شاہی فوج ظفریاب ہوئی۔ "فتح خدا ساز" اس
 جنگ کی فتحیابی کی تاریخ ہے۔

صوبہ دار سے نواب وزیر

اس جنگ میں فتحیاب ہونے کے بعد نواب ابو النصور صفدر جنگ دہلی
 واپس ہو رہے تھے، انھیں پانی پت ہی میں اطلاع ملی کہ محمد شاہ بادشاہ دہلی کا
 ۲۰ ربیع الثانی ۱۱۴۱ھ مطابق ۱۵ اپریل ۱۷۲۸ء بروز دوشنبہ انتقال ہو گیا۔

۲۸۔ دہلی کی شاہی فوج کا مقابلہ سرہند (پنجاب) میں احمد شاہ بہانی کی فوج سے ہوا
 تھا۔ یہ جنگ چودہ نوا ۱۵ مارچ ۱۱۴۱ھ بمطابق ۲۵ ربیع الاول ۱۱۴۱ھ بمطابق
 ۲۸ مارچ ۱۷۲۸ء خایت، ارماتج ۱۱۴۱ھ تک مسلسل ہوئی۔ ہی۔ مولف۔
 خاتیمہ ۱۰ مارچ ۱۷۲۸ء بروز پنجشنبہ۔ مولف ایک مسلسل ہونی لکھی۔ مولف
 ۲۹۔ بیگانہ وودھ صفحہ ۲۳

۳۰۔ نواب قمر الدین خاں وزیراعظم دہلی کا انتقال ۱۱ ربیع الثانی ۱۱۴۱ھ مطابق ۲۲ ربیع الاول
 ۱۱۴۱ھ بروز جمعہ، جب وہ چلشک کی نماز پڑھ رہے تھے، نماز کی حالت میں توپ گور
 لگنے سے مصطیٰ ہو گئے۔ مقدمہ رتلخ دیبند صفحہ ۱۱۔
 محمد شاہ بادشاہ دہلی کا سربراہ تلخ وقات "ہائے پائے رفت از جہاں محمد شاہ ہے"

چنانچہ پانی پت ہی میں ۱۸ اپریل ۱۹۲۸ء مطابق یکم جمادی الاول ۱۳۴۷ھ ہجری
 بروز دوشنبہ، ولیعہد شاہزادہ احمدؒ مجاہد الدین احمد شاہ بہادر غازیؒ
 کا لقب اختیار کر کے اپنی تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔ اس موقع پر صدر جنگ
 نے ایک معمولی ٹوکری پر زرد دوزی کپڑا منڈھ کر اس پر موتیوں کی جھلڑاں لگی اور
 بطور تہنیتی شاہی، احمد شاہ کے سر پر اپنے ہاتھوں سے بند کر کے تخت نشینی
 کی مبارکباد دی۔ احمد شاہ نے موتیوں کا ایک ہار اپنے گلے سے اتار کر ان (صدر
 جنگ) کے زینہ گلو کرتے ہوئے فرمایا: ”مجھ کو تخت نشینی اور آپ کو وزارت
 مبارک ہو۔“ چونکہ عثمانیہ الدولہ نواب قمر الدین خاں وزیراعظم دہلی کا انتقال
 ہو چکا تھا اس لئے نواب صدر جنگ انکی جگہ پر بحیثیت وزیراعظم کام
 کرتے رہے۔ اور بتاریخ ۱۹ جون ۱۹۲۸ء مطابق ۳ رجب المرجب ۱۳۴۷ھ
 بروز اتوار احمد شاہ بادشاہ نے صدر جنگ کی وزارت کا باقاعدہ اعلان
 کر دیا۔ اور ۱۶ جولائی ۱۹۲۸ء مطابق یکم شعبان ۱۳۴۷ھ ہجری یوم شنبہ
 (سینچ کو ان کے بیٹے جلال الدین حیدر کو شجاع الدوا کا خطاب عہدت فرمایا

۳۶۔ بیگم اور محمد صفحہ ۲۶ (۳۲) بیگم اور محمد در بیان ”نواب صدر جہاں یکم“

۳۷۔ تاریخ بیگم و محمد نقاب از محمد مرزا محمد تقی۔

۲۵۔ وقائع دلیہ نے مقدمہ لکھ کر صدر جنگ کے پشت پائیں سرطانی مارے

کا پھڑانک لایا تھا۔ جو ہلندی ترمیم ہو گیا کہ علاج ہو گیا اور مسلک ثابت ہوا (صفحہ ۶۸)

محمد عارف و نوات صفحہ جنگ یہ ہے:-

”با وادہ مقیم بہشت بری“

اس طرح اب نواب صفدر جنگ کی صوبیداری کی چکری میں وزارت کی کلنی بھی لگ گئی اور وہ صوبیدار سے "نواب وزیر" مشہور ہو گئے ۲۲

نواب صفدر جنگ کی موت

مرزا منصور علی خاں (نواب ابوالمنصور صفدر جنگ) نے ایک نہریلے پھوڑے کے اثر سے ۵ اکتوبر ۱۹۱۷ء مطابق ۱۱ ذی الحجہ ۱۳۳۶ھ بروز پیر بمقام سلطانپور میں انتقال ہو گیا ۲۵ نواب بیگم (زوجہ صفدر جنگ) صاحبہ جو ہمراہ تھیں، موصوف کی موت کا راز کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ مبادا عالم غربت میں کوئی فتنہ نہ اٹھ کھڑا ہو۔ دوسرے دن یعنی اتوار کی صبح کو نعش باقی کی عماری میں رکھ کر سوار ہوئیں اور اسی روز شام کو فیض آباد پہنچ گئیں۔ جب مجلس میں پہنچیں تو موت کا راز ظاہر کیا۔ ۲۷ دوسرے دن یعنی ۷ اکتوبر ۱۹۱۷ء دو شہ کو شاہی اعزاء و احترام کے ساتھ جنازہ اٹھایا گیا۔ نعش "کلاب باڑی" میں دفن کی گئی۔ پھر دہلی بھیج کر درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء، محبوب الہی (رحمۃ اللہ علیہ) سے تھوڑے فاصلہ پر سپرد خاک کی گئی، جس پر ان کے فرزند ارجمند نواب شجاع الدولہ نے سید محمد ابراہیم عرف بلال محمد خاں کی نگرانی میں تیس لاکھ روپے کی لاگت سے ایک عالی شان سنگی مقبرہ تعمیر کرایا۔ ۲۸ یہ مقبرہ آج بھی مغل آرٹ کا ایک بہترین نمونہ تصور کیا جاتا ہے۔ ۲۹

خواجہ عبدالرزاق عشتی بھٹوی نے لکھا ہے کہ نواب صفدر جنگ کا انتقال باہر گھاٹ نظامت سلطانپور میں ہوا۔ (نیرنگ خیال، لاہور، عید نمبر ۱۹۲۹ء صفحہ ۱۳۶)

مصلحت وقت کی مجبوری

گمراہ گراں کس سے اجاب پہ جانے پا کہ حرفِ شکایت جو زباں تک نہیں آیا

نواب صفدر جنگ کے کا ابتدائی عہد حکومت نہایت پُر آشوب تھا۔ ملک میں احمد شاہ ابدالی کے حملہ کے اثرات اور سلطنتِ دہلی کی کسمپرسی کے حالات، قلعہ معلیٰ کے اندر کی سازشوں نے تشویشناک شکل اختیار کر چکی تھی۔ ہر طرف امن و امان کا فقدان تھا۔ خود نواب صفدر جنگ کے علاقوں میں بھی بد امنی اور جاگیرداروں کی سرکشی کے آثار واضح اور نمایاں تھے۔ سلطنتِ اردوہ میں جس قدر کشیدہ و متعبر نوع کی ضرورت تھی اسی ان کے پاس نہیں تھی۔ سلطنت کے سیاسی حالات اس بات کے متفقین تھے کہ سعادت خاں برہان الملک کے بے کئے ہوتے ہمارے پاس پانچ سالہ لڑکوں اور ہزاروں کے مظالم و راکھی جاگیرداروں کو واکندہ کر کے معتبر اور اپنے طبقہ کے لوگوں کو محنت و مشقت اور جفاکشی و بردباری کی اعلیٰ ترین انسانی صفات سے محروم کر کے دوبارہ مفت خوری اور پرتکلف عیش و آرام کی عیاشانہ زندگی بسر کرنے کی راہیں کھول دی جائیں۔ چنانچہ یہ دروازے بدستور سابق بند رکھے۔ مآثر الکرام ایسا تحریر ہے کہ:

۳۷۔ عماد السعادت صفحہ ۶۷۔ یہ مقبرہ دہلی میں بوالا اڈہ کے ایک بڑے مکان کے قریب ہے۔

بشریہ دینا، احمد نے رتعاتِ مملکت دہلی جمع دہائی گزشتہ ۱۹۱۰ء میں مقبرہ صفدر جنگ کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ یہ قلعہ روپے کے مرنے سے تیرا کر گیا تھا۔ موصوفہ دہلی یہ تفصیل کی ہے

دیکھئے رتعاتِ مملکت دہلی ۱۹۱۲ء

۳۸۔ تاریخِ نیگات اردوہ در بیان نواب صفدر جہان بیگم

”بعد از تھال بران ملک نوبت حکومت بخواہر زادہ ابوالمنصور

خان صفدر جنگ سید و وظائف و اقطاعات بدستور مضبوط ماند

(صفحہ ۲۲۲)

اور اس طرح نواب صفدر جنگ نے اودھ کی نوزائیدہ سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجنے سے بچا لیا۔

نواب شجاع الدولہ کے علاوہ صدر جہانگیر، نواب بیگم، صاحبہ کے کوئی اولاد نہ تھی البتہ حسن علی خاں کی ایک لڑکی جو بی بی عائشہ کے بھائی سے تھی، اس کو انہوں نے بڑے ناز و نعم سے پالا تھا، جب وہ سن شعور کو پہنچی تو اس کی شادی مرزا محمد نصیر کے ساتھ کر دی تھی۔

ناگفت بہ

نواب ابوالمنصور صفدر جنگ کے انتقال کے بعد، نواب بیگم صاحبہ کے اکلوتے بیٹے مرزا جلال الدین حیدر لیا طلب بہ نواب شجاع الدولہ مسند ریاست پر متمکن ہوئے مسند نشینی کے چند ہی دنوں بعد شجاع الدولہ کی شیطانی فطرت نے انوپ گیر اور امر اوگیر دو گوسائیوں کی معرفت اجودھیل کے ایک کٹھری کے مکان پر رات کی

۳۹۔ بادشاہ بیگم اودھ

۴۰۔ نیگمات اودھ دریاں، نواب صدر جہانگیر

(۲)۔ انوپ گیر کو سائیں (جس کا خطاب راجہ بہت بہادر انوپ گیر شائیں تھا۔ عرف)

اور اس کا بھائی امر اوگیر کو سائیں جو عمر میں انوپ گیر کو سائیں سے بڑا تھا۔ یہ دونوں پیدائشی برہمن

وہ برباد ہو جائیگا۔ لیکن نواب بیگم صاحبہ کی دوزنی و دوسا نہ ریش اور حسد نہ ہر
سے یہ آگ شعلہ دے لٹھنے سے پہلے ہی فرو ہو گئی۔

نواب شجاع الدولہ نے ہر چند لاابانی اور مضطرب طبیعت پائی تھی لیکن
اپنے صوبہ کے انتظامی امور سے غفلت نہ برتتے تھے۔ ان کے عہد میں بہت سے
ہندو عہدیدار اور اچھی جنگجوں پر ملازم تھے اور نواب کو ان پر بڑا اعتماد تھا۔ ان کے
عہد حکومت میں عموماً اچھے خاندان کے لوگوں کو انتظامی معاملات میں ترجیح دی جاتی
تھی۔ (تاریخ آصفی صفحہ ۱۸)

قبیح افعال کے پیشرو

یہ ایک حقیقت ہے کہ نواب شجاع الدولہ لہو و لعب و دیگر افعال مذمومہ
کے ارتکاب میں مایک تھے۔ یہ اپنے خاندان کے پہلے شخص تھے جنہوں نے اخلاقی
گراؤٹوں سے نہایت قبیح مثالیں چھوڑی ہیں جو ان کے اکثر و بیشتر جانشینوں
نے اختیار کیں۔ نواب شجاع الدولہ اپنے خاندان میں دوسرے وزیر الممالک ہوئے

۲۳۔ اسماعیل بیگ خاں ایرانی نژاد تھا۔ خود کابل میں پیدا ہوا تھا اس نے اسماعیل خاں

کابلی کہلاتا تھا۔ صفدر جنگ اس کی حسن تدبیر کی وجہ سے اس پر بھروسہ کرتے تھے۔ یہ تمام
حاشیہ نشینوں پر چھایا ہوا تھا۔ صفدر جنگ کے انتقال کے بعد اسماعیل خاں کابلی اور
ریاست پر حاوی ہو گیا۔ جب کھسرویوں کا مجمع رام نرائن دیوان کے ساتھ اس کے پاس
پہنچا تو اس نے منغل سرداروں کو جمع کر کے حکم دیا کہ راجہ بہادر کو نواب سے مانگو اور
اسکی نالائقی کی سرزد و رنہ ہم محمد علی خاں بہادر عم زاد شجاع الدولہ کو ارباب سے بلا کر صفدر جنگ

ہندوستان عالم بادشاہ نے انھیں "وزیر الممالک" کا منصب عطا فرمایا تھا۔ یہ
 کی جگہ پر درجہ کا حاکم بنادیں گے۔ یہ تمام شجاع الدولہ کو سخت ناگوار گذرا اور
 آئندہ کچھ دنوں کے دن میں اسماعیل خاں کا بھی کھٹ سے دشمنی پیدا ہو گئی۔ نواب شجاع الدولہ
 کی والدہ نواب بیگم صاحبہ نے امیرنوں دیوان اور اسماعیل خاں کا بیرونوں کو سمجھا بچھا کر رام
 کو بلا کر اسماعیل خاں کا بیٹی کا ترور سوٹ دربار سے اٹھ گیا۔
 اسماعیل خاں کا بیٹی کا انتقال، ۱۱۶۵ھ مطابق ۱۳ اکتوبر ۱۷۵۵ء بروز بدھ شنبہ

— مولف (چ)۔

۲۳۔ بیگم اودھ ص ۲۸ و غلام السعادت صفحہ ۱۸
 ۲۵۔ نواب شجاع الدولہ صرف نور توں ہی سے زیادہ رغبت نہیں رکھتے تھے بلکہ ایک
 ملازمین سے سوزن و دیرست بھی تھے۔ بہت سے نازک اندام و کلنام اور خواجہ سرا آپ کے
 تصرف میں رہتے تھے۔ راجہ بہت بہادر و گیر جو حسن و جمال کا یکز تھا، اس سے بھی مثل یوسف
 خواجہ سرا بہت مالوس تھے تاریخ تیموریہ سے معلوم ہوتا ہے کہ راجہ بہت بہادر و گیر جو حسن و جمال
 کا تمام آپ کے ساتھ زمانہ اطوار سے رہتا تھا۔ (تاریخ اودھ ملخص صفحہ ۱۹۵) صاحب
 احوال واقعات نے لکھا ہے کہ امراؤ گیر اور نواب گیر دونوں گہری چہین می سے اپنے گہرا جند گہر
 کے استعمال میں رہتے تھے۔ اور اس فن میں اتنی کامل مہارت حاصل کر لیا تھا کہ ایک بار بھی
 جو شخص ان سے لطف اندوز ہوتا وہ تمام عمر وہ بارہ حصول لذت کے لئے بچپن رہتا۔

۱۸۱۰ء ۱۸۱۱ء ۱۸۱۲ء میں امراؤ گیر نواب شجاع الدولہ کی ایک آشنا طوائف
 کو لے بھاگتا۔ کین اپنے فن میں بگائے روزگار ہونے کی وجہ سے اس نے
 نواب سے چند "لٹا" میں کرنے کے بعد انھیں رام کر لیا اور اپنا تمام تصور معاف
 کر لیا (ایضاً صفحہ ۲۳)

اولوالعزم اور سیر چشم بھی تھے۔ ان انسانی صفات کے باوجود بد عہدی، ظلم و تعدی اور بے رحمی و نساوت بھی ان میں بدرجہ اتم تھی^{۴۶}

شجاع الدولہ کی بد عہدی و بے رحمی

حافظ رحمت خاں سے جو تعلقات اور دوستی نواب شجاع الدولہ سے تھی، تاریخ کے صفحات گواہ ہیں۔ ان دیرینہ تعلقات کو یکلنت فراموش کر کے روہیلہ افغانوں کے خاندانوں کے نام و نشان مٹا دینے میں ظلم و ستم، ویرانی و بے رحمی کا کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔^{۴۷} ناظم بنگالہ محمد قاسم خان، عالی جاہ، جو مقتدر امیر تھے، اپنے تمام راجہ و جواہر اور قیمتی اشیاء کے ساتھ نواب شجاع الدولہ کے پاس کر پناہ گیر ہوئے تھے، نواب موصوف نے بکسر کی لڑائی میں شکست اٹھانے کے بعد ان کا سامان راجہ و جواہر ضبط کر کے انھیں گدائے محتاج کر دیا تھا۔^{۴۸} مولوی ذکار اللہ صاحب نے تاریخ ہندوستان میں لکھا ہے کہ عالیجاہ کے مال کی ضبطی میں وزیر نے ذرا بھی مروت اور انسانیت نہیں برتا۔

یہ وہ ناقابل تردید حقائق ہیں جن سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی اور نہ کسی تاویل سے ان کی اہمیت کو کم کیا جاسکتا ہے۔

۴۶۔ بادشاہ بیگم اور صفحہ ۷۰۔

۴۷۔ بادشاہ بیگم اور صفحہ ۷۱۔

۴۸۔ گل رعنا صفحہ ۲۵۵ و ۲۵۴۔

ایک مفخر زادِ راہ

نواب شجاع الدولہ کی بد عہدیوں، قساوت کے کارناموں اور بے راہ روی کے واقعات و نا عاقبت اندیشی بے اعتدالیوں کے ضخیم دفتر میں صرف ان کی ماں "نواب بیگم" صاحبہ کے پاس ادب اور لحاظ کا ایک ایسا مفخر اور مقدس زادِ راہ بھی موجود ہے جو نواب موصوف کی تمام غلط کاریوں، بے راہ روی اور افراط و تفریط کے واقعات و حادثات پر پوری طرح حاوی ہے۔ مولوی فیض بخش کاکوروی نے نواب شجاع الدولہ کی اس صفت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"— عالم آخرت میں اگر نواب شجاع الدولہ کی نجات ہوگی تو صرف اسی سعادتمندی کے طفیل ہوگی۔"

شجاع الدولہ کی بیماری اور موت

جن دنوں نواب شجاع الدولہ، فیض آباد میں ایک عمارت لب دریا تعمیر کر رہے تھے^{۲۹} انھیں دنوں ان کا پر وائے اجل آپہنچا۔ انکی ران کی جڑ میں ایک پھنسی نمودار ہوئی جو بڑھ کر ایک بڑے ذیل کی شکل اختیار کر گئی۔ علاج معالجہ میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی گئی۔ ایک ماہ تک شدید تکلیف اٹھانے کے بعد ۲۹ جنوری

۲۹۔ صاحب فیہ التواریخ نے لکھا ہے کہ: "ہو بیگم" صاحبہ کے علاوہ نواب موصوف کے محل میں ہزاروں عورتیں تھیں جو "خورد محل" اور "حور محل" میں رہتی تھیں لیکن مولف تاریخ اودھ نے ان عورتوں کی تعداد دو ہزار سے زیادہ بتلایا ہے۔ مولف

۱۷۷۷ء مطابق ۱۷ دیقعدہ ۱۱۸۸ھ بروز پنجشنبہ بعمر چوالیس سال دو ماہ
بوقت ۲ بجے شب اس عالم فانی سے رخصت فرمایا اور کلاب باڑی میں
خواجہ پورہ کے مہوشان لالہ رخاں کے قرب میں سپرد خاک کئے گئے۔
تاریخ رحلت یہ ہے:

شجاع الدولہ وفات یافت

نواب شجاع الدولہ کی بے وقت جواں مرگ موت کے بارے میں سید
غلام حسین طباطبائی کے تاثرات یہ ہیں۔

”دوسہ کار کمال زشتے از او سرزد کہ ایزد تعالیٰ در انتقام
بماں غلبہ اور ابادل پیر از حسرت در عین جوانی در زماں پر خورد
از دولت و کامرانی محروم و مایوسی ساختہ بدایہ آخرت بانہاراں
افسوس رہا اگر دانید۔“

جلد ۲ صفحہ ۹۴

۵۰۔ ”حور محل“ کے علاقہ کے ارد گرد مزید نئی عمارتیں تعمیر کروا رہے تھے کیونکہ ہزاروں
عورتوں کا یہ ”قید خانہ“ ”حور محل“ اب قیدیوں کے روز افزوں اضافہ کی بنا پر رہائش
کے لئے قطعی ناکافی ثابت ہو رہا تھا اور مزید قیدی عورتوں کے رکھنے کی ان میں گنجائش
نہیں تھی۔ مولف۔

۵۱۔ بعض مورخین نے سرطانی پھوڑا بتلایا ہے لیکن بعض مورخین کا خیال ہے کہ
آنشکی مادہ کا کوئی بدترین قسم کا زخم تھا۔ جس کا ہر چند ہی دنوں میں جسم میں پھیل گیا
تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ مولف۔

شجاع الدولہ کے متوقع جانشین

نواب شجاع الدولہ کی وفات کے وقت ان کے تین بیٹے بالغ اور عوام

۵۲۔ تاریخ بیگات اور صفحہ ۲۸

نواب شجاع الدولہ نے بقول عماد السعادت (صفحہ ۱۱۹) ۲۴ ذیقعدہ ۱۱۸۸ھ کی دو گھڑی رات گدھے انتقال کیا۔ اور ۲۴ کے دن دفن کیا گیا۔ یعنی انتقال ۲۳ اور ۲۴ کے درمیان شب میں ہوا۔ اور تجبیز و تکفین ۲۴ کو دن میں عمل میں لائی۔ تاریخ محمدی میں شب جمعہ ۲۴ گھڑی رات گئے ۲۴ تاریخ کو انتقال کیا دکھایا ہے۔

تاریخ فرشت آباد (صفحہ ۸۰۔ الف)۔ منقبات التواریخ (مطبوعہ نول کشور۔ کانپور ۱۲۸۳ھ صفحہ ۳۵۴) اور اورینٹل بائوگرافیکل ڈکشنری (لندن مطبوعہ ۱۸۹۳ء صفحہ ۳۸۲) میں مسٹر تھامس ولیم بل میں بھی ۲۴ ذی قعدہ مندرج ہے۔ لیکن تنقیح الاخبار (تصنیف رائے مولانا فلسفی بریلوی) میں تاریخ انتقال ۲۲ ذیقعدہ بتائی ہے۔ یہ رائے غالباً عماد السعادت کے بیان غلط سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ اس لئے کہ قری حساب میں بعد مغرب نئی تاریخ شروع ہو جاتی ہے۔

مرآۃ الاحوال میں ۲۲ ذی قعدہ کی وفات لکھی ہے جو بالیقین کتابت کی غلطی ہے۔ 'جام جہان ناما' میں ۲۵ ذیقعدہ کی تصریح کی گئی ہے مگر یہ قول کسی اور مورخ کی تائید سے محروم ہے۔ (مولانا امیناز علیخان عرشی مرحوم۔ تشریحات وقائع عالم شاہی صفحہ ۱۵۰)

گلستا رحمت میں یہ تحریر ہے کہ حافظ رحمت خاں کی شہادت کے آٹھ مہینے بعد، شعبان میں شجاع الدولہ کا انتقال ہوا۔ چونکہ اس کتاب میں یہ بھی درج ہے کہ شنبہ ۱۱ صفر

کی نگاہوں میں قابل اعتبار تھے۔ سب سے بڑے بیٹے مرزا یحییٰ علیخان عرف
مرزا امالی الخاں بہ نواب آصف الدولہ تھے، جو نواب بیگم کے بطن سے تھے۔
یہ باپ کے زمانہ ہی سے ولیعہدی کے لئے نامزد ہو چکے تھے۔ چہرے کا نقشہ، باپ سے
مٹا جلتا تھا لیکن خوش قامت نہ تھے۔ اوپر کا دھڑنسبتاً بڑا تھا اور نیچے کا دھڑ
کمر سے پاؤں تک اس قدر چھوٹا تھا کہ گھوڑے کی سواری نہیں کر سکتے تھے۔ اس
جسمانی خرابی کے ساتھ مزاج میں حد درجہ سفلہ پن تھا۔ ان کی بد فعلیوں، شراب
نوشیوں اور سفلہ پن سے انکی داری نواب بیگم صاحبہ سمیت نالاں تھیں۔^{۵۱} یہ
باپ کی طرح علمدہ دربار کرتے تھے۔ باپ بیٹے کے درمیان ملی، انتظامی معاملات
و انتظامات کے سلسلہ میں خط و کتابت ہوتی رہتی تھی۔ حکومت کا نظم و نسق سید
مرتضیٰ خاں طباطبائی کے سپرد تھا جو آخر میں 'مختار الدولہ' کے لقب سے
مشہور ہوئے۔^{۵۲}

۱۱۸۰ھ (۱۷۶۷ء) میں واقعہ شہادت پیش آیا تھا۔ لہذا شجاع الدولہ کا انتقال رمضان
(نومبر ۱۷۶۷ء) میں ہونا چاہیے۔ یہ گل رحمت میں بھی مذکورہ بیان ہی نظر آتا ہے، لیکن آٹھویں
مہینہ کو سوال کا مہینہ بتایا ہے۔ یہ دونوں بیان قابل قبول نہیں ہیں۔ عبرت نامہ (تصنیف خیر الدین محمد
اربابی) میں بھی آخر ماہ ذیقعدہ ہی لکھا ہے۔ اور ماوہ تاریخ شجاع الدولہ وفات یافتہ

بتایا ہے جو غلط ہے۔^{۵۳} ایضاً
مولوی محمد فیض بخش کاکوری نے اپنی کتاب فرح بخش میں لکھا ہے کہ نواب شجاع الدولہ کی موت کا
واقعہ ۲۳ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ بروز پچشنبہ کو جبکہ چاند گھڑی رات باقی تھی، ہوا تھا مفتاح التواریخ
میں ۲۴ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ مطابق ۹ جنوری ۱۷۷۵ء بروز پچشنبہ لکھی ہے اور سیر المتاخرین و

جہاں بیگم کو اپنے اس اکلوتے بیٹے (آصف الدولہ) سے ایسی نفرت پیدا ہو گئی تھی کہ ناالینا بھی گوارہ نہ تھا خطوط پر "برخوردار نور چشم" کے الفاظ کے بجائے صرف "آصف الدولہ" لکھواتیں۔^{۵۵} بقول مولف تاریخ اودھ:

"اس قدر بے حجابی، نامشروع اور خارج از غیرت و حیا کاموں میں اختیار کر لی تھی کہ پواج اور بازاری آدمی بھی مات ہو گئے وہ بھی ایسے کاموں کو سن سن کر شرمندہ ہوتے تھے۔"

(جلد ۳ صفحہ ۴۱)

مرزا سعادت علی خاں

دوسرے لڑکے مرزا سعادت علی خاں تھے جو باپ کی وفات کے وقت بیسٹ ہزار سوار و پیدل فوج کے ساتھ بریلی میں رہتے تھے جو ابھی چند ہی پہلے روہیلوں کے مقابلہ میں فتح ہوا تھا۔ اس علاقہ کا ملکی انتظام اور فوجی نظم و نسق ایک حبشی غلام محمد بشیر خاں کے سپرد تھا۔ تفصل حسین خاں صاحبزادہ مرزا سعاد علی خاں کے آملیق و استاد تھے۔^{۵۶}

تاریخ مظفری میں ۲۱ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ کی تاریخ وفات لکھی ہے۔ یکم جنوری ۱۱۸۸ھ کا دن تھا، اس حساب سے اس ماہ جنوری میں ۵-۱۲-۱۹ اور ۲۴ کی تاریخوں میں پچیس دن کا دن تھا۔ اسی طرح یکم ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ کو پچیس دن تھا۔ اس ماہ میں ۳-۱۰-۱۷-۲۴ اور ۳۱ کی تاریخوں میں پچیس دن کا دن تھا۔

۲۲، ۲۵، ۲۸ ذی قعدہ کو ترتیب وار منگل اور جمعہ کا دن تھا جبکہ دن سپرد خاک کیا گیا تھا۔

مولف

نواب شہامت علی خاں

نواب شجاع الدولہ کے تیسرے بیٹے نواب شہامت علی خاں عرف مرزا جنگل تھے۔ جو غیرت و شجاعت اور تحمل کی اعلیٰ خوبیوں سے آراستہ تھے اور بڑے بھائی کے ساتھ رہتے تھے۔ انکی نیابت کے فرائض محمد ابرج خاں انجام دیتا تھا جو پہلے لشکر کے بازار کا داروغہ تھا اور ترقی کر کے نیابت کے عہدہ تک پہنچا تھا۔^{۵۰} دفتری اور حکام سے محاسبہ کا کام صورت سنگھ اور ان کا داماد جگناتھ سنگھ انجام دیتا تھا۔

۵۳۔ مقدمہ وقائع دلیپیر صفحہ ۷۹

۵۴۔ سید تقی خاں مختار الدولہ نواب سید مصطفیٰ خاں کا بھتیجا تھا۔ جو نواب شجاع الدولہ کے خاندان سے اس کا دیرینہ تعلق تھا اور ان کے اعزہ میں سے تھا۔ اس نے ہندوستان میں کبھی محمد شاہ بادشاہ دہلی اور کبھی نواب ابوالمنصور صفدر جنگ کی ماتحتی میں ملکی خدمات بھی انجام دیا تھا۔ (تفصیل الغافلین اردو صفحہ ۲۶)۔ مختار الدولہ نواب مصطفیٰ خاں نے نواب آصف الدولہ کے تحت نشین ہونے کے بعد سید مرتضیٰ خاں مختار الدولہ کو اپنا نائب مقرر کر کے انتہائی امور اس کو دیدیئے تھے لیکن مختار الدولہ (سید مرتضیٰ خاں) اپنی بد مزاجی کی وجہ سے کافی بدنام ہوا۔ مارچ ۱۷۷۷ء مطابق صفر ۱۱۹۱ھ بمصریٰ میں قتل کر دیا گیا

(C.A.C. Vol. VII Pg. 278)

۵۵۔ بادشاہ بیگم اور صفحہ ۷۹

۵۶۔ تفضل حسین خاں لاہور کے رہنے والے تھے۔ ان کی پیدائش بھی لاہور میں ہوئی تھی۔ یہ کہہا شہ خاں کے پوتے تھے جو لاہور کے صوبیدار معین الملک کی طرف سے بادشاہ دہلی کے دربار میں وکیل تھے تفضل حسین خاں اُس طرف کی تباہی کے بعد

صورت سنگہ بڑا دیانتدار اور کاموں کو سمجھنے والا تھا۔ پیدل اور سوار فوج کا انتظام محمد بشیر خاں کے سپرد تھا۔ گویا وہ ایرج خاں کی طرح "دوسرا نائب" تھا۔ کیونکہ بعض احکام اس سے وابستہ تھے اور کچھ کا تعلق ایرج خاں سے تھا لیکن کچھ احکام ایسے بھی تھے جو ان دونوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ (تاریخ آصفی صفحہ ۲۸) نواب شجاع الدولہ کے آخری زمانے میں اودھ تشریف لائے اور یہاں کی سرکار سے وابستہ ہو گئے۔ (تاریخ آصفی صفحات ۲۸ و ۲۷)

۵۰۔ مرزا شہامت علی خاں کا پورا نام عضد الدولہ مبارز الملک مرزا شہامت علی خاں بہادر خفہ جنگ تھا۔ نواب آصف الدولہ کے انتقال پر ابراہیم بیگ افسر توپ خانہ اور عبدالرحمن خان قندھاری کے بھر دہر پر منصب وزارت کی امید باندھ کر "بیو بیگم" صاحبہ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ میرا ساتھ دیں تو ہندوستان مستحکم ہو جائے گا، گزیرہ راضی نہ ہوئیں اور انھیں اپنے اس ارادے سے باز رہنا پڑا۔ (تشریحات وقائع عالم شاہی صفحات ۲۰۹ و ۲۱۰) مزید ملاحظہ ہو عماد السعد صفحہ ۱۱۹ نیز تواریخ اودھ صفحہ ۱۳۵ و سلاطین اودھ از سید کمال الدین حیدر صفحہ ۳ نیز کلند۔ ان پرشین گرسپانڈنس جلد ۱، انڈیکس صفحہ ۴۲

۵۱۔ مرزا ابوطالب اصفہانی لندی نے لکھا ہے کہ نواب ابوالمنصور صفدر جنگ ۱۱۷۰ھ کے زمانہ سے اس وقت تک سوائے مختار الدولہ (نواب مصطفیٰ خاں) کے کہ بڑے لوگوں میں سے تھا، ہمیشہ معمولی آدمی نواب وزیر کے نائب ہوئے۔ صفحہ ۲۷۔

۵۲۔ ۱۱۷۵ھ، راخہ صورت سنگہ، راجہ بہانرائن کا اطلاق نویس اور ہم قوم تھا اور

بہنی بہادر راجہ بہانرائن کا صراحتی برادر تھا۔ ان کے باپ کا نام بہانرائن راجہ تھا۔ وہ اور اس کے بھائی برتاپ سنگہ، نواب صفدر جنگ کے دیوان تھے جو آٹھارہم کٹھری کے لڑکے تھے

آصف الدولہ کی نسبت اور شادی

الغرض مسند وزارت نواب آصف الدولہ جو نامزد و لیعہد اور نواب سیکم صاحبہ کے بطن سے تھے، مقدر ہوئی۔ ان (نواب آصف الدولہ) کی شادی خاندان وزارت دہلی میں ہوئی تھی۔ اس شادی کی نسبت پانے کے متعلق شیخ نقی حسین صاحب نے لکھا ہے کہ:

جو برمان الملک کے دیوان : چکے تھے۔ (روح آصفی صفحات ۲۷، ۲۸)

صورت سنگھ نواب شجاعت الدولہ کا بڑا مستعد اور بہترین تھا جب آصف الدولہ تخت نشین ہوئے اور تختہ الدولہ (سید مرتضیٰ علیاں طباطبائی) کی مہمان پرستی تو صورت سنگھ کو بہت راجہ بہا۔ خطاب و رعایت دیکر محمد بشیر خاں کی جگہ نو بہار مقرر کیا گیا (عماد السعادت صفحہ ۱۲۲) تاریخ اورھ جلد ۲ صفحہ ۶۶

اریٹ (ELIOT) کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں صورت سنگھ اس خدمت سے برطرف کر دیئے گئے کیونکہ تواریخ اورھ میں لکھا ہے کہ امیر الدولہ حیدر علیگ خاں اسکی برطرفی کا باعث ہوا تھا۔ (ایضاً جلد ۲ صفحہ ۱۳۴)

۶۰۔ عماد السعادت (صفحہ ۱۲۲) اور تواریخ اورھ (جلد ۲ صفحہ ۶۶) سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح الدولہ (سید مرتضیٰ علیاں طباطبائی) — مولف، نے اسے راجہ کا خطاب دلا کر نواب آصف الدولہ کا دیوان مقرر کر دیا تھا — مولف

”جب نواب آصف الدولہ سن شعور کو پہنچے تو والدین کو
آرزو ہوئی کہ اپنے نور نظر کا سہرا دیکھ کر دل شاد کریں اور چاند سی
بہو بیاہ کر لائیں۔ اس خواہش کے پیش نظر پیر نامدار نے
خوش نظر علیخاں کو دہلی بھیج کر انتظام الدولہ کے لڑکے نواب امام الدین
خاں کو فیض آباد بلوا کر اپنی دلی خواہش کا اظہار کیا کہ میں اپنے لخت
جگر آپ کے والدین کی فرزندی میں دیکر آپ کی خواہش شمس النساء
کو اپنے گھر کا چراغ بنانا چاہتا ہوں۔“

تاریخ بیگمات اودھ کے بموجب، نواب شجاع الدولہ نے علی بیگ
خاں اور لطافت علیخاں کو کئی ہزار سوار فوج دیکر نواب قمر الدین خاں مرحوم وزیر اعظم
دہلی کی بیگم (شولا پوری بیگم۔۔۔ مولف) کو فیض آباد بلوایا اور بہت تعظیم و تکریم
اور نہایت دریا دلی کے ساتھ فرائض بہانداری انجام دیا چنانچہ ۱۸۷۷ء مطابق

”لطافت علیخاں خواجہ سرا کا خطاب“، اعتقاد الدولہ“ تھا۔ نواب شجاع الدولہ کے معتمد

مرد رہتے۔ یہ نہایت ہوشیار اور سیاسی و فوجی میں ماہر تھے۔

اطلاعات علیخاں نے لکھنؤ کے علاوہ دہلی میں بھی اپنی قدر و منزلت میں اضافہ کیا تھا کیونکہ
اعتقاد الدولہ کا خطاب اور خدمت بائیس اور گھوڑا، بادشاہ دہلی نے عطا کیا تھا۔ مرآت آفتاب
کے بموجب ان کے پاس دو تین پتیلیں تھیں۔ (تاریخ اودھ جلد ۲ صفحہ ۱۷) میں تین جگہ پانچ
پتلیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔۔۔ مولف، نجف خاں کے بعد اس کے۔۔۔ یہ سودا سہا یا کردار میں
اعلیٰ منصب حاصل کر کے حکومت کے نظم و نسق میں دخل حاصل کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں جو
پتیاں پر گزری اسے پریم کشور فرقی نے اپنی کتاب ”دقائق عامر شاہی“ کے صفحات ۱۲، ۱۳، ۱۴،

۱۱۸۱ ہجری قمری میں یہ نسبت قرار پائی اور سن ۱۱۸۳ ہجری مطابق ۱۷۶۹ء میں نہایت دھوم دھام اور تزک و احتشام کے ساتھ فیض آباد میں شادی ہوئی۔ اس وقت شاہ عالم، بادشاہ دہلی فیض آبادی میں موجود تھے۔ اس شادی میں نواب شجاع الدولہ نے پانی کی طرح روپیہ بہایا۔ شیخ تصدق حسین نے شادی کے مصارف کا محاط تخمینہ جو بیس لاکھ روپیہ تحریر کیا ہے۔ "دوسرے مورخین اور وقائع نگاروں کا تخمینہ مصارف بھی تقریباً اتنا ہی ہے۔

اور چند صفحات میں درج ہے۔ (دوسری تاریخیں بھی یہی کچھ بیان کرتی ہیں۔۔۔ صرف لطافت علی خاں، انفقہ الدولہ در خواجہ سر نے ۱۱۹۰ء مطابق ۱۷۷۶ء میں شہر دہلی کے باغ لکایا تھا۔ کسی شاعر نے اس باغ کا قلعہ تاریخ اس طرح کہا ہے:-

نہایت بانے علی لطافت خاں	بچہ فردوس زینت آرائی
سال تمسب ادب گفت دلم	گفتاںے لطافت افزائی

۵۰ + ۵۰۰ + ۹۹ = ۱۱۹۰ھ

معلوم ہوتا ہے کہ عمار السعدت کی آئیف تک لطافت علی خاں بقید حیات تھا، وقائع عالم

شاہی صفحہ ۱۱۹۰ء — مولف

۴۲ • بیگمات اودھ صفحہ ۴۲

۴۳ • ایضاً

۴۴ • تاریخ اودھ جلد سوم

خزاں بردوش بہار

شادی کے وقت مرزا یحییٰ علی خاں عرف مرزا المانی (آصف الدولہ) کی عمر تقریباً اکیس سال اور شمس النساء کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ شمس النساء کو سسرال سے "نواب بہو" یا بقول دیگرے "دلہن بہو" کا خطاب عطا ہوا۔ مگر بد قسمتی سے یہ شادی میاں بیوی کو اس نہ آئی۔^{۶۲} میاں بیوی میں ہمیشہ ان بن رہی نہ کبھی کسی کا دل ملا اور نہ کوئی اولاد پیدا ہوئی۔^{۶۳}

آصف الدولہ کی حکمرانی کی ہوس

نواب آصف الدولہ کی حکمرانی کی ہوس اور فوری حصول اقتدار کی مکروہ و بے موقع اور بے محل کوشش کے متعلق تفضیح الغافلین (اردو ترجمہ) میں "آغاز و قائع آصف الدولہ" کے عنوان کے تحت مرزا ابوطالب آصف بانی سندھ نے لکھا ہے :

۶۵۔ مشرکزی جون کونسلس مرہٹوں کی لڑائی کے خاتمہ پر اور وہ میں ریزیدنٹ مقرر ہوئے۔ یہ بادشاہ کونسل کے نام سے مشہور ہوئے۔ مشرکیز کفرین نے ان کی بے ہری اور حکمانہ انداز کو برداشت نہ کر سکتے تھے اور ان کے ماتحت کام کرے سے انکار کر دیا تھا۔ جون کونسل کا انتقال "رجون سنہ ۱۱۰۷ بروز دوشنبہ لکھنؤ میں ہوا۔

”۔ لوگوں نے ابھی نواب شجاع الدولہ کی تجہیز و تکفین بھی نہیں کی تھی کہ ولیعہد موقع تخت نشینی کی فکر میں پڑ گئے۔ سالار جنگ مرزا علیخان و دوسرے عہدیداروں کو جنازہ کے ساتھ جاتے ہوئے بلایا اور حکومت کی مسند پر بیٹھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ سب نے غرض کی کہ خدا کے فضل سے کوئی دوسرا سلطنت کا رعویدار موجود نہیں ہے۔ لازم و اعزہ انگریزوں کی وفاداری کا علم رکھنے کے باعث سب کے سب فرمانبرداری پر آمادہ ہیں۔ اگر اس کام میں جلدی نہ کی جائے تو بہتر ہوگا۔ انگریز سرداروں میں مسٹر کولٹنس (Col John Collins) اور مسٹر کنوالتی بھی اُن لوگوں میں سے تھے جنہوں نے تاخیر کو بہتر خیال کیا لیکن انہوں (آصف الدولہ) نے قبول نہیں کیا۔ اور زیادہ صبر ادا کیا۔ یہاں تک کہ سب کے سب مجبور ہو گئے اور ان کا حکم مان لیا۔“ ۶۶

اس موقع پر نواب آصف الدولہ نے بڑی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔ یعنی میر تقی کو نائب کل مقرر کیا جہاں لان کو جو فیض آباد کے گنا نادوں میں تھا۔ محلوں کا انتظام اس کے سپرد کر کے محمد بشیر خاں کا قائم مقام بنا دیا۔ چند تلنگے جو نواب کی اردلی میں رہتے تھے، انہیں نہ صرف ”راجہ“ کے خطابات دیئے بلکہ بہت سے انعامات سے نوازا۔ حالانکہ وہ اس کے قطعی مستحق نہ تھے نواب وزیر (آصف الدولہ) کی اس ”فیاضی“ کا اثر نواب مرحوم کے نیک خواروں اور یہی خواہوں پر کیا ہوا ہونے لگا۔

”۔۔۔ ان حرکتوں کو دیکھ کر نواب مرحوم کے قدیم ملازمین ناامید ہو کر

اپنے معاملات کی فکر میں بڑ گئے۔ سب سے پہلے محمد ادرج خاں
بادشاہ دہلی سے حصول سند کا بہانہ کر کے باہر چلا گیا۔۔۔

.... (صفحہ ۳۵)

اور تیرگی حکمراں ہو گئی

نواب شجاع الدولہ مرحوم کے مجلسِ ادرج محل کے زلزلہ خیز تحریریں ماحول نے
نواب آصف الدولہ کی شعلہ بدامان جوانی کے کوہِ آتش فشاں کو قبل از وقت ہی
شعلہ بدامان کر دیا تھا۔ تمام الاواجے ابھی ضبط و اعتدال کی گہرائیوں میں محو خواب رہنا
چاہتے تھے۔ اپنی پوری شدت و طاقت کے ساتھ ابل پڑا، چند سالوں تک اپنی دترس
کے نزدیک و دُور کے 'حلقوں' میں تباہی و بربادی پھیلانے کے بعد ایک دن اچانک
خاموش ہو گیا۔ ۶۷

حدِ نظر تک اس کی لائی ہوئی تباہی و بربادی کے عبرتناک مناظر کے علاوہ کچھ نہ تھا۔
طوفانِ تو سر سے گزرتا تھا لیکن فضا اب بھی سببانِ آلودہ اور بو محفل تھی۔

۶۸۔ نواب آصف الدولہ نے اپنے پدر بزرگوار، نواب شجاع الدولہ مرحوم کے نقشِ قدم
پہ چلنے کی پروری میں اٹھارہ انیس سال کی ہی عمر میں جنسی خواہش و طاقت سے باقِ دھو بیٹھے
تھے (۱۔ بیگمات اودھ صفحہ ۳۹) بادشاہِ بیگم اودھ کے مقدمہ نگار نے لکھا ہے کہ یہ بچپن ہی سے بد وضع
خواجہ رازوں کی محبت میں بڑی عادتوں اور بد فعلیوں کے خوکرو ہو چکے تھے (صفحہ ۲۹) نوابِ موب
کے اچانک یا چند دنوں کے اندر جنسی طاقت سے محروم ہو جانے کے متعلق بہت سی روایات
مشہور ہیں لیکن انکا ذکر تفصیل اس جگہ غیر مناسب ہے اور خارج از موضوع ہے۔ مؤلف

طوفان گذر جانے کے بعد

نواب آصف الدولہ کے مجلس (دور محل) میں تقریباً پانچ سو حسین و جمیل عورتیں نیم شکوہ کل لڑکیا جو مختلف ذات و قوم اور فرقوں کی تھیں جمع تھیں۔ ان میں بہت سی عورتیں ایسی تھیں جو مجلس میں داخل ہونے کے وقت حاملہ تھیں۔
مرزا ابوطالب اصفہانی لندنی نے اپنی کتاب تفضیح الغافلین (اردو ترجمہ) میں لکھا ہے کہ :-

”وزیر (نواب آصف الدولہ — مولف) کے ملازم آیری غیری عورتوں کو ان کے وارثوں سے حاصل کر کے محل میں داخل کر لیتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسی ہی حاملہ عورت وزیر کی سواری کے آگے آکر فریاد کرتی ہے کہ فلاں وقت تمہارے ساتھ سوئی تھی۔ میرے ساتھ تم نے وفاداری نہیں کی لیکن اپنے بچہ پر توجہ کرو جو میرے پیٹ میں ہے۔ وزیر تصدیق کر کہ حرم میں داخل کر لیتا

— (صفحات ۱۲۳-۱۲۲)

ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ :-

”رذیل لوگوں کو جو اس کی صحبت میں رہتے ہیں ہمیشہ حرم میں داخل ہونے کی اجازت ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان بچوں کی بدشکلی اور سیاہ رنگ ان کے نسب کی غمازی کرتے ہیں۔“
(صفحہ ۱۲۲)

۶۹ مجلس میں داخل جس عورت کو "خدا کی قدرت کاملہ" سے بچ پیدا ہوتا تھا۔
 نواب موصوف (آصف الدولہ) اُس کی پیدائش پر جشن مناتے اور اپنے زلف سے
 پیدا ہونے والے بچے کے طور پر پرورش کرتے۔ نواب موصوف کے مجلس میں
 "خدا کی قدرت کاملہ" سے پیدا ہونے والے قسم کے بچوں کی "فوج" میں ساٹھ
 قابل ذکر بچوں کا ایک "دستہ" بھی تھا جن میں وزیر علی خاں سب سے بڑے
 "ڑکے" تھے، جو نواب آصف الدولہ کی موت کے بعد ستمبر ۱۷۹۷ء میں بحیثیت
 نواب اودھ مسند نشین ریاست ہوئے۔ لیکن چار ماہ پا پانچ دن بعد ۲۱ جنوری

۶۹۔ نواب آصف الدولہ عنفوان شباب ہی میں اٹھارہ انیس سال کی عمر میں جنسی قوت
 سے محروم ہو کر تولیدی صلاحیت کھو بیٹھے تھے لیکن صاحب اقتدار اور مطلق العنان حکمراں ہونے
 کی وجہ سے خدا کی "قدرت کاملہ" کا بیکراں فضل و کرم شامل حال تھا۔ قدرت کے تولیدی تسلی
 کا سلسلہ منقطع کر دینے کے باوجود "حسب معمول" جاری و ساری تھا۔ مولف۔
 ۷۰۔ یکمات اودھ صفحہ ۲۹۔

۷۱۔ نواب آصف الدولہ ۱۱۸۸ ہجری مطابق ۱۷۷۵ء میں مسند نشین ہوئے تھے
 انہوں نے فیض آباد کے بجائے لکھنؤ کو دار السلطنت بنایا۔ اور تیس سال سا ماہ قری، حکومت
 کرنے کے بعد ۲۸ ربیع الاول ۱۲۱۲ ہجری مطابق ۲۱ ستمبر ۱۷۹۷ء بروز پنجشنبہ کو وفات
 پائی اور لکھنؤ کے امام بارگاہ میں دفن ہوئے۔ (۱۱) تاریخ آصفی صفحہ ۲۵۔

۷۲۔ نوٹ :- نواب آصف الدولہ نواب شجاع الدولہ کے بڑے بیٹے اور سوتیلے والد
 محمد اسحاق خاں غوسٹری کے نواسہ تھے۔ صاحبزادگی ہی میں شاہ عالم بادشاہ دہلی نے میرانشی

۱۷۹۸ء مطابق ۳ شعبان المکرم ۱۲۱۳ ہجری بروز اتوار، گورنر سر جون شور (Sir John Shore) کے حکم سے کپنی سرکار ہندوستان نے برہما صحیح النسب نہ ہونے کے 'انہین معزول کر کے بنارس بھیج دیا۔'

ورداررنگی علی شاہ کا عہدہ عطا کیا تھا۔ ۲۴ ذیقعد ۱۱۸۸ھ (مطابق ۲۶ جنوری ۱۷۷۵ء)۔
 موہن کوکرل جون کونسل برائے اعلیٰ اور سالار جنگ دہلی کے اہتمام سے ذاتی اور مدد مقرر ہوئے۔
 چار شنبہ، ۱۰ صفر ۱۱۸۹ھ (۱۹ اپریل ۱۷۷۵ء)۔ موہن کوکرل عالم بارشاہ کا بھیجا ہوا خلعت
 نیابت پہنا اور ابائی خطاب پایا (تشیع اخبار ۱۷۷۵ء تاریخ اور مدد جلد ۲ صفحہ ۱۰۳، تشریحات
 و نتائج عالم شاہی صفحات ۱۸۹، ۱۹۰)۔

۷۲۔ وزیر علیاں حقیقتاً ایک فرش کے رٹ کے تھے۔ ان کے باپ، فرش، نے اپنی مال دہلی
 کو روپیہ کے عیوض نواب وزیر کے حوالے دیا تھا۔ یہ سارا تہا وزیر علیاں کے ساتھ مخصوص رہا تھا۔
 بلکہ وزیر کی تمام اولادیں اسی طرح کی ہیں تاریخ اصفیٰ درمیان و نتائج ۱۲۰۸ ہجری مطابق ۹۴-۹۳، ۱۷۹۳ء
 کلنڈر آف پرشین کرسپانڈنس جلد دسویں صفحہ ۲۳۲ کے بموجب مرزا وزیر علیاں (نواب وزیر)
 علیاں، ایک فرش کے رٹ کے تھے جنہیں نواب آصف الدولہ نے اپنا منہ بولا بیٹا بنایا تھا۔
 ڈاکٹر عامر آفاق قریشی نے اپنے مقالہ 'نواب وزیر علیاں'۔ لائف اینڈ کیریئر (جس پر مکتوب
 یونیورسٹی سے آپ کو ۱۹۸۲ء میں پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری ملی ہے) میں تحریر فرمایا ہے کہ نواب
 آصف الدولہ کے مہتمی رٹ کے نہیں تھے۔ تحسین علیاں جو نواب آصف الدولہ کے ماتر اور انگریزوں
 کے خاص آدمی تھے، انگریزوں نے انہیں تحسین علیاں کے جھوٹے بیان کا ڈھنڈوا صرف
 لکھنؤ بلکہ سارے ہندوستان میں پٹیا بد قسمتی سے تحسین علیاں کا یہی بدلا ہوا بیان گورنر جنرل
 کنٹ (COMMENT) مورخہ ۱۳ جنوری ۱۷۹۷ء کی زیت بھیج دیا۔

فیض آباد بہو بیگم کے بعد

جیسا کہ اوپر سے متعلق تواریخ کتب سے ثابت ہے کہ جب تک "بہو بیگم" صاحبہ زندہ رہیں، فیض آباد کو اجڑنے نہیں دیا۔ اسکی شان و شوکت اور چہل پھل حسب سابق حتی الامکان برقرار رکھا لیکن جیسے ہی انکی آنکھیں بند ہوئیں، بادِ بوم

ڈاکٹر قریشی نے وزیر علیاں کو نواب آصف الدولہ کا صلیبی بیٹا ثابت کرنے کیسے
میں اجمالی شائبہ پر اتفاق کیا ہے وہ یہ ہے :-

۱۔ آصف الدولہ کے خاص ناظر حسین علیاں نے ان دنوں جبکہ ان کے تعلقات
وزیر علی سے خوشگوار تھے، ایک نجی ملاقات میں تفصیل حسین (دیکھنے ٹٹ ٹوٹ غصہ، اور
ریزیڈنٹ کو بتلایا تھا کہ وزیر علی کی اس رقت حرم سرا میں فراشی اور آصف الدولہ کی منظور نظر
تھی، اس کے عار ہو جانے پر نواب نے اس کے خاندان بیٹے سے بیکوینی حرم سرا میں داخل
کر لیا تھا، اس سے ایک اولاد ہوئی جو چالیس دن کے بعد فوت ہو گئی، اس کے حرم سرا میں رہتے
ہوئے ہی رقت سے وزیر علی کی پیدائش ۱۹ اپریل ۱۹۰۷ء مطابق ۱۲ ربیع الاول ۱۳۲۵ھ بروز
۱۔ سونے، ہوئی۔ (بنگال سیکرٹ کنسلٹیشن مورخہ ۲۴ نومبر ۱۹۰۷ء، نیشنل آرکائیو راولپنڈی
میں محفوظ)۔

۲۔ "الاحوال" منظرہ رمضان المبارک ۱۳۱۹ھ کے بہو بیگم وزیر علی کی پیدائش کے موقع
پر، روبرو سرشار مان کی گئی تھی۔ (بنگال سیکرٹ کنسلٹیشن مورخہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۷ء کے مطابق
ان دنوں خبر بوٹ کھنڈ میں تھی، وزیر علی کی پیدائش کے فوراً بعد نواب آصف الدولہ نے

کے جھکڑوں میں شدت پیدا ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا چمن ویران و سسنان
ایک خام و بابر کے کوٹ کے سامنے، ان کے اپنا صلیبی بیٹے ہونے کا اقرار کیا تھا اور اپنا
جانشین مقرر کیا تھا۔

کچھ دنوں بعد تحسین علی خاں اور وزیر علی خاں میں بھڑا ہو گیا۔ گورنر جنرل سر جان شور
(SIR JOHN SHORE) کے اودھ میں آنے کے بعد اس نے اپنا بیان بدل دیا۔ اور کہا
کہ رحمت کو حرم میں کبھی بھی داخل نہیں کیا گیا۔ نواب صاحب کا اس کے دونوں بار عادی ہونے
سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اور یہ کہ اس کے مندرجہ بالا دونوں راکوں کو انھوں نے روپیہ دے کر
اس سے خرید کر اپنے بیٹے ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔

ہم ڈاکٹر حامد آفاق قریشی کی "تحقیق" پر نقد و تبصرہ کرنا نہیں چاہیے لیکن انھوں نے
جس "اجمال اشارہ" کے ماخذ پر اکتفا کر کے وزیر علی خاں کو نواب آصف احمد دہلوی کا صلیبی بیٹا
ثابت کرنے کیلئے مورخہ ۱۹ اکتوبر، ۱۹۰۹ء کے بنگال سیکرٹ کنسیشن کا جس باتاں تردید
ثبوت کو بنیاد بنا کر حوالہ دیا ہے، اس کی حقیقی حیثیت محض ایک خبر کی سب سے جو مختلف معتبر
اور غیر معتبر رادیوں کے ذریعہ یادداشت کے طور پر قلم بند کی گئی ہے۔ اس حقیقت کی صداقت
کو پہنچ نہیں کیا جاسکتا۔

نواب آصف الدولہ کی مجلس کے اندر اکثر ہی بچوں کی پیدائش پر جشن اور مردہ رسم
شادمانی ہوا کرتی تھی۔ ہر بچے کی پیدائش کا "کرڈٹ" نواب وزیر اپنے سر بیٹے تھے۔ اگر وزیر علی
خاں کی پیدائش پر نواب وزیر نے جشن و رسم شادمانی کیا اور لوگوں کے سامنے انھیں اپنا
صلیبی بیٹا بنا کر "مسب معمول" اپنا "کرڈٹ" مشتہر کیا، تو عہد آصفی کی تاریخ میں کون سا بہت
بڑا اور اہم غیر متوجع واقعہ رونما ہو گیا؟ ایسے واقعات تو مجلس اور دربار میں آئے دن ہی

مکہ ہو گیا۔ نواب آصف الدولہ کے مستقل قیام لکھنؤ سے چوک۔ خوبصورت۔ دل
 داندہ بیگم پورہ۔ انگوری باغ، مغل پورہ، محلہ ظفر الدولہ، نخاس

درغیہ محلے جو جنت نگاہ تھے، اور جو قطعات رشک فردوس کہلانے کے
 زمیں مستحق تھے، وہ ویران اور سسنان نظر آنے لگے۔ وہ حسن و جوانی
 کسی زمار مانہ ان کے گوشہ گوشہ سے کھینچ کر فیض آباد کو رشک فردوس بنانے کیلئے
 جو ہندوستان سے وہ لکھنؤ کو منتقل ہو رہی تھیں۔ وہ فیض آباد جس کے ہر گلی کوچے
 آگنی تھیں، اتنا

ہر بار کے دن اور عوام و خواص ان سے دن بوسے داتے و نجات کے
 ہوتے رہتے تھے۔ انھیں نواب وزیر کی شخصیت سے متعلق کمزوریوں اور کمزورتوں کے
 فرور پر پختے تھے۔ کی صداقت کا مار تھار

احکامات و اشتباہات گروہ ہیں کہ وزیر جو طلب اصحاب کی شخصیت عبدالحی میں باورزن و
 تاریخ کے سے ایک شخصیت تھی۔ وہ تبحر عالم دین، سیر مصنف مورخ اور اصفی
 ابقار شخصیت پر نادر ملک خوار تھے۔ اپنے دلی نعت، نواب آصف الدولہ سے قریب تر
 رہتے۔ متمدن میں سے ہونے کی وجہ سے انکی فصاحت و بھلوت کے حالات اور مجلس کے
 باب واقع ہونے و مکرئی بھی وقت یا عادت اناس سے ہر شیدہ نہیں تھا۔ وزیر علی
 کے حسب و نسب اور استقرار محل سے بعد پیش کش تک کے نام حالات و واقعات بتفصیل
 انکے علم میں تھے۔ انھوں نے وزیر علیمانا کے پاس میں جو کچھ بھی لکھا اس میں انکی بدعتی و
 دشمنی یا بغض و عناد کا کوئی مہرہ جذبہ کار نامہ تھا۔ بلکہ انکی "حق گوئی" خدا و رسول کے
 خوف اور اہمیت، طہار کے اسودہ کی امانت کا وہ عظیم دور مقدس احترامی بندہ تھا جسکی
 اپنے دلی نعت، نواب وزیر کی عقل اور ترقی ضرور تعزیر کے احوال سے ہے پرواہ ہو کر احمق و

سے ساز و عمل کی مسکور کن آوازیں جادو جکایا کرتی تھیں خانہ خوش تھے۔ راک ٹنگ
 کی محفلوں کی دھینکا دستی کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ علما، فضلا، اور شعرا و اطباء سب
 لکھنؤ کو منتقل ہو چکے تھے جو کسی وجہ سے ایک نہ جاسکے تھے وہ اب پرتول رہے۔
 تھے۔ اب نہ علم و فن نگاروں کوئی قدر و ان پاد نہ رہا۔ وہ لوگ من سے فیض آ رہے
 رونق و زینت تھی اور بن پر فیض آباد کو قمر و ناز تھا من کی شخصیتیں نمایاں ایمان باری کی
 وہ تمام لوگ اور ان کے متعلقین نے فیض آباد اور اس کے قرب و اطراف کے براہم تھیں
 لکھنؤ کی طرف کوچ کرنے کا رخ کر لیا تھا۔ نواب آصف لدولہ کے اہل خانہ سے
 بھی فیض آباد اچڑنے اور لکھنؤ بسنے لگا تھا۔
 بندائی دنوں سے

صدائت کے، ملان کو نہ یہ نباتات سمجھ۔

۱۹ اکتوبر ۱۸۵۷ء کی مشکوک خبر کی تحریری یادداشت کو ایک دانش
 شخصیت کے معاصرین بغیر پیمانہ میں لکھے جوت دستاویزی سند کا مرتبہ دیدہ و شہادت سمجھنے والی
 خلاف معیار تحقیق کے منافی تھا۔ اس سے بعد تحقیق اصل حقائق (۱۸۵۷ء) بنادیا تدری کے
 جنوری ۱۸۵۹ء کی گورنر جنرل کنٹ کی ریت بنانا پڑا اور ۱۹ اکتوبر ۱۸۵۷ء کی
 کا عدم قرار دیدیا گیا۔ — مؤلف

۴۳۔ بادشاہ بیگم اودھ صفحہ ۷۸۔

۴۴۔ صاحب احوال و واقعات نے لکھا ہے کہ نواب آصف لدولہ کے فیض آباد چھوٹنے
 میں دیگر اسباب و وجوہات میں سب سے بڑی اور اہم وجہ انکی بیوی شمس النساء (دہن ہو) صاحبہ
 تھیں جن سے آنکھ ملائے اور دُوبول بولنے کی اُن میں جرات نہ تھی۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین مرحوم
 نے لکھا ہے کہ نواب آصف لدولہ اپنی ماں نواب بہو بیگم صاحبہ سے ناراض ہو کر لکھنؤ میں رہنا

مرحوم فیض آباد

ہنر ماضی کے دریچوں سے بتا کر پردے

ایک بھری کی کہانی مجھے یاد دلاتی ہے

یہ اس جنگد بستی کے رونگٹے کھڑے کر دینے والے، وجہ و زوال اور
امتداد زمانہ کے نشیب و فراز کی بھولی بھری حقیقت کی ایک ہندلی سی جھلک
ہے جسے کبھی مشرقی تہذیب و تمدن کے گہوارہ ہونے کا فخر حاصل رہا ہے۔ جسکی شہرہ
آفاق نقاست و نزاکت صدیوں سے اودھ کی چاشنی بنی۔ جس کی شیریں بیانی
گوش انسانی کے لئے شہد و گلاب سے کم نہیں رہی۔ جس کے آباد کرنے والے کی
نسل کے ادیس پانچ حکمران صوبیدار یا نواب اودھ ہونے۔ جن کے ہاتھوں میں
ننانوے سال (۱۷۲۰ء تا ۱۸۱۹ء) تک صوبہ اودھ کی عیال حکومت رہتی۔
اور بعد کے پانچ شہر یاروں کے سر پر ستائیس برس (۱۸۱۹ء تا ۱۸۵۷ء)
تاج شاہی جگہ گاتا رہا۔

شروع کر دیا تھا (صفحہ ۲۵۹) لیکن یہ بالکل بے وزن بات ہے اور حقائق سے بالکل
چشم پوشی ہے۔ — مولف۔

۵۔ میر محمد امین نیشاپوری سعادت خاں بہار (الملک) (مرف)۔

۶۔ ۱۱۔ میر محمد امین نیشاپوری سعادت خاں بہار (الملک) (۲)۔ منصور علی خاں

مسعود جنگ (۳)۔ مرزا جلال الدین حیدر شجاع اللہ (۴)۔ مرزا علی خاں نواب آصف اللہ

(۵)۔ نواب سعادت علی خاں۔

زمانہ کے بیدار دہاتوں نے فلک کج رفتار کے اشارے پر، اس کو اس طرح
تباہ و برباد کیا کہ اب نہ اس کی شان و شوکت کا نشان ملتا ہے اور نہ مشرقی تہذیب
و تمدن کی وہ جھلک حیرت مند و مستان کو فخر دنا رہتا

یہ شہ تو وہی ہے پہ وہ لوگ کیا ہوئے
لہجوں کی اک کھنک تھی جو ہر سوراں، کہاں گئی؟
لفظوں کا رکھ رکھاؤ، وہ جملوں کا باجین
چین چین و جنبش ابرو کہاں گئی؟
شمع جمال دوست سے خالی ہے انہماک
برقی نگاہ و نگہیت کیسے کہاں گئی؟

دل ڈھونڈتا ہے اب وہ نگاہیں وہ صویریں

یوسف بہارِ شام لب جو کہاں گئی

آہ — اب وہ فیض آباد کہاں؟ وہ دن گیا، وہ رات گئی، وہ لوگ
گئے، وہ بات گئی۔ آج قدیم فیض آباد کا آٹھوا حصہ بھی باقی نہیں رہا۔ جو کچھ
بچ رہا تھا وہ جدید آبادی میں گھل مل گیا ہے۔ آج فیض آباد کی آبادی کا ایک
بڑا حصہ 'مرحوم فیض آباد' کی تہذیب و تمدن، اندازِ گفتگو و طرزِ معاشرت پر

،، - (۱) شاہ زمن غازی الدین حیدر بادشاہ (۲) نصیر الدین حیدر بادشاہ

(۳) محمد علی شاہ بادشاہ (۴) محمد علی شاہ بادشاہ (۵) جان عالم و حدیثی سنہ

خندہ زبان ہے۔ آج ان مذاق اڑانے والوں کے لئے نزاکت و نفاست میں امتیاز آسان نہیں۔ یہ شرافت کو نزاکت کہہ کر مشرقی تہذیب و تمدن کے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہیں۔

معذرت

مشغلیں غزم کی میں لاکھ جلائے رکھوں

سیر باتھوں میں بقدر کا ستارہ تو نہیں

ہم معذرت خواہ ہیں کہ ہماری دلی کیفیات نے ہمارے قلم کو براہ راست موضوع سے قدرے ہٹا دیا۔ ہم شہر اودھ (اجودھیا) کی مذہبی اہمیت اور تقدس کی بات کرتے ہوئے "بنگلہ بستی" کے ذکر تک آگئے۔ اس بستی (فیض آباد) کے گلی کوچوں میں اڑتے ہوئے گرد و غبار کا جھونکا کسی نہ کسی داستان کا امین ہے اس بستی کے کھنڈرات کتنے تلامذہ خیر قبہوں کے مدفن ہیں؟ ان میں اگی ہوئی خود بخاردار جھاڑیوں پر مسلط سکوت میں کتنی ناگفتہ بہ داستانیں محو تکلم ہیں؟

گزرے ہوئے زمانے کا اب تذکرہ ہی کیا؟

اچھا گزر گیا۔ بہت اچھا گزر گیا

یہ تو ام شہر ہے۔

کچھ ہبہ بردہ نہیں حالات زمانہ کا نیم

آج ایسے ہی تو کل دیکھنے کیا ہوتے ہیں

امرو دھیادہ فیض آباد توام شہر (Tahsil) میں ان دونوں شہروں کا ایک
 دوکے سے اتنا نازک رشتہ اور تعلق ہے کہ اگر ایک شہر کی حیثیت کو کسی بھی پہلو سے
 نظر انداز کر دیا جائے تو دوسرے شہر کی حیثیت ایک بیوہ کی جوانی کی
 طرح قابلِ رسم ہے۔ جانی ہے۔ ان شہروں کا ہر ذہ قابلِ تعظیم و تکریم
 ہے۔ اس سرزمین پر جنھوں نے شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ عدل و انصاف کے
 تقاضوں کو یوراکر کے حکومت کیا، علوم و فنون کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کیا
 ایک ملی جلی مندوستانی تہذیب و تمدن کی داغ بیل ڈال کر اسے پروان چڑھایا
 انکی تعمیرات کے آثار و باقیات، ان کے ذوق سلیم کے گواہ ہیں اور
 انکی تہذیب کی ترقی کے آئینہ ہیں جن سے ان کے کردار کی بلندی و پستی،
 انکے معاشرہ کے عروت و زرداں ان کی شاہانہ شان و شوکت، رعب و جلال
 اور عیش و عشرت کی فراوانیوں کا عکس بھی دیکھا جاسکتا ہے اور انحطاط و زوال
 کے روح فرس مناظر کے عبرت آموز خدو خال بھی۔

وہ کی ظلمت یہ ہے ان آقا بزرگی چمک

جسکے درباروں پہ رہتا تھا جس کی گتہ رنگ

شہر فیض آباد کے اندر کتنے بزرگانِ دین، اولیاء اللہ، علماء و فضلاء اور فقیر
 و شہداء پر پوند زمین ہیں؟ انکی کوئی تفصیل دستاویزی شکل میں دستیاب نہیں
 اور نہ مستند روایات سے ہی ہمیں کوئی رہنمائی حاصل ہو سکی۔ لیکن ذہن اس بات کو
 قبول کرنے کے لئے قطعی تیار نہیں ہے کہ فیض آباد میں خصوصاً نواب شجاع الدولہ کے
 دور اقتدار اور اسکے بعد کے زمانوں میں فیض آباد کے بگڑے ہوئے معصیت خیز معاشرہ

کی اصلاح اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت امر و نہی سے روشناس کرانے اور گمراہ
لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرانے اور انھیں اللہ اور اس کے رسول برحق صلی
اللہ علیہ وسلم کے واضح احکامات کی تعلیم دینے نیز گناہ و ضلالت کے دلدل سے
بچانے کے لئے اللہ کے نیک اور برگزیدہ بندے یہاں نہ آئے ہوں!
فی الوقت شہر فیض آباد میں جن بزرگوں کے فیوض و برکات سے لوگ
مستفیض ہوتے ہیں اور عوام و خواص میں جن کا زیادہ چرچا ہے، ہم ان کے ذکر کے
ساتھ کچھ ایسے آثار و واقعات کا بھی ذکر کرنا چاہتے ہیں جن کے آشنا و داندہ
صرف چند ہی لوگ باقی رہ گئے ہیں ان کے مرنے کے بعد یہ حقائق ان کے ساتھ ہی
ان کی قبروں میں دفن ہو جائیں گے۔

شہر فیض آباد کے جن محلوں یا علاقے میں صاحبِ تصرف بزرگوں کی
قبریں ہیں اور لوگ جن سے فیوض و برکات حاصل کرتے ہیں ہم نے ان کا ذکر اس کتاب
کے آخر میں شہر فیض آباد کی بزرگ شخصیتیں کے عنوان سے علیحدہ کیا ہے۔

یہ فیض آباد ہے

دنیا نے کب کسی کو کیا یاد عمر بھر جو بات ہو گئی وہ خبر ہو کے رہ گئی
اب ہم فیض آباد شہر کے موجودہ گھنٹہ گھر کے سامنے آئے ہیں۔ گھنٹہ

۔۔۔ زیادہ تر سیدہ بسینہ پل نے مالی روایات ہی آپ سرایہ میں انھیں کے سہارے
پر حالات اور متعلقہ واقعات آئندہ صفحات پر ترتیب دیئے گئے ہیں اور جو در فیض آباد گزیر
سے لاسکی ہے اسی کو دست بویز کا منیت دی گئی ہے۔

گھر کے سامنے سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں مرحوم کی تعمیر کی ہوئی پر شکوہ مسجد نظر آئے گی۔ اس مسجد کی تعمیر ۱۱۸۷ھ مطابق ۱۷۷۲ء میں شروع ہوئی اور تین سال بعد ۱۱۹۰ھ مطابق ۱۷۷۵ء ہجری میں مکمل ہوئی۔

نواب حسن رضا خاں شخصیت و تعلق

سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں مرحوم بانی سلطنت نوابین اور دھرم پور سادات خاں برہان الملک کے خسر نواب، کلب تل خاں کی بہن کے بڑے بھائی، ان کے چچا کا نام محمد ابراہیم خاں تھا جو شاہی منصب دار تھے اور لکھنؤ کی کوتوالی اور حرم سرا کی حفاظت اور برہان الملک و نواب ابوالمنصور صفدر جنگ کے خزانوں کی نگہداشت کی خدمت انھیں کے سپرد تھی۔ محمد ابراہیم خاں لکھنؤ کے نیک نام اور معزز لوگوں میں سے تھے۔

نواب حسن رضا خاں سرفراز الدولہ زیادہ پڑھے لکھے آدمی نہ تھے۔ ملکی معاملہ شناسی اور سیاسی داؤں بیج انھیں نہیں آتا تھا۔ البتہ فن سپہ گری اور اس کے ہنر اچھی طرح جانتے تھے۔ سپاہیوں کے گروہ میں وہ اپنی رائے کی متانت اور وقار رکھتے تھے۔ ان کی بیوقوفی اور فضول خرچی کی بدنامی کی جو داستانیں لوگوں میں مشہور ہیں اس کی اصل وجہ ان کا "سیدھا پن" اور "مذہبیت" ہے۔

۷۹۔ تاریخ آصفی صفحہ ۲۹

۸۰۔ ایضاً صفحہ ۳۰

۸۱۔ تاریخ آصفی صفحہ ۳۰

مرزا ابوطالب اصفہانی نے تفضیح الغافلین میں سرفراز الدولہ نواب حسن خاں خاں کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے کبھی اپنے ماموں نواب کلب علی خاں اور چچا محمد ابراہیم خاں کی عزیزداری پر گھمبند نہیں کیا اور نہ کبھی پیش نظر رکھا۔ یہ ہمیشہ ایک دربان کی طرح نواب شجاع الدولہ کی خدمت میں رہتے تھے۔ اپنی بے لوث

۸۲۔ مرزا ابوطالب اصفہانی ۱۷۵۲ء مطابق ۱۱۷۷ ہجری میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے وہ بیک وقت ایک تاجر و سیاح، تاریخ داں، منتظم اور جید عالم تھے۔ ان کا اصفہان کے ایک باعزت ترک خاندان سے تعلق تھا۔ نادر شاہ کے حملوں سے تنگ آکر ان کے والد حاجی محمد بیک خاں اصفہانی ہندوستان چلے آئے تھے اور نواب صفدر جنگ کی ملازمت اختیار کی۔ چودہ سال کی عمر میں ان کی شادی مرشد آباد میں نواب محمد رضا خاں کی ایک عزیزہ سے ہوئی۔ ۱۷۹۹ء میں جب کہ پٹن ڈیوڈ تھامس (David Thomas Richardson) کے ساتھ جب وہ اپنی چھٹیاں گزارنے لندن جا رہے تھے، انہیں کیسا تھ مرزا ابوطالب لندن گئے اور تقریباً ایک سال لندن میں رہے (۱۸ مارچ ۱۷۹۹ء مطابق ۱۲۱۳ ہجری بروز پنجشنبہ ۲۳ مئی ۱۸۰۰ء مطابق ۵ محرم ۱۲۱۵ ہجری یوم پنجشنبہ تک پتوڈسن نے انگلستان میں اپنی چھٹیاں گزاریں) ۱۸۰۷ء مطابق ۱۲۲۱ ہجری میں مٹوٹھ (ضلع بانڈہ - بندیلکھنڈ) میں تفصیلاً مقرر ہوئے۔ اسی سال تھوڈس ہی عرصہ بعد چوں سال کی عمر میں انتقال کیا اور

دیں مدفون ہوئے۔ By V.C.P. ۱۵ Hodson.
(۲) تاریخ آصفی صفحہ ۱۲

خدمات سے نواب مرحوم کے دل میں بڑی جگہ اور نگاہوں میں بڑی قدر و منزلت حاصل کر لی تھی اور ان کے (نواب شجاع الدولہ، مقربینا میں سے تھے۔ نواب مرحوم ان کے ساتھ بڑی خصوصیت رکھتے تھے۔ انکی حیثیت گویا نواب مرحوم کی زبان تھی اکثر احکامات انھیں کے ذریعہ لوگوں تک پہنچتے تھے۔

سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں، مرحوم نواب آصف الدولہ کے گہرے دوستوں میں سے تھے اور ایدج خاں کے بعد ہی نواب آصف الدولہ کی خلوت و جلوت میں رہتے تھے۔ پادشاہ میں انھیں نواب آصف الدولہ نے بہت سے اختیارات دیکر اپنا نائب بنالیا تھا۔

مسٹر جون بریسٹو ریڈنٹ کا مشورہ

مسٹر جون بریسٹو (John Bristow) کے درمیان بات چیت کا

۸۲۔ مقدمہ تاریخ آصفی صفحہ ۱۹

۸۳۔ مقدمہ آب پر نیں کر سپانڈنس جلد ہفتم صفحہ ۴ (۱۲) تاریخ آصفی صفحہ ۱۱

۸۵۔ مسٹر جون بریسٹو (John Bristow) کوڈٹ آن ڈائریکٹرز کے حکم سے

۱۸۷۳ء میں مسٹر میتھیاں ٹڈن (Mathew Middleton) کی جگہ پر لکھنؤ میں ریڈنٹ

تقرر کیا گیا۔ چونکہ لارڈ دارن سٹنگز (Warren Hastings) اس سے خوش نہیں تھا اس لئے

۱۸۸۱ء میں اسے معزول کر کے پھر مسٹر ٹڈن کا تقرر ہوا لیکن ۱۸۸۲ء میں اس کا دوبارہ تقرر

ہوا تھا۔ ۳۱ دسمبر ۱۸۸۳ء مطابق ۶ صفر ۱۲۹۸ ہجری (یوم چہار شنبہ) کو اسے کلکتہ بلا لیا

کافر یہ نواب حسن رضا خاں ہوئے تھے۔ چونکہ نواب حسن رضا خاں سیدھے سادے آدمی تھے۔ انہیں ملکی معاملہ شناسی اور سیاسی داؤ بیچ نہیں آتا تھا اس لئے ۱۱۹۰ مطابق ۱۱۹۰ ہجری میں مشر جون برسٹون نے نواب آصف الدولہ کو مشورہ دیا کہ سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں کے ملکی اور سیاسی معاملات میں رہنمائی کرنے کے لئے ایک آدمی جو سیاست اور ملکی معاملہ شناسی میں تجربہ کار ہو ان کے نواب حسن رضا خاں کے ساتھ کر دیا جائے چنانچہ اسماعیل بیگ شوری، جو ایران کے معمولی لوگوں میں سے تھا اور بددیانتی و اپنے آقا کی بدخواہی کے لئے اس وقت مشہور تھا، اپنے ذاتی مفاد کے حصول کے لئے اس نے مشر برسٹون کو کچھ سبز باغ دکھا کر حیدر بیگ خاں کی سفارش کیا۔ نائب کل کی خلعت حسن رضا خاں کو دلوائی اور نائب الملک کا عہدہ حیدر بیگ خاں کو عطا ہوا اور ٹکٹ رائے کو حسن رضا خاں کی طرف سے پیش کار اور حساب کتاب کا نگران مقرر کیا گیا۔ یہ شخص اپنے مقابلہ میں حیدر بیگ خاں کو حق و ذلیل سمجھتا تھا۔ اس کی وجہ سے دیوانی کا کام چوٹ ہو گیا۔

اگر سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں میں کچھ بھی سیاسی سوجھ بوجھ اور معاملہ فہمی ہوتی تو ان کا تسلط ملک اودھ میں پھیل جاتا لیکن دور اندیشی اور معاملات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے وہ ہمیشہ الگ تھلک رہے اور ٹکٹ رائے کو

گیا کیونکہ لارڈ دارن ہیملنگ کی کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ خود اودھ کا انتظام کرے۔ (تفصیل انگریزی میں)

رد و صفحہ ۱۳۸

ہمیشہ آگے رکھا۔ اس نے عاقبت زندگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود نواب نواب حسن رضا خاں
 ہی اس انکلیٹ رائے کے دست نگر ہو کر رہ گئے۔ اور اس نے اپنی تنگ نظری و
 کمینگی کی وجہ سے سرفراز الدولہ کی خدمت میں کوتاہی شروع کر دی اور ان دونوں میں
 جھگڑا لڑائی شروع ہو گئی۔

جمعہ و جماعت فیض آباد میں

نواب حسن رضا خاں نے اپنے دور اقتدار میں اپنی رہائش گاہ کے قریب ہی
 موجودہ گھنٹا گھر کے پاس ایک عالی شان اور پر شکوہ مسجد تعمیر کرایا جو آج بھی نو بھائی
 کی گزری ہوئی شان و شوکت اور ان کے مذہبی انکسار اور انیسیت کی یاد دلا رہی ہے
 یہی وسط ہند کی وہ دوسری مسجد ہے جس میں سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں قریب
 نے فیض آباد میں شیعوں کا جمعہ و جماعت قائم کیا تھا۔ شیعوں کی پہلی مذہب و جماعت کے

۱۱۔ ٹیکٹس کے بیچ خانہ کے ایک مولیٰ کسان کا بے ریاست لڑکا تھا۔ خوش و خوش و خوش و خوش کی شہرت
 کو بہت پسند کرتا تھا (تاریخ آصفی صفحہ ۱۲۸)۔ نواب شجاع الدولہ کے زمانہ میں ان کے جواہر خاں کے
 تویلاڑ خواجہ سرافخشاں نفا خاں کے پاس بندہ رہا۔ وہ یہ مانوا رہا کہ لازم تھا اور خیانت کے جرم میں
 نواب مرحوم کے پورے عہد میں قید رہا۔ انکی وفات کے بعد آزاد ہوا۔

Calendar of Persian Correspondence Vol. VII Pg 147 (11)

۱۲۔ فتیلت تاریخ آصفی صفحہ ۵۳

۱۱۔ موجودہ "توپ وال کوٹھی"۔

۱۲۔ عماد السعادت میں نواب حسن رضا خاں کے متعلق تحریر ہے: "انقصہ حسن رضا خاں"

متعلق نثریہ انتواطر کے مولف، سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ مولانا حکیم عبدالحسین
مرحوم نے لکھا ہے:

”شاہ علی اکبر چشتی مودودی اور ملا محمد علی فیض آبادی
کی تحریک سے نواب حسن رضا خاں نے جمعہ و جماعت قائم کر کے
سب سے پہلے مولوی سید ولددار علی نصیر آبادی کی اقتدار میں
۱۲ رجب ۱۲۰۰ ہجری کو نماز ادا کی۔ یہ پہلا دن ہے کہ وسط ہند
میں شیعوں نے اپنا جمعہ و جماعت علیحدہ کر لیا۔“

(کھن رعنا صفحہ ۱۵۲، ۱۵۳)

بہادر سیر و شکار در رکاب جناب عالی صوم و سلوۃ با بیچ چیز سر و کار تداشت و بانی جماعت
در اثنا عشریاں د لکھنؤ بودہ است۔ در بیچ شہرے از شہر ہائے ہندوستان
نماز جمعہ و جماعت در مذہب امامیہ رائج نبود بلکہ کسے را گاہا اینہم نبود کہ در ایران و بلاد ہ
نماز جماعت در اثنا عشریاں گذار دہ می شود۔ (صفحہ ۱۲)

۹۰۔ مولوی سید ولددار علی نصیر آبادی کا آبائی مذہب سنت و الجماعت تھا۔
(مقدمہ وقائع ولیدیر صفحہ ۱۰۲)۔ انہوں نے ابتداء کتب درسیہ فرنگی محل میں پڑھا
پھر عراق جا کر علمائے کربلا و نجف کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ اور واپس آ کر خود فرنگی محل
والوں کی تصدیق و تقریب سے مجتہد اور شیعہ فرمانروایان وقت کے مقتدا قرار پائے۔
(گزشتہ لکھنؤ صفحہ ۱۲)

مولوی سید ولددار علی ہی لکھنؤ کے پہلے شیعہ مجتہد ہیں۔ کتاب تذکرۃ العلماء شیعہ
کے مولف سید مہدی بن سید نجف رضوی نے بھی مولوی سید ولددار علی کو پہلا

شام اودھ مرحوم فیض آباد کی

نواب شجاع الدولہ کے زمانہ اقتدار کے تیسرے دور سے لیکر نواب آصف الدولہ کے زمانہ اقتدار کے ابتدائی دنوں تک مسجد کا یہی علاقہ "مرکز شام اودھ" رہا۔ شہر کے شرفاء تیسرے پہر سے روزانہ اس جگہ جمع ہوتے۔ پیروں میں سیاہ پتھر بٹاتے، شوخ رنگ کے ریشمی موزے، بنوڑی دار گرنٹ اور مشروع کے پاجامے جن میں جھاردار شوخ رنگ کے ریشمی کمر بند، جو کرتے کے دامن سے قدرے

"ہندوستانی مجتہد" بتایا ہے۔ متذکرہ کتاب میں مرقوم ہے کہ — "آغخاب اول کے بعد اندک وہ علماء ہندوستان برترتہ اجتہاد رسیدہ بنائے اقامت نماز جمعہ جماعت بطریقہ حق امامیہ دریں دیار گزاشتہ اند۔"

مولوی سید محمد محمد حسینی موف توفیح السعادت نے مولوی سید دلدار علی نصیر آبادی کے متعلق لکھا ہے کہ: — "ارسل جعفر کذاب، در قصبہ نصیر آباد و در قصبہ جالس اکثرے حتی و تمام موجود اند۔..... مولوی دلدار علی کہ از قدیم الایام آبائی مذہب المسنت و جماعت داشتند و در حکومت نواب آصف الدولہ بہادر ولیعہد نیابت مرزا حسن رضا

خان باوجود کم علمی اولاد پیش امام مرزا حسن رضا خاں شدند و بعد چندے دعویٰ اجتہاد نمودہ مجتہد مذہب امامیہ شدند۔ بعد فوتش بخطاب مجتہد العصر، غفران مآب ملقب شدند و پسران مولوی دلدار علی، سید مولوی محمد و مولوی میرن مامردمان معتقدین مجتہد العصر و الزماں میگویند و بالفعل خود را 'نائب مہدی آخر الزماں' قرار دادہ اند۔"

نیچے ٹپکتے ہوئے، جامدانی یا چکن کے نفیس انگرکھے جن سے کرتے کی بلیں جھانکتی
ہوئی، کندھوں پر معطر رومال جن سے فن کی نزاکت و نفاست کا کمال نمایاں، سر پر

رسالہ "اجازہ" میں مولوی سید درہ علی نصیر آبادی نے اپنے فرزند اکبر مولوی سید محمد
کے لئے لکھا تھا اپنے لکھنؤ میں مقیم ہونے کے تمام حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ—
جب میرے ولی نعمت مرزا حسن رضا خان نے لکھنؤ میں نماز جمعہ و جماعت بر طبق مذہب
الطبیعت علیہم السلام قائم کرنے کا پختہ ارادہ کر کے مجھ سے بانہ دار اقامت نماز کے لئے کہا
اگرچہ بسبب حق نعمت گنجائش انکار نہ تھی مگر دوجہ سے چاہتا تھا کہ مجھ کو معاف رکھیں
ایک تو یہ کہ یہ منصب بزرگ اور جلیل القدر ہے اور میرا مرتبہ علما و کلام حقہ میں قاصر
و کمتر ہے۔ دوسرے یہ کہ بسبب تسلط اہل خلاف و شوکت اہل طغیان و اعتساف ان
مشہروں میں امامیہ کی نماز جمعہ و جماعت گزشتہ زمانہ میں نہیں ہوتی تھی۔ لہذا نئی
بات سے لوگوں میں استعجاب و استغراب کا اور بعض مخالفین بدکردار کی جانب سے
غلل اندازی کا احتمال تھا۔ مگر یہ جان کر کہ رئیس مملکت (آصف الدولہ) چونکہ ترویج دین
مہین میں نیت صادق رکھتے ہیں اور مذہب ائمہ معصومین کو برتری و فوقیت دینے میں
ہمت ان کی مصروف ہے، اس لئے میں نے بھی ہمت کا دامن مضبوط تھا لیا اور حق
تعالیٰ کی استعانت سے اقامت جمعہ و جماعت کا آغاز ۱۳ رجب المرجب ۱۲۰۰ ہجری (مطابق
۱۳ مئی ۱۸۸۶ء بروز جمعہ) کو کیا روز میلاد حضرت امیر المومنین ہے اور دولت خانہ
نعمت مرزا حسن رضا خان میں بصحابت آنحضرت خورشید منزلت جناب نواب وزیر الملک
آصف الدولہ بہادر جماعت مومنین کے ساتھ ظہر و عصر ادا کی اداسی پہینے کی ۲۷

چکن کی دو پٹی ٹوپیاں، جن سے ہیں بوٹے کاڑھنے والیوں کی نرم و نازک انگلیوں کا اندازہ ہوتا تھا۔

ایک طرف ادب سے کمرے بونے مایوں کی قطاریں، جنکی خوبصورت چھڑیوں میں بیلے اور موتیا کے مہکتے ہوئے گھرے، مجمع میں سقوں کی جھاگ دوڑ، چاندی کے پٹکے ہوئے پیالوں میں ٹھنڈے پانی کی پیشکش، خالی پیالوں کی ایسی مدھسہ جھنکار کہ شوقِ تشنگی بیدار ہو جائے۔ یہیں حقہ پلانے والوں کا بھی ہجوم ہوتا تھا۔ شانوں پر سرخ رومال، پیتل کی چمکتی ہوئی سنہری چلموں پر چاندی کے منقش سروپش چلم میں زعفرانی، عنبری یا مشکی خمیرہ تیا کو نیچے پر دسیوں بیلے اور موتیا کی لڑیاں چاندی کی مہناں ہر ایک کے سامنے ادب سے پیش کرتے۔ پینے نہ پینے والے سب ہی پیسے دو پیسے سے مرانات کرتے۔

غائب منظر ہوتا تھا۔ جدھر نظر اٹھتی تھی کچھ نوابین، کچھ خاندان و زارات کے متعلقین، کچھ سلطنتِ دہلی کے معززین، کچھ پروردہ، کچھ کوکا، کچھ بانکے، کچھ تیرھے کچھ رنگیلے، کچھ چھبیلے۔ سب ہی اس مجمع میں گھومتے چہرتے نظر آتے تھے۔ نوابین و معززین سلطنتِ دہلی کے ہاتھوں میں چاندی کی شاد مار چھڑی۔ خاندان و زارات کے ہاتھوں میں موتیا یا بیلے کے مہکتے ہوئے گھرے، پروردوں کے ہاتھوں میں

یعنی ۲۷ مئی ۱۷۸۷ء بروز جمعہ) کو کہ روزِ مبعثِ حضرت سید المرسلین ہے جمعہ کی سعادت حاصل کی۔

— (ملخصاً)

(۱) از بادشاہ بیگم اودھ صفحات ۱۰۳ و ۱۰۴

بٹیریں جنس پر سرخ رومال پڑا ہوا، بالکوں کے ہاتھ میں قمچیاں، ترچھوں کی ہاتھوں میں ٹرڈیو پو پو کرتے تھے۔

یہ دنیا ہے۔ یہاں کسی چیز کو قرار و استحکام نہیں۔ تغیر و تبدل کا عمل ساری کائنات پر مسلط ہے۔ یہی تو نظام قدرت ہے۔ زمانہ بدلا، لوگ بدلے، تہذیب و تمدن بدلا، ممولات و مشاغل بدلے۔ گردش زمانہ کے نشیب و فراز نے اذکار و آلاک ڈیرے ڈال دیے۔ اب نہ کہیں پالیوں کے تذکرے ہیں نہ شاہن کا ذکر، نہ مرغ بازوں کی گفتگو، نہ کہیں گنگوؤں کے میدان کا کوئی قصہ سناتا ہے۔ اودھ کا دار الخلافہ اب بھی موجود ہے لیکن اودھ کی وہ شیریں بیانی، وہ شرافت کے منظر برے، انقباض و آداب کا وہ باموقع اور بر محل استعمال اب کہاں؟ وہ دل موہ لینے والا مہذب انداز گفتگو، وہ نشست و برخاست کے آداب اب کہاں وہ مشرقی تہذیب جس پر بھی ہندوستان کو فخر و ناز تھا، فیض آباد میں اب کہاں تلاش کیا جائے؟ انیس و حکیمت کا فیض آباد کہاں ہے؟ کیا ہندو کیا مسلمان سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ سب کا ایک ہی معاشرہ تھا۔ ہاں اگر کہیں کوئی فرق نظر آتا تھا تو وہ دھوئی اور پاجامہ کا تھا۔

اگلے وقتوں کے یہ لوگ

اب اس سجد میں ایک پبلک بریری اور چھوٹا دارالطالعہ ہے جو عموماً وقت کی پابندی کے ساتھ، علاوہ تعطیلات کے دنوں کے کھلا رہتا ہے۔ شام کے وقت اکثر جب "اگلے وقتوں" کے لوگ دارالطالعہ میں اکٹھا ہوتے ہیں تو وقت گزاری

کے لئے انہیں جیسی بے سرو پایا خواب و خیال کی دنیا کی باتیں کرتے ہوئے دیکھ جاسکتے ہیں۔ یہ کتب خانہ سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں مرحوم کے نام سے منسوب ہے۔ اس مسجد کا سن تعمیر ۱۷۹۰ء ہے۔ اسکی تعمیر میں تین سال زاید کا عرصہ لگا تھا۔ اس مسجد میں روزانہ ایک مجتہد بطریق مذہب امامیہ نماز باجماعت پڑھاتے ہیں۔ اب جامع مسجد حسن رضا خاں سے اترے اور گھنٹہ گھر سے پورب کی طرف جانے والی سڑک پر چلے۔ تقریباً تھوڑے پورب کی طرف چلنے کے بعد راستے ہاتھ پر کوٹہ پارچہ گلی کا دوسرا پھاٹک ملے گا۔ اس پھاٹک کے ارد گرد اب کتب خانوں اور اسٹیشنری والوں کی دوکانیں ہیں۔ پھاٹک کے اندر چند میٹر آگے دھن کی جانب چلنے کے بعد فیض آباد کی مشہور مسجد ”مسجد طاٹ شاہ“ کا پھاٹک ملے گا۔ جس کے دونوں طرف اب جوتے بیچنے والوں اور جوتا دھوٹ کیس بنانے کے سامان بیچنے والوں کی دوکانیں ہیں۔

مسجد طاٹ شاہ اور طاٹ شاہ

پھاٹک کے سامنے ہی اسے مسجد کی عظیم الشان عمارت اور اس کا وسیع صحن نظر آتا ہے۔ اس مسجد کی حالیہ جدید تعمیر ۱۹۳۸ء میں مسلمانان فیض آباد نے کی ہے۔^{۹۱} مسجد کی جدید تعمیر کے خاص محرک مولانا شاہ عبدالعلی صاحب تھے۔^{۹۲} مسجد کے اندر باہر کے نقش و نگار، آیات قرآنیہ

۹۱۔ قدیم مسجد طاٹ شاہ کو مسلمانان فیض آباد نے ۱۹۳۶ء میں شہید کیا اور ۱۹۳۸ء

میں اس کی جدید تعمیر مکمل ہوئی۔ — مولف۔

۹۲۔ مولانا شاہ عبدالعلی صاحب مرحوم گورنمنٹ کالج فیض آباد میں عربی کے لکچرر تھے

کے طغریٰ اور رنگ کاری اس قدر خوبصورت اور دلکش ہے کہ دیکھنے والا مبہوت رہ جاتا ہے

موجودہ مسجد ٹاٹ شاہ، زمانہ ماضیہ میں ایک اوسط لمبائی چوڑائی کی مسجد تھی اس کی چھت بھی نیچی تھی۔^{۹۲} زمانہ ماضیہ میں اس مسجد سے ملحق ایک کشادہ حجرہ بھی تھا اسی حجرہ میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد کے ابتدائی ایام میں جب خاندان مغلیہ پیر تباہی و بربادی کے بادل چھائے اور افراد خاندان حفظ جان و ناموس کے لئے دلی چھوڑ کر جدھر سے اٹھا چل پڑے اسی زمانہ میں خاندان مغلیہ کے ایک شہزادے نے گونیا کی بے ثباتی و بے مروتی اور اس کے عیش و آرام کی بے بضاعتی کو دیکھ کر اس درجہ شدید تاثر لیا کہ لذت دنیا سے منہ موڑ کر، فقیری اختیار کر کے، تبارک الدنیا ہو گیا اور اسی فقیرانہ حلیہ میں فیض آباد آکر اسی حجرہ میں قیام فرمایا۔

اور دلا نا شاہ عبداللطیف صاحب کے مخصوص بے تکلف معتقدین میں سے تھے۔ مسجد ٹاٹ شاہ کی تعمیر جدید کا سہرا آپ ہی کے سر ہے۔ آپ بارہ بجے صلیح کے رہنے والے تھے اور بربادی مشرب رکھنے کے باوجود نہایت معتد المزاج تھے۔ ساری زندگی فیض آباد میں گذاری بڑی بواضا کے قبرستان مدفون ہوئے۔ — مولف۔

۹۳۔ اکثر ضعیف العمر لوگ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ زمانہ ماضیہ میں اس مسجد کی ضروریات کی کفالت کے لئے مسجد سے متصل ہی کچھ آرامی شاہان تھے۔
نے عطا کرتی۔ واللہ اعلم بالصواب۔ — مولف۔

فقیر شہزادہ کے کرمانا اخلاق، مغنیہ وسیع المشی، بہمدی و نگاری نے
چندی دنوں میں اس درویش کی شہرت کو دور دور تک پھیلا دیا۔ درویش کو دنیا کے
جھمیلوں اور لذت دنیا سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس زمانہ کے دستور کے مطابق اگر
کسی نے کچھ تحفہ دیدیا تو بصد شکر یہ لے لیا۔ ورنہ عبادت و ریاضت اس کا محبوب
مشغلہ تھا۔ اس میں مشغول رہتا۔ کبھی کسی کے سامنے دست سوال دروازہ نہیں کیا
قتاعت و توکل کا پیکر تھا۔ سرپوشی کے لئے موبے اور کھدرے کپڑے پہنتا تھا
جس کی مناسبت سے لوگ اسے ٹاٹ شاہ کہنے لگے تھے۔ کچھ دنوں بعد زمانہ ماضیہ
کی یہ مسجد اسی درویش کے نام سے منسوب ہو گئی۔

سن ۱۲۰۲ھ (مطابق ۱۸۱۸ء) کے درمیان ٹاٹ شاہ کا انتقال ہوا اور اسی حجرہ
کے باہر دفن کئے گئے۔ انتقال کے بعد جو چیزیں ٹاٹ شاہ کے حجرہ سے برآمد
ہوئی تھیں ان میں کچھ بوسیدہ اور کرم خوردہ کاغذات کے ساتھ سرخ عقیق کی
ایک تعویذ بھی تھی جس میں آپ کا سلسلہ نسب بہادر شاہ ظفر تک کندہ تھا۔
تعویذ میں کندہ عبارات کے مطابق آپکا بہادر شاہ ظفر کا پڑپوتا ہونا ثابت تھا
کچھ دنوں تک یہ تعویذ محلہ مقبرہ کے کسی شکوہ شخص کے پاس تھا۔ ۱۹۰۳ء
تک اس تعویذ کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے لیکن اس کے بعد یہ تعویذ کن لوگوں کو
ہاتھ لگا اور کیا ہوا؟ کچھ پتہ نہیں چلتا۔

زمانہ دراز سے لوگ ٹاٹ شاہ کو ولی کامل تصور کرتے چلے آ رہے ہیں

ن سے منسوب بہت سی کرامات بیان کرتے ہیں۔

ٹاٹ شاہ کا حجرہ آباد رہا

ٹاٹ شاہ کے انتقال کے بعد مدتوں یہ حجرہ خالی رہا۔ بہت دنوں بعد مولوی
 مہر اللہ صاحب بہرائچی جو مولانا نعیم اللہ صاحب بہرائچی کے خلیفہ تھے، نے آکر
 اس حجرہ میں قیام کیا۔ اس کے بعد حاجی سید احمد علی اور ان کے بھائی سید
 محمد دوست جو مولانا محمد سیّد اللہ صاحب بہرائچی کے خلیفہ بھی تھے، مسجد ٹاٹ شاہ
 میں رہنے لگے تھے۔ محلہ کے مسلمانوں نے انہیں مسجد کا ستولی اور نگراں بنادیا
 تھا۔ جب ان دونوں اصحاب کا انتقال ہو گیا تو یہ لوگ بھی ٹاٹ شاہ کے قرب
 میں دفن کئے گئے۔ مولوی عبدالکریم انصاری اودھی مرحوم نے لکھا ہے کہ اس
 حجرہ میں کچھ دنوں مولوی محمد یعقوب دہلوی نے بھی قیام کیا تھا اور جب آپ کا
 انتقال ہوا تو آپ کو بھی اسی جگہ دفن کیا گیا۔

مولوی محمد یعقوب دہلوی کے انتقال کے بعد حافظ سید محمد اسماعیل صاحب
 خلیفہ مولوی بشارت اللہ صاحب جو مولانا نعیم اللہ صاحب بہرائچی کے داماد
 تھے، اس حجرہ میں آکر قیام کیا اور کلام پاک کی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ کہتے
 ہیں کہ آپ کی محنت اور قصوص کا یہ ثمرہ تھا کہ ہر سال دو تین بچے حافظ قرآن ہو کر
 نکلتے۔ بے شمار ۹

اب اس مسجد کی بالائی منزل پر مسجد کی انتظامیہ کمیٹی ایک اسلامی مکتب
 چلا رہی ہے جس میں ملکہ کے بچے اردو، عربی اور ہندی وغیرہ کی تعلیم حاصل کرتے

ہیں۔ مسجد اور اُس سے متعلق دروکانوں وغیرہ کا انتظام ایک رجسٹرڈ باڈی کے ذریعہ کنٹرول ہوتا ہے اور جیسا کہ ہر مسلم اداروں میں اقتدار کے لئے رسمہ کشی اور جنگ آزمائی ہوتی رہتی ہے وہ حالت و کیفیت یہاں بھی دیکھنے کو آسانی سے مل جاتی ہے۔

ٹاٹ شاہ مسافر خانہ:

ابھی چند دن ہوئے ہیں کہ کچھ مسلمانوں نے محلہ کنگھی محال میں جوڑ جوڑ گھنٹہ گھر کے پورب وائر جانب سے محلہ کنگھی محال کی مسجد کے پیچم جانب ٹاٹ شاہ مسافر خانہ کے نام سے ایک مسافر خانہ کی بنیاد ڈالا تھا، اب تک چھ سات کمرے، دو غسل خانے اور پاخانہ بن چکے ہیں۔ چار روپیہ یومیہ کے حساب سے اس مسافر خانہ میں قیام کرنے کا کرایہ پڑتا ہے۔ ذمہ داروں سے بات چیت کرنے پر مولف کو محسوس ہوا کہ ان کے منصوبے عظیم ہیں لیکن عوامی عظیم منصوبے خصوصاً مسلمانوں کے ذریعہ تکمیل پانے کے تجربے مولف کو بہت تلخ ہیں۔

اب مسجد ٹاٹ شاہ کے جنوبی دروازہ کے باہر نکلے تو سامنے ہی ایک پتلی سی سڑک ملے گی جو مینیا باغ سے آریہ سبب مندر اور رنج کرن ویدک انٹر کالج کے سامنے سے ہوتی ہوئی مسجد ٹاٹ شاہ کے جنوبی دروازہ، چھوٹی درگاہ حضرت عباس کے سامنے سے چوک بزازہ کو چلی جاتی ہے۔ مسجد ٹاٹ شاہ کے جنوبی دروازہ کے سامنے ہی ایک زمانہ دیدہ، دیوہیکل برگد کا درخت ہر آنے جانے والے کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیتا ہے۔ مسجد کے اس دروازہ سے دس پندرہ میٹر پیچم کی طرف اسی سڑک پر چلنے کے بعد، بائیں ہاتھ پر حضرت عباس کی چھوٹی درگاہ ملتی

ہے جہاں پر ہر جمعرات کو شیعوں کی مجلس ہوتی ہے۔ ایام محرم میں دس دن متواتر مجلس کا نظم اب تک بدستور سابق چلا آ رہا ہے۔ لیکن وہ روح جو ساٹھ ستر برس قبل یہاں نظر آئی تھی اب عنقا ہے۔

موتی مسجد اور علاقہ موتی مسجد

حضرت عباس کی چھوٹی درگاہ سے پورب مسجد ٹاٹ شاہ کے جنوبی دروازہ کے سامنے برگد کے درخت کے پچھم جانب سے ایک ٹیری میڑھی ٹرک دھن جانب پرانی سبزی منڈی محلہ کو گئی ہے۔ اس درخت کے پاس سے دو ڈھائی سو میٹر دھن جانب چلنے کے بعد موتی مسجد کا عقبی حصہ ملتا ہے جسکی پشت پر جھونپڑیاں ڈال کر نوگ رہ رہے ہیں۔ کچھ نوگ مسجد کے مینارے کے پچھلے حصے میں بھی رہتے ہیں۔ یہ عظیم الشان مسجد نواب شجاع الدولہ کے وسطی دور حکومت میں تعمیر ہوئی تھی۔ یہ فن تعمیر کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ مسجد کی لبائی اور ڈرائی کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس قیاس کو تقویت پہنچتی ہے کہ جس زمانے میں یہ مسجد تعمیر ہوئی تھی اس وقت ضرورت کے پیش نظر اتنی وسیع و عریض مسجد بنانے کی یقیناً ضرورت محسوس ہوئی ہوگی۔ فی الوقت اس مسجد کو آباد کھنے والوں کی تعداد برائے نام نظر آتی ہے۔ ممکن ہے کہ محرم کے ایام میں ایک عشرہ کیلئے کچھ رونق و آبادی بڑھ جاتی ہو۔ مسجد کو باہر سے دیکھنے کے بعد، مسجد کی دیکھ بھال کرنے والوں پر ”بے پروائی“ برتنے کا جرم، اندر کی صفائی اور قدرے توجہ دینے سے ہلکا ہو جاتا ہے۔ تاہم منتظمین کو اس جرم سے

بری نہیں کیا جاسکتا کہ جس سست روی سے مسجد کی دیکھ بھال کی جا رہی ہے۔
 اُس سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ خستگی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ آج کل اس مسجد
 کے حاطہ میں شیعہ فرقہ کے بہت سے خاندانوں کی رہائش گاہ ہے۔

بہاروں کا مسکن ہے یہ

شام و بوسہ پر سناٹا نہ دیکھا تھا کبھی
 چھوڑ دے یہ کہ کبھی اتنے تو رغبت نہ تھے

موتی مسجد کا یہ علاقہ آباد ہونے کے باوجود نہ جانے کیوں اجاڑ و ویران
 سا نظر آتا ہے۔ اس علاقہ کے ہر در و دیوار سے وحشت و حسرت بر سکتی ہے۔
 نواب شجاع الدولہ کے عہد میں خواجہ چھوڑہ کے بعد جس علاقہ کی اہمیت اور حیثیت
 قابل رشک تھی اور جسے پرستان کہلانے کا فخر حاصل تھا وہ یہی موتی مسجد کا
 علاقہ یا محلہ تھا۔ جس میں عموماً نمائندین سلطنت اور اراکین دولت کی داشتائیں
 ور رکھیلیں شاہانہ ٹھاٹھ سے رہا کرتی تھیں۔ امرا و رؤسا، اراکین دولت و
 نمائندین سلطنت کے افراد زرق و برق لباسوں میں ملبوس، ہاتھوں میں موتیا
 و جیلے کے گہرے لئے ہوئے خدام و مصاحبین کے جلو میں ادھر ادھر چلتے پھرتے
 نظر آتے تھے لیکن آج اس علاقے پر ایک ایسی ناقابل بیان وحشت و خموشی
 اور ویرانی واداسی کا عالم چھایا ہوا ہے کہ ہر ایک نووارد بھی محسوس کئے بغیر
 نہیں رہ پاتا۔ اس محلہ کا سارا ماحول خاموش و پرمردہ سالگتا ہے۔ لوگ متفکر
 چہرے اترے ہوئے، بے رونق، جیسے پریشان حال، کسی انجانی فکر یا اندیشہ

اور خوف و ہراس سے سرا سیمہ سے لگتے ہیں لیکن عورتوں کی "حالت" ان کے
مردوں کے برعکس ہے۔ آج یہ محلہ یا علاقہ ہر صاحبِ نظر کے لئے جلتے عبرت ہے۔
موتی مسجد کی پشت سے گزرنے والی پرانی سبز منڈی کی ٹرک سے دھن
کی دف تقریبا دو سو میٹر مزید دھن کی طرف چلنے پر بائیں ہاتھ (پورب جانب)
اب ٹرک کو رینٹ بیک ٹرینک، سکول کا ہندی زبان میں بورڈ لگا ہوا ہے دھن
جانب جس مقام پر اس اسکول کا چہرہ اردو یا ری ملتی ہے۔
اس سے تقریباً چار سو میٹر مزید آگے دھن کا ایک چوراہہ ہے اس چورہے پر بائیں ہاتھ ٹرن
پر گھوسی ٹولہ نامی علاقہ ہے (اب محلہ ہے) جو پرانی سبزی منڈی کا پورولی حصہ ہے
اور واسنے ہاتھ پر نخاس کا قدیم محلہ ہے۔

وقت کتابدگی

عبد ماضی دوبارہ تو اتنا نہیں
یاد ماضی ہی سے دل کو بہلائیے

نوابین اودھ کے دور میں یہ منزلہ
دورویہ بازار تھا۔ نخاس کا بازار پہلے بھی عصمت فروشی کا بازار رہا ہے اور آج
بھی عصمت فروشی کا بازار ہے۔ لیکن اُس وقت آج جیسی ضلالت و زنا لٹ
نہ تھی کہ کنجڑوں کی طرح "گاہک" کو بلائیں اور فحش انداز و اطوار سے جنس کی
نمائش کریں۔ دو ٹک بات کر کے معاملہ طے ہو جائے۔ پہلے وقتوں میں تاشبینوں
کو پکھا جاتا تھا۔ متعدد ملاقاتوں کے بعد فرمائشوں کا سلسلہ شروع ہوتا،

مہینوں بعد پھر کہیں عرض مدعا کی نوبت آئی۔ اس بازار میں بہت سی ڈیرہ دار اور پیشہ ور طوائفیں تھیں لیکن آج جیسی بیڑیوں کا ہجوم نہ تھا۔ سارے بازار میں طلبہ و سازنگی کی آوازیں گونجتی رہتی تھیں۔ ایک سے ایک مہذب اور تہذیب یافتہ طوائفیں تھیں جن میں "مجرئی" زیادہ "مجرئی" کم۔ "مجرئی" کے لئے بھی ایک صبر آزا وقت کی ضرورت تھی۔ "مجرئی" کا تو کچھ کہنا ہی فسنوں ہے۔ شرفارشت و درخواست کی تعلیم کے لئے اپنے بچوں کو یہاں بھیجتے تھے۔ یہ طوائفیں مزاج شناس اس قدر ہوتی تھیں کہ غزل جھڑنے سے پہلے

سے پہلے ہی سمجھ لیتی تھیں کہ محفل میں حافظ کی شراب شہ از کار گر ہوگی کہ غالب کی شوخیاں کا آئیں گی یا میر کے سوز و درد سے قیامت بپا کی جائے؟ — ان طوائفوں کی معاشرت تو سب سے جدا گانہ تھی مگر اخلاق و آداب، تہذیب و تمدن اور انداز گفتگو و شیریں بیانی بے مثال ہوتی تھیں۔ زبان میں شستگی و نرمی، حاضر جواب اتنی کہ اچھے اچھوں کے منہ میں تالے پڑ جائیں — کیا مقابلہ ہے آج کے نخاس سے کل کے نخاس کا۔ !

نخاس سے ملحق، چوراہے کے پورب جانب، پرانی سبزی منڈی کا محلہ گھوسی ٹولہ ہے جو اسی محلہ کا ایک حصہ ہے۔ اسی سبزی منڈی میں ایک مکان کے باہری محن میں مولانا نیاز احمد صاحب کا مزار ہے

مولانا شاہ نیاز احمد :

مولانا نیاز احمد صاحب جائس کے رہنے والے تھے ۱۳۲۲ ہجری مطابق ۱۹۰۴ء میں فیض آباد میں تشریف لائے۔ اس وقت آپ کی عمر چالیس سال سے

کم نہیں تھی۔ آپ اپنے زمانہ کے عالم باعمل اور ماہر طبیب تھے۔ فیض آباد آنے کے بعد آپ نے سبزیشدی کے محلہ میں منور خاں نامی شخص کے مکان پر قیام فرمایا اور آخر عمر تک اسی مکان میں رہے اور جب انتقال ہوا تو اسی مکان کے سامنے آپ کو دفن کیا گیا۔

حضرت مولانا نیاز احمد، حرم صاحب زمانہ کے صاحب کمال بزرگ، عالم باعمل حافظ طبیب اور پابند شریعت بزرگ تھے۔ آپ مولانا فضل الرحمن صاحب گنج شہزاد آبادی کے خلیفہ تھے اور سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت تھے۔ آپ نے کسی کو اپنا خلیفہ یا جانشین نہیں بنایا کیونکہ کوئی بھی معتقد یا مرید آپ کے معیار کے مطابق پابند شریعت اور زہد و تقویٰ کا نہیں تھا۔

آپ کے زمانہ حیات میں، لوگ دور دور سے آپ کی ملاقات اور دعاؤں کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ آپ کی ذات بابرکات شہر فیض آباد کے لئے خصوصاً اور اطراف و جوانب کیلئے عموماً باعث برکت تھی۔ آپ کی بشارت کرامات لوگوں میں مشہور ہیں۔ لوگ اب بھی آپ کے باطنی فیوض سے مستفیض ہوتے ہیں۔ ۱۹۲۵ء کی گرمیوں کے ایام میں آپ کا انتقال ہوا۔

انتقال کے روز ہی بعد مقتدین کا درگزرہ ہو گیا۔ ایک گروہ کی خواہش تھی آپ کو ٹاڈوالی تکیہ رکھنے کی علی بیک کے قبرستان میں سپرد خاک کیا جائے اور اس نے ٹاڈوالی تکیہ قبرستان میں تبرکھدوائی تھی۔ بعد از گروہ چاہتا تھا کہ آپ کو منور خاں کے مکان کے باہر سامنے صحن میں دفن کیا جائے اور اس نے اس جگہ پر قبر بھی تیار کروایا تھا۔

آپ کی نماز جنازہ بعد نماز ظہر مسجد ٹاڈ شاہ کے پوربی دروازہ کے سامنے ہوئی

ہزاروں لوگوں نے نماز جنازہ پڑھی۔ اس دن فیض آباد شہر کی تمام درکانیں آپ کے سوگ میں بھلا کسی اعلان "بندی" کے بند ہو گئی تھیں۔ تدفین کے وقت تلپور و نما ہوا۔ ہر گز وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کیلئے اپنی کھودی ہوئی قبر میں دفن کرنا چاہتا تھا۔ کشکاش ایک بدترین ہنگامہ کی شکل اختیار کرنے ہی والی تھی کہ پوس اور ڈپٹی کمشنر مسٹر آر۔ سی۔ ہو برٹ (MR. R. C. HOBET) کے ہمراہ ضلع کے تمام اعلیٰ حکام موقع پر پہنچ گئے اور انھوں نے مشعل جوہ کو قابو میں کر کے لوگوں سے دریافت کیا کہ مولانا مرحوم کا کوئی رشتہ دار عزیز یا ان کا جانشین اگر کوئی ہو تو ہمارے سامنے لایا جائے۔ لوگوں نے حکم کو بتلایا کہ مولانا مرحوم کا کوئی رشتہ دار عزیز یا جانشین یہاں نہیں ہے صرف ایک منور خاں کی ضعیف بیوی ہیں جنکے مکان میں آپ رہتے تھے۔ اور جو آپ کو رٹ کے کی طرح مانتی تھیں اور وہی آپ کے قریب تر رہتی تھیں۔ بیماری میں وہی بیمار داری بھی کرتی تھیں۔ چنانچہ کمشنر مسٹر ہو برٹ نے چند معزز لوگوں کو ہمراہ لیکر منور خاں کی اہلیہ کے پاس گئے اور ان سے دریافت کیا کہ مولانا مرحوم نے آپ سے کوئی وصیت تو نہیں کیا ہے؟ یا اپنے دفن ہونے کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا ہے؟ مسماۃ موصوفہ نے ڈپٹی کمشنر صاحب کو بتلایا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی ہے، البتہ مرنے کے دو دن پہلے مجھے کہا تھا کہ اب میں یہیں رہ چکا ہوں۔ چنانچہ کمشنر نے مسماۃ کا بیان سن کر فیصلہ کیا کہ مولانا مرحوم کو منور خاں کے مکان کے باہر سونے صحن میں دفن کیا جائے گا۔ عوام نے ڈپٹی کمشنر صاحب کے فیصلہ کو تسلیم کیا۔ چنانچہ پوس کے حسن اظہار اور ضلع کے اعلیٰ حکام و ڈپٹی کمشنر صاحب کی نگرانی میں آپ کو منور خاں کے مکان کے باہر سامنے صحن میں سپرد خاک کیا گیا۔ مٹی دینے کا سلسلہ تقریباً ساڑھے تین بجے بعد دوپہر سے شروع ہوا اور رات تین بجے تک چلتا رہا۔ ہزاروں مسلمانوں اور

ہندوؤں نے مٹی دیا۔ آپ کے مزار پر ہر جوتقطعہ تاریخ لگا ہوا ہے اسکی عبارت یہ ہے:

عارف حق نیاز احمد شاہ ۵
ارپے سال رحلتش معجز
زہی جہاں در جوار رحمت رفت
گفت حق گو ہوئے حنت رفت

۱۲۵۵ھ

آپ کے مزار کے بغل میں بامیں درین آپ کے خادم شیخ محمد حفیظ کا مزار ہے جو آپ کے معتقدین میں سے تھے اور مدرسہ کے بانیوں میں سے تھے۔ شیخ محمد حفیظ کا انتقال ۲ نومبر ۱۲۵۵ھ (مطابق ۱۹ زلیٰ الحجہ ۱۳۶۹ھ) بوقت ۸ بجے شب ہوا تھا اور تدفین ۵ نومبر ۱۲۵۵ھ بعد نماز تہجد ہوئی تھی۔ آپ خیر کے ایک سرگرم ساجی کارکن تھے۔ اور مسلم لیگ (فیض آباد شہر) کے صدر تھے اسپتال ہیل اور پچانسی گھر کی لائبریری کی تجویز تکفین میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔

جبکہ انتقال مولانا کے انتقال کے تقریباً ۲۱ سال بعد ہوا لوگوں نے آپ کو مولانا کے پہلو میں دفن کیا۔ آپ کا مزار آج بھی مرجع خلافت ہے۔ مولانا عبد الغفار صاحب ایم اے۔ جو مرحوم منور حان کے مکان کے متصل ہی رہتے ہیں اور جنگی عرصہ میں وقت اسی پچاس سال کی ہے۔ انہوں نے تھوڑا زمانہ مولانا نیاز احمد صاحب کا آخری زمانہ دیکھا ہے اور ان کے متعلق ابھی معلومات رکھتے ہیں۔

حضرت مولانا شاہ نیاز احمد صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کے مزار سے واپس ہو کر مسجد ٹاٹ شاہ کے پھاٹک کے سامنے سے چوک گلاب باڑی روڈ پر آئے۔ گلی کوٹا پاڈ کے اس پھاٹک سے چند قدم پورب کی طرف چلنے کے بعد داہنے ہاتھ پر "توپ

والی کوٹھی" نام کی مشہور عمارت ملے گی۔ کوٹھی کا صحن وسیع و عریض ہے۔ اس کوٹھی کے سامنے ہی صحن میں ایک چبوترہ پر ایک برطانوی توپ رکھی ہوئی نظر آئے گی جس پر آج بھی تاج برطانیہ کا نشان بنا ہوا ہے اور شاید اسی برطانوی توپ کی مناسبت سے زمانہ مابعد میں لوگ اسے "توپ والی کوٹھی" کے نام سے پکارنے لگے۔ اس کوٹھی کے جنوبی حصہ میں فیض آباد چوک کا سٹی پوسٹ آفس ہے پچھلی اور پورلی حصہ میں جوتہ کے اڑھتیوں کے گودلم اور ایک پرل سیر ہے۔

یہ وقت کی بات ہے

اب اتنے بھی سادا تو نہیں ہو کہ زمانہ
یہ بات الگ ہے کہ الجھنے ہی کو ٹھکانو

یہ کوٹھی آج توپ والی کوٹھی کہلاتی ہے۔ نواب آصف الدولہ کے نائب و معتمد، سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں مرحوم کی حویلی تھی جو نواب وزیر کے معتمد اور کمپنی سرکار کے خیر خواہوں میں تھے۔ عہد آصفی میں اس کوٹھی کے ارد گرد انکے ملازمین اور شاگرد ہمیشہ لوگوں مکانات تھے۔ بعد انتقال انکی حویلی کے صحن میں ہی انکو سپرد خاک کیا گیا اور کمپنی سرکار یہاں پٹیا کمپنی کی اجازت سے انکے انگریز حاکم دوستوں کے آنے کے اعزاز میں ان کی قبر پر برطانوی توپ رکھ کر برطانیہ سے وفاداری کا خصوصی امتیاز بخشا۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگ سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں اور ان کی حویلی کو فراموش کرتے چلے گئے۔ ان کی قبر پر بھی ہوئی برطانوی توپ، جو صاحب قبر کی تاج برطانیہ سے خیر خواہی کے اعزاز میں رکھی ہوئی ہے،

اس کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے^{۹۵} اور نواب موصوف کی قبر کی حیثیت ایک چبوترہ کی ہو کر رہ گئی۔ آج فیض آباد شہر ہی میں ایسے چند ہی لوگ موجود ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ "توپ والی کوٹھی" میں جس چبوترہ پر برطانوی توپ رکھی ہوئی ہے وہ کوئی چبوترہ نہیں بلکہ نواب آصف الدولہ کے نائب و معتمد سرفراز الدولہ حسن رضا خاں کی دائمی آرامگاہ ہے۔ اب یہ چبوترہ بھی انتہائی خستہ حالت میں ہے۔ اگر چبوترہ کے ساتھ اسی طرح کی بے پروائی و بے اعتنائی برتی جاتی رہی تو آئندہ دس پانچ سالوں میں اس چبوترہ کا نام و نشان بھی مٹ جائیگا اور صرف توپ والی کوٹھی کا نام کچھ دنوں کے لئے باقی رہ جائیگا۔

فیض آباد کی آبادی کے ایک مخصوص طبقہ کے افراد کی رگوں میں نواب شجاع الدولہ اور ان کے اراکین و عمائدین کا وہ "گرم خون" آج بھی گردش کر رہا ہے جو اخلاف و اسلاف کے درمیان کسی تعلق و رشتہ کا "لازمہ" بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ یہ کوئی المیہ نہیں ہے۔

خود غرض میں یہ جوانوں کے پرستار بہت
صبح ہوتے ہی چراغوں کو بجھا دیتے ہیں

۹۵۔ جس چبوترہ پر برطانوی توپ رکھی ہوئی وہ اب نہایت خستہ ہو چکا ہے۔ اس کا لگا ہوا چوڑے کا پلاٹر بھی 'مردہ' ہو کر لکڑی کا ہے جس سے چبوترہ کی جڑائی کی اینٹیں صاف ظاہر ہونے لگی ہیں۔ چبوترہ کی اینٹوں کی چٹائی محراب دار ہے جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ یہ کوئی چبوترہ نہیں قبر ہے اور قبر ہونے میں اب کوئی شک و شبہ نہیں ہونا چاہئے۔ — مولف

قدرت کا ایک عبرت آموز تازیانہ
 ہے جو کچھ سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں مرحوم کی ذات گرامی تک ہی محدود
 نہیں ہے وہ تو ایک معتدل مزاج خون کے آدمی تھے اس وقت کے گرم خون کھنے والی؟
 بیشمار معزز مصائب و آفات و سختیاؤں کے ساتھ جی پی برتاؤ و معاملہ ہے۔
 اب توپ والی کوٹھی سے نکل کر سامنے شکر پر پورب کی طرف جائے
 آگے گلاب باڑی کا مشہور زمانے کا پارک ملے گا جو خواجہ پورہ کے علاقہ یا محلہ میں واقع
 ہے۔ اس پارک کے وسط میں ایک مربع عمارت میں نواب شجاع الدولہ کی قبر
 ہے۔ اب سے ساٹھ، ستر سال پہلے کی "گلاب باڑی" اور اس سے ملحق بیرکوں
 میں بڑی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں اور تبدیلیوں کا سلسلہ اب بھی اپنی شدت
 کے ساتھ جاری ہے۔

دیکھتا ہوں جاگتا خواب ک نئی دنیا کا آج
 اگلے وقتوں کے جو تھے ہنگامہ آرا سو گئے

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

اب نہ وہ گلاب باڑی ہے اور نہ گلاب باڑی کی وہ صبح و
 شام نہ وہ خواص پورہ ہے اور نہ خواص پورہ کے وہ بے فکر عوام و خواص۔
 ہاں ابن آدم کی عبرت کے لئے کہیں کہیں خستہ و بوسیدہ قبروں کے قبرستان
 اور ان میں ٹوٹے پھوٹے مقابر یا مقابر کے باقیات و آثار، دیوہیکل، زمانہ دیدہ کچھ
 درخت اب بھی باقی رہ گئے ہیں جو اپنی زبان بے زبانی سے اپنے گذرے ہوئے

دنوں کی پر آشوب داستان سنانے کے لئے کافی ہیں۔ ان کے قرب کی
 احساس و خاموش فضا نہ جانے اپنی خوشی کے دامن میں کتنی بہار آشنا اور
 خزاں، سیدہ صبح و شام کے ہنگامے سیٹے ہوئے ہے وہ خواص پورہ
 جہاں کبھی غربت و افلاس کے سایہ کا تصور بھی محال تھا آج اسی خواص پورہ میں
 نہ جانے کتنے معصوم بچے، مرد چوہے پر رطی ہوئی خالی پٹیلی کو دیکھتے دیکھتے، اپنی
 افلاس زدہ ماؤں کے پہلو سے دپک کر سو جاتے ہیں۔ کتنی نواب زادیاں،
 خانگیوں کی اذیت ناک زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ کتنی مریم زادیاں، ستر پوشی
 کے لئے پٹھے پرانے کپڑوں کی محتاج ہیں۔ یہ انقلابات زمانہ کی کرشمہ سازیاں
 ہیں کہ جن کے اسلاف کے اسطاف و عنلیات نے لوگوں کے ذہن سے غربت و افلاس
 کا تصور تک مٹا دیا تھا آج انہیں کے اخلاف دست سوال دراز کرتے ہیں جن کے
 باپ و دادا اپنی دولت و امارت کی نمائش کے لئے داشتائیں اور رکھیلیں رکھا کرتے
 تھے آج انہیں کی بیٹیاں بھوک اور غربت سے مجبور ہو کر داشتائیں اور رکھیلیں بنی ہوئی
 ہیں جنکے اسلاف کی داد و بخش مشہور تھی آج جن کے اخلاف کی در یوزہ گری کی شہرت ہے۔

ابر برسا پھول سبکے اور مچر کر گئے
 سہ بجا، جینا سہی مر گئے، نوم گئے

گڈری بازار بنام لوہا بازار

اب تھلاب ہڈی "پارک سے چوک گھنٹہ گھر واپس آئیے سامنے اتر جا
 لیک بڑا سا پھانک نظر آئے گا۔" اسے بلکہ "کہتے ہیں "یکدہ" کے باہر کے بازار کو پہلے

گڈری بازار کہا جاتا تھا اور بجے بھی کہا جاتا تھا۔ ادھر کباڑیوں کی ہی دوکانیں تھیں لیکن ادھر کچھ دنوں سے لوگ اسے "نوبا بازار" کہنے لگے ہیں کیونکہ اب اس علاقے میں لوہے کے سامان بیچنے والوں کی بڑی بڑی دوکانیں ہو گئی ہیں۔ لیکن عوام فی الوقت گڈری بازار کو نوبا بازار کہنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ابھی نوے اور پچانوے فیصد لوگ اسے گڈری بازار ہی کہتے ہیں۔ اب کبھی اس علاقے کی حیثیت و حالت بدلے گی اس وقت گڈری بازار کا نام یقیناً "نوبا بازار" ہو جائے گا لیکن فی الوقت ایسے حالات پیدا نہیں ہیں۔

یکدرہ کے باہر سے سٹی بس، ٹانگہ، ریکہ، ٹیپوٹیکسی اجودھیا اور نواجنگ (گوندہ) کیلئے ہر وقت ملتے رہتے ہیں۔

یکدرہ سے جو پختہ سڑک سیدھے اتر جانب گئی ہے، اُسے "آب دھار روڈ" کہتے ہیں۔ یہ سڑک "خور محل" کے اس حصہ تک گئی ہے جو "خور محل" کہلاتا ہے۔^{۹۶} اور جس کی وسیع عمارت کے ایک باقی بچ رہنے والے حصہ کو، جو دریائے گھاگر کے عین کنارے پر واقع ہے، اور زمانہ کی تباہی و بربادی سے بچ رہا ہے، اُسے لوگ "ایم کی کوٹھی" کے نام سے جانتے ہیں۔

یہ ایم کی کوٹھی خور محل، جو بہت زمانہ محلوں کا مجموعہ تھا، اس مجلس اکاشمالی حصہ ہے جو خور محل کہلاتا ہے اور جو ان کی عبرت کے لئے زمانہ کی دست برد سے تباہ و برباد ہونے سے بچ گیا ہے۔ کسی زمانہ میں دریائے گھاگر کا دھارا "خور محل" کے پشتے سے لگ کر بہتا تھا۔

۹۶۔ خور محل دراصل نواب تاج الدین کے "نصف" میں آئی ہوئی عورتوں کا انتہائی پر

جس مقام پر انیم کی کوٹھی کی عمارت واقع ہے اُسی مقام کے قریب میں میر محمد امین نیشاپوری سعادت خاں برہان الملک نے اپنے اور اپنی بیگمات کے رہنے کے لئے پھوس کے جنگلے بنوائے تھے۔ ان جنگلوں کے ارد گرد انکے لشکر کے افسران اور اہلکار کے جنگلے تھے۔ برہان الملک کے انتقال کے بعد انکے بھائی اور داماد مرزا منصور علی خاں (نواب صفدر جنگ) نے خس پوش "جنگل بستی" کی تجدید کاری کی ابتدا کیا اور ۱۷۳۵ء میں جنگل بستی کو فیض آباد کا نام دیا اور پختہ عمارتیں بنوانا شروع کیا۔ بستی کی روز افزوں ترقی دیکھ کر، اُس کے ارد گرد اہلکار و خواص وغیرہ نے بھی اپنی رہائش گاہیں تعمیر کرانا شروع کیا۔ بستی کے باشندوں کی بڑھتی ہوئی ضروریات زندگی نے تجارت پیشہ لوگوں سے دکانیں کھلائیں اور بازار لگوائے اور جلد ہی ترقی کے وہ مراحل طے کئے کہ فیض آباد، شاہجہان آباد کی ہمسری کرنے

اور آراستہ و ہیرا ستہ "قید خانہ" تھا جس میں ہزاروں مستملہ عورتیں رہتی تھیں۔ لیکن "خورد محل" جو اسی محل کا ایک حصہ تھا، اس میں صرف "نور فتار" رکھا گیا تھا جو چند دنوں کے بعد "خورد محل" میں منتقل کر دیا جاتا تھا۔ صاحب "اقوال و واقعات" نے لکھا ہے کہ نواب وزیر کے محل میں انکی ہزاروں عورتوں کے علاوہ ایسی بہت سی عورتیں تھیں جنہیں نواب وزیر (نواب شجاع الدولہ) نے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ یہ تمام عورتیں محالہً "خورد محل" کے استوں کے لئے تھیں اور انہیں کی نظر عنایت سے "خورد محل" میں ہمیشہ آرام سے رہتی تھیں۔ نواب وزیر ان سے لاعلم تھے۔

۴۶۔ زمانہ دراز سے اس میں ٹھکانہ ساز کا دفتر ہے۔ ضلع بھر کے انیم پیدا کرنے والے کاشتکار اپنی انیم کی پیداوار اسی دفتر میں لا کر جمع کرتے ہیں، اس لئے یہ عمارت لگوں میں "انیم کوٹھی" یا "انیم کی کوٹھی" کے نام سے مشہور ہو گئی۔ — مؤلف

موجودہ انیم کی کوٹھی، سابق حور محل کے خورد محل کا وہ حصہ ہے جو انقلابات زمانہ کے ہاتھوں انسان کی عبرت کے لئے بچ رہا ہے۔ حور محل کی عمارات نصف مربع میل سے زائد رقبہ میں پھیل ہوئی تھیں موجودہ محلہ راٹھ حویلی، وثیقہ عرکب کالج گدڑی بازار کا شمالی حصہ (دریائے گھاگھرا کے کنارے) اور دلی دروازہ محلہ کا شمالی مغربی علاقہ وغیرہ سب حور محل کے اندر تھے۔ حور محل کے اندر کی عمارات کے ارد گرد سنترہ، آم اور دیگر اقسام کے لذیذ پھلوں کے باغات تھے۔ اب سے شراستی برس پہلے تک ان باغوں کے باقیات موجود تھیں۔

فن تعمیر کا نمونہ خورد محل

کنارے ہی سے طوفان کا تماشہ دیکھنے والے

کنارے سے کبھی اندر طوفان نہیں ہوتا

خورد محل کے نام سے جو کھنڈ راج ہمارے نظروں کے سامنے ہے، اس کے

صحن میں اب سے تین چوتھائی صدی سے پہلے تک بہترین قسم کے سنتروں اور آموں وغیرہ کے درخت موجود تھے۔ عمارت میں لگی ہوئی ساکھوا اور ساگون کی کڑیوں اور شہتیروں میں کی ہوئی نقاشی کو دیکھنے کے بعد، نوابین اودھ کے ذوق و لقا سے پسندی اور اس زمانہ کے کاریگروں کی فنکارانہ مہارت کا اندازہ ہوتا تھا۔

یہ خورد محل ہے

مراد در دلست اندر دل اگر گویم زباں سوزد
وگر دم در کشم ترسم کہ معتر استخوان سوزد

آج خورد محل کے کھنڈروں میں گھومتے پھرتے ہوئے خوف معلوم ہوتا ہے
اس کے در و دیوار سے حسرت برستی ہے۔ ہنستے ہوئے بشاش و شگفتہ چہرے
ان کھنڈروں میں پہنچ کر سنجیدہ و طولی ہو جاتے ہیں۔ آنکھیں اشک آلودہ
ہو جاتی ہیں۔ کتنی گریہ و زاریاں، کتنی منتیں و التجائیں اور کتنی
بھینچی بھینچی سی مسکیاں، لب بستہ آہیں جذب ہیں یہاں کی اداس اور
خاموش فضا میں!

کیفیت ایسی ہے ناکامی کی اس تصویر میں
جو اتر سکتی نہیں آئینہ تحریر میں

اب نہ حور محل کے آثار و باقیات کا کوئی نشان باقی رہ گیا ہے اور نہ
”خورد محل“ میں ستروں، آموں یا لہذہ پھلوں کا باغ ہے، نہ دلکش و رنگین پھولوں
کا چمن، نہ گلاب و موتیا کے پودوں کی روشیں، نہ رات کی رانی اور دن کے راجا
کی جھاڑیاں، نہ حوض و فوارے ہیں، نہ نرگس بیمار کے نظارے ہیں۔
ہاں جگہ جگہ آلو، گوبھی اور مختلف ترکاریوں کی کیاریاں ضرور ہیں۔

”خورد محل“ کی اس بو محل اور خاموش فضا میں کھڑی بلند و بالا منقش
دیواریں، وسیع و عریض کمرے و دالان، نہ جانے کیسے کیسے راز ہائے سربستہ

کے امین ہیں؟ وعدہ و وعید کی سرگوشیوں کے گواہ، اور تلامذہ خیر قہقہوں، بھینچی بھینچی سسی
 سسکیوں و لب بست آہوں اور چینپوں کی رازداں ہیں؟ کتنی بغزٹوں اور گناہوں
 کے پردہ پوش اور لطاف و عنایات کی مدفن ہیں؟ کتنے عفو و درگزر اور سزا و تازیانی
 کے نظاروں کا یہ گورستان ہے؟ — ایک وقت اس جگہ وہ بھی گزرا ہے جب
 ان دالانوں اور وسیع و عریض کمروں میں پری پیکر اور حور شمائل رقاصاؤں کے
 رقص و نغمہ سے ہنگامہ سا مچا رہتا تھا۔ — بڑے بڑے بلوری فانوسوں سے
 ان کا گوشہ گوشہ بقعہ نور بنا رہتا تھا۔ — آج رات کے سناٹوں میں ان
 کی برہنہ دیواروں پر بیٹھ کر سوز خوانی کرنے والے آوازوں کی مہیب آوازیں دل کے
 خوف و ہراس سے لرزہ طاری کرتی ہیں۔ اطلس و کنو اب کے پردوں سے مزین
 شمع و فانوس سے منور رہنے والی یہ رہائش گاہیں، مٹی کے ایک دئے کی مدھم سی
 روشنی کو ترستی ہیں۔

زندگی سے تھا کبھی مسموم۔ اب سنان ہے
 یہ خموشی اس کے ہنگاموں کا گورستان ہے

ان راستوں سے

آئیے۔ — 'خورد محل' کے کھنڈروں سے اب واپس یکدرہ چلیں
 یکدرہ کے باہر سے بنی گنج، اور آئی ٹی آئی کالج تک جانے کیلئے، ایکروپ
 ڈیڑھ روپے میں رک شامل جاتا ہے۔

۹۸۔ اسی جگہ سے پتہ تا نگہ، یکدرہ سٹی بس اچھا اور نہ نواب گنج (گوندہ) کیلئے ملتے ہیں۔
 لیکن اسی جگہ جو دھیا اور مینی گنج و صاحب گنج وغیرہ کو جانے کیلئے چوک گھنٹہ گھر کے پورب
 باٹا کی جوتوں کی دوکان کے سامنے سے ہر دقت رکھتے ہیں۔ — مولف

یہاں سے بنی گنج چوراہا کے لئے رکشا کیجئے۔ رکشا گڈری بازار کے چوراہا سے پورب کی طرف فیض آباد و اجودھیا روڈ پر چلے گا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد داہنے ہاتھ پر ساکیت پرنٹنگ پریس کی عمارت اور خواص پورہ کا چوراہا ملے گا۔ اس کے آگے خواص پورہ محلہ کا شمالی مشرقی حصہ اور پتھر کٹوں کی پتھروں کی دوکانیں، اس کے بعد سیتاپور آنکھ کے اسپتال کی عمارت پھر صاحب گنج، اسماعیل گنج، امانی گنج اور بنی گنج (جسے کبھی بہار گنج بھی کہا جاتا تھا) کے محلے آتے ہیں اس محلہ کے چوراہا پر دھن جانب ایک قدیم ملی کاد رخت اور ملک چھوٹی سی مسجد ہے۔ یہی بنی گنج کا چوراہا ہے۔ سامنے کی سڑک پر جوا جودھیا شہر کو جاتی ہے (دھن جانب جانے والی سڑک دیوکالی کو سیدھی چلی جاتی ہے۔ سولف)

مالک کی مسجد

سامنے کی سڑک جوا جودھیا شہر کو جاتی ہے بائیں ہاتھ پر ب سڑک ہی نزائیں اور دھوکے وسطی دور کی ایک عظیم الشان مسجد ہے جو مالک کی مسجد کہلاتی ہے۔ اس کا شمالی حصہ پندرہ بیس سال ہوئے بارشک سے منہدم ہو گیا تھا۔ اس گئے ہوئے حصہ پر اب آبی ٹی۔ آئی۔ کالج کا قبضہ ہے جس میں ترکاریاں پیدا کی جاتی ہیں۔ آگے داہنے ہاتھ پر اب آئی ٹی آئی کالج کے پوربی گیٹ کے سامنے سڑک کے دھن جانب سلم یتیم خانہ بڑی بوا صاحبہ کو جانے کا راستہ ہے۔ راستے کے کنارے ایک پتھر کا بورڈ لگا ہوا ہے جس پر "سلم یتیم خانہ بڑی بوا روڈ" لکھا ہوا ہے۔ بائیں جانب سامنے ہی آئی ٹی آئی کالج کی پختہ چہار دیواری اور کالج کی عمارتیں ہیں۔ سامنے پورب جانب جاپانالہ کاپل ہے۔ پھر گرکل آیو، وید کالج، کامتا پرشاد سنڈرل پوسٹ گریجویٹ ڈگری کالج، کالا اسپتال کے سامنے سے گذرتی ہوئی، یہ سڑک

اور دھیا شہر کو جاتی ہے ۔

مالک کی مسجد کا پہلے کیا نام تھا؟ یا ماضی میں لوگ اس مسجد کو کس نام سے پکارتے تھے؟ اس بات کو بتانے والا اب نہ کوئی شخص موجود ہے اور نہ کسی اخبار و کتاب میں اس مسجد کا کوئی تذکرہ ملتا ہے۔ مسجد کی طرز تعمیر سے اس قیاس کو تقویت ملتی ہے کہ یہ نواب شجاع الدولہ کے عہد کی تعمیر کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ اسکی علاقہ میں میرزا بابر کات اسید احمد بانسی والا وغیرہ جو نواب شجاع الدولہ کے معتمد اور فوجی افسر تھے رہتے تھے ہو سکتا ہے کہ انھیں لوگوں میں اسے کسی نے یہ عالی شان مسجد کو بنوایا ہو۔

گزشتہ نصف صدی سے لوگ اس عالی شان مسجد کو "مالک کی مسجد" یا "مالک شاہ کی مسجد" کہنے لگے ہیں تقریباً تشریف پور سال قبل کی بات ہے فیض آباد شہر میں گورنمنٹ ہائی اسکول سفید ریشم جیسی بسی راڈ بھی (جو ان سے نیچے تک پہنچتی تھی) اور تینا اتی، پچاسی سال ابھی، ابھی برف سے سفید گھونگھریاے بال۔ متوسط قدرت مند رست و توانا، مجذوب گھوڑا پھر کرتے تھے جنھیں لوگ مالک شاہ کہتے تھے۔ شہر کا بچہ بچہ ان سے واقف تھا۔ ۱۹۱۱ء میں یہی مالک شاہ مجذوب فیض آباد شہر کو چھوڑ کر اس مسجد میں آکر رہنے لگے تھے۔ حاجتمند لوگ درخواست دعا کیلئے اسی مسجد میں آکر اپنے ملاقات کرتے اور درخواست دعا کرتے۔ کچھ دنوں بعد یہ مسجد لوگوں میں "مالک شاہ کی مسجد" کے نام سے منسوب ہو گئی۔

مالک شاہ کے آخری دنوں کو دیکھنے والے اکثر لوگ اب بھلی مینی گنج سلطان پور وغیرہ محلوں میں بقید حیات ہیں اور مالک شاہ کی اپنی آنکھوں دیکھی کرامات بیان کرتے ہیں محمد اسماعیل انصاری جنکی عمر اس وقت اتنی پچاسی سال کے قریب ہے انھیں مالک شاہ کے آخری دنوں کے بہت سے واقعات کا علم ہے۔

مالک شاہ نے ۱۹۲۰ء میں دائی اجل کو لبیک کہا۔ انتقال سے ایک دن قبل اسی مسجد میں رہنے والے عبد الغفور نامی ایک شخص سے جو اکثر آپ کی خدمت میں حاضر ہا کرتا تھا اور حسبہ آپ بھی اکثر شفقت فرمایا کرتے تھے، بلا کر وصیت کیا کہ جب میرا انتقال ہو جائے تو مجھے ہاتھ کے بٹے ہوتے ہوئے کپڑے کے کفن کے ساتھ گنج شہید (موجودہ وقت باری تعالیٰ قبرستان) میں دفن کرنا اور میری قبر کو پختہ بنانا۔ چنانچہ وقف باری قبرستان میں آپکی پکی قبر تک موجود رہے۔

بنی گنج پورا بابا سے ایک پختہ ترک دھن جانب کو جاتی ہے جو ریلوے لائن کو پار کرتی ہوئی دیو کالی نامی محلہ کو جاتی ہے اور بائیں جانب یعنی اتر جانب ایک خام گلی کی شکل میں راستہ جاتا ہے۔ اس پر پندرہ بیس میٹر اتر کی طرف چلنے کے بعد سامنے ہی (یعنی اتری جانب) ایک پتھروں کی پتھروں سے بنی ہوئی ایک عمارت نظر آتی ہے جو بلندی پر واقع ہے۔ اس عمارت کو لوگ گنبد بخش بابا کے نام سے پکارتے ہیں۔

گنبد بخش بابا

اس عمارت کو لوگ بخش بابا کا گنبد یا گنبد بخش بابا کہتے ہیں۔ اس گنبد کے اندر میں قبریں ہیں۔ اس محلہ کے لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ معتبر اور ضعیف العمر لوگوں سے سنتے چلے آ رہے ہیں کہ ان تینوں قبروں میں سے ایک قبر سید سالار مسعود غازی (رحمۃ اللہ علیہ) کی فوج کے بخش کی ہے اور دوسری دو قبریں ان کے مصاحبین کی ہیں۔ دہشتہ عالم بابا^{۹۹} اس گنبد کے کچھ جائب ایک ثنائی مسجد شکستہ حالت میں

۹۹ بخش بابا اور ان کے مصاحبین کا نام اور دیگر حالات کسی قدیم و جدید کتاب میں

اب تک موجود ہیں انھیں۔ یکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مسجد متوسط عرض و طول کی رہی ہوگی۔ گنبد کے پورب، اتر و سجھم جانب زمانہ قدیم کی ہزار ہا قبریں تھیں اس وسیع و عریض قبرستان کا سلسلہ کا متاثر شاہ سندھ رلال ساکیت پوسٹ گریجویٹ ڈگری کالج سے آگے (جودھیا شہر کی عید گاہ کے پیچھے محل شاہ باز قلعہ کی خانقاہ تک چلا گیا ہے۔

یہ وسیع قبرستان جس میں گنبد بخش بابا بھی واقع ہے۔ زمانہ ماضیہ میں گنجان جنگل تھا۔ اس جنگل میں لاکھوں پختہ و خام قبریں و مقابر اور تباہ برباد خانقاہیں تھیں۔ چونکہ یہ تمام علاقہ دریائے گھاگرا کے کنارے پر ہے اس لئے اس میں جنگلی بھیسیں، بھینے گامیں، ہرن، نیل گائیں، ساہی، بومڑیاں، خرگوش، بھڑیئے اور جنگل سور و غیبہ جاذب اور سرور، مرغابیاں، بٹیریں، تیر، جنگلی مرغابیاں، ہارل، بطخ اور کہک و غیرہ پر مہرے ملتے تھے اور اب بھی ملتے ہیں۔ جانوروں اور پرندوں کی بہتات کی وجہ سے نوابین اودھ نے اس وسیع و عریض قبرستان کے علاقہ

مولف کی نگاہ سے نہیں گزرا اور تاہی یہ معلوم ہو سکا کہ ان تینوں قبروں میں بخشی بابا کی قبر کونسی ہے؟ لیکن اس علاقہ کے باشندے بتاتے ہیں کہ جو قبر درمیان میں ہے اسی کے بارے میں وہ سننے چلے آئے ہیں کہ بخشی بابا کا قبر ہے۔ آپ کا عرس ہر سال ماہ شعبان کی تیرہ تاریخ کو لوگ کرتے ہیں جس میں مراسم عرس کے بعد قواہوں اور فقیروں کا پروگرام بھی ہوتا ہے۔

گنبد بخشی بابا کی عظمت شوکت کو دیکھ کر شبہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ کسی صاحب اقتدار شخصیت کی دائمی آرمگاہ نہ ہو (واللہ اعلم بالصواب)۔ — مولف۔

کو جو ایک گنجان اور دشوار گزار جنگل کی شکل میں تبدیل ہو چکا تھا، اپنی تفریح کے لئے "شکار گاہ" بنالیا تھا۔ یہ سارا علاقہ نوابین اور مدد کے عہد میں شکار گاہ کے نام سے منسوب تھا۔

گنبد بخشی بابا سے پھر اسی راستے سے واپس۔ مینی گنج چورابا پر آتے اور فیض آباد اور دھیاروڈ پر پورب کی طرف چلتے۔ تقوڑی دور چلنے کے بعد ہی بائیں ہاتھ پر آئی آئی کالج کی چہار دیواری (Bounary) ملے گی۔ کالج کے مغربی گیٹ سے شمالی چہار دیواری کو پار کیجئے۔ (یہ عام راستہ نہیں ہے اصل راستہ مذکورہ کالج کی چہار دیواری کے کنارے سے جاتا ہے۔ مولف، تو سامنے ہی جنگی شہید کا قبرستان نظر آئے گا۔

جنگی شہید

اس قبرستان میں پہنچنے کے بعد سامنے ہی ایک قدیم آم اور میل کا درخت اور ایک قناتی مسجد نظر آئے گی جس کے صحن میں کسی صاحب تصرف شہید مرد کی قبر بنے جنہیں لوگ جنگی شہید کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جنگی شہید کا علاقہ دریائے گھاگرا کے کنارے پر واقع ہے۔ اس وقت جنگی شہید کا مزار اور قناتی مسجد دریا کے کنارہ پر ہی واقع ہیں۔

۱۰۰۔ جی حال ہی میں صوبائی محکمہ آثار قدیمہ نے اسکو اپنی نگرانی اور تحفظ میں لے لیا ہے۔ مولف

۱۰۱۔ مسلمانوں کی قبریں اتر دھکن ہوتی ہیں۔ یہ قبریں ان کے برعکس ہیں۔ مولف۔

عجیب قبریں

جنگی شہید کے علاقہ کے قبرستان میں آج کل تقریباً آٹھ سو پختہ اور ایک ہزار کچی قبریں ہیں۔ اس علاقہ میں پانچ پختہ قبریں ایسی ہیں جو شمالاً و جنوباً ہونے کے بجائے پورب پچھم ہیں۔ یہ تمام قبریں ایک ہی زمانہ کی اور ایک ہی کاریگر کی بنائی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

پہلی قبر جو پورب پچھم بنی ہوئی ہے جنگی شہید کے مزار کے پیچھے اتر کی طرف ہے دوسری قبر جنگی شہید کے مزار سے تقریباً ایک سو پچاس میٹر کی دوری پر دکھن جانب بنی ہوئی ہے۔ تیسری قبر کے جنگی شہید کے مزار سے تقریباً ڈھائی سو میٹر دوری پر پورب کی طرف ہے۔ چوتھی قبر، تیسری قبر کے تقریباً ساٹھ میٹر کے فاصلہ پر بنی ہوئی ہے اس چوتھی قبر کے دکھن اور پچھم کے کونے پر تقریباً ساٹھ میٹر کے فاصلہ پر ایک کنویں کے پورب جانب پانچویں قبر ہے۔

ان پانچوں فرضی قبروں یا مصنوعی قبروں کو بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی زمانہ میں اسی طرح رخ دیکر بنائی گئی ہیں۔ ان قبروں کو اگر غور سے دیکھا جائے تو ان پر کچھ نشانات "بنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ نشانات اس قدر غیر واضح اور مبہم ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتے۔ اس لئے نہ ان سے کسی راز کے آشکارا ہونے کی امید کی جا سکتی ہے اور نہ ان سے کوئی رہنمائی ہی مل سکتی ہے۔

تحریر یا نشانات

ان قبروں پر بنے ہوئے مبہم نشانات یا علامات کو خواہ مخواہ کسی زبان کی تحریر تسلیم کرنا یا کرنا ایک انتہائی گمراہ کن بات ہے۔ یہ نشانات یا علامات جنہیں "کسی زبان" کی عبارت یا کسی راز کی کلیدی علامات بیان کیا جاتا ہے، یہ دراصل سیکڑوں سال کی باریشیں اور موسم کی گرمی و سردی کے مسلسل اثرات کا نتیجہ ہیں جو "تجزیی آرٹ" کی شکل میں عموماً چوڑے کے کہنے پلاٹروں پر کسی بھی پرانی عمارت میں اور کہیں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

سونے کے سکوں کا دفینہ

جب سے صوبائی محکمہ آثار قدیمہ نے مرکزی محکمہ آثار قدیمہ کی اجازت سے دوسری "مصنوعی قبر" کھدائی کروایا ہے (جو جنگی شہید کے مزار سے تقریباً ایک سو پچاس میٹر دھکن اور آئی. ٹی. آئی. کالج کی شمالی چہار دیواری سے تقریباً دس میٹر اتر جانب ہے)، اس وقت سے ان قبروں سے متعلق بے شمار نام نہاد مستند اور معتبر یاسینہ پسینہ پٹی آنے والی روایات سننے میں آ رہی ہیں۔ آج ان قبروں کا تعلق نوب آصف الدولہ

۱۰۳۔ کھدائی کا کام ۲۵ فروری ۱۹۷۹ء سے صوبائی محکمہ آثار قدیمہ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر ایم چندر سنگھ کی قیادت میں ڈاکٹر راجرام پال کی نگرانی میں شروع ہوا تھا۔ مولف۔

۱۰۴۔ اگر رنی کھٹی کی جگہ قاسم علی خاں عالیجاہ، ناظم جنگالہ کا نام دیدیا جاتا تو ممکن ہے کہ بہت

مرحوم کے اس مدفون خزانہ سے جوڑا جا رہا ہے جسکے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں آٹھ کروڑ سونے کا سکہ دفن ہے۔ اکثر اخبارات اور رسائل میں بھی اس کی تائید میں مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

اکثر مضامین اور خبروں میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ بامیس کروڑ سونے کے سکوں کا یہ عظیم الشان خزانہ، نواب شجاع الدولہ مرحوم نے رانی کہٹی سے حاصل کر لیا تھا۔ پہلے یہ خزانہ متوڑ محل میں رکھا ہوا تھا۔ نواب شجاع الدولہ اور ان کے خاندان کے لوگوں نے جو وہ کروڑ سونے کا سکہ خرچ کر ڈالا تھا لیکن آٹھ کروڑ سونے کے سکے کا خزانہ نواب موصوف کی بیوی "بہو بیگم" صاحبہ نے انگریزوں کے ڈر سے "شکار گاہ" میں دفن کر دیا تھا۔ یہ قبریں جو پورب پچم کے رخ پر بنی ہوئی ہیں (جنہیں آئندہ مصنوعی قبروں کے نام سے ذکر کیا جائے گا)، مدفون خزانہ کی جگہ متعین کرنے کے لئے "کلیدی راز" کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان قبروں پر عربی یا فارسی میں "کچھ" لکھا ہوا ہے اور اس قدر مبہم ہے کہ پڑھا نہیں جاتا۔ نواب شجاع الدولہ کا الف لیلیٰ خزانہ شکار گاہ میں دفن ہے۔ جو جنگی شہید کے مزار کا علاقہ ہے۔

سے لوگ یقین کر لیتے کیونکہ نواب شجاع الدولہ نے عالیجاہ کے سارے دروجواہر اور قیمتی ساز و سامان جو کثیر مقدار و تعداد میں تھے اور جسے عالیجاہ نے اپنا نواب موصوف کے پاس رکھ دیا تھا، ضبط کر لیا اور اس میں سے ایک تنہا تک نہیں دیا۔ مولف

۱۰۵۔ شاہی خزانے کی تلاش از برج خندسہ ہے۔

خزانہ کا راز کھل گیا

نواب شجاع الدولہ کے اس الف لیلو می خزانے کا افشائے راز، لکھنؤ کے مرزا یونس بیگ نامی ایک شخص کے ذریعہ ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ مرزا صاحب کو ان کے پرانے کاغذات میں ۱۹۰۳ء میں ایک ٹوٹی ہوئی تانبہ کی تختی ملی تھی جو نواریٹ بمبی اور بیس ایچ چوڑی تھی۔ جس پر فارسی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ مرزا یونس بیگ نے تانبہ کی اس تختی کو اپنے بہت سے دوستوں اور شناسا لوگوں سے پڑھوانے کی کوشش کیا ان کی اس کوشش نے "خزانہ کا راز" بہتوں پر ظاہر کر دیا اس طرح لوگ آٹھ کروڑ سونے کے سکے کی رقم کی موجودگی سے واقف ہو گئے۔

۱۹۷۵ء کی ایمر جی میں

وزیراعظم مسز اندرا گاندھی کے پہلے دور اقتدار میں ۱۹۷۵ء ملک میں ہنگامی حالات کا قانون نافذ ہوا اور ڈی آئی آر و میسا کے قوانین اندھے کے ہاتھ کی لاطھی کی طرح استعمال ہونے لگے۔ ہر صاحب اقتدار حاکم، مطلق العنان حکمران بن بیٹھا تھا۔ انہیں دنوں محکمہ انکم ٹیکس کے اعلیٰ حکام نے، جبکہ کانوں میں مرزا یونس بیگ کی تانبہ کی تختی کی بھنک پڑ چکی تھی، فوراً متحرک ہو گئے۔ لکھنؤ کے انکم ٹیکس آفیسر مسٹر ایس کے لاں نے انکم ٹیکس کے آفیسر مسٹر کے پی ٹنڈن کی قیادت میں مرزا یونس بیگ کے مکان پر چھاپا مارا۔ مرزا صاحب نے تانبہ کی اس ٹوٹی ہوئی تختی کو انکم ٹیکس آفیسر کے حوالہ کر دیا۔

خزانہ کی سرکاری تلاش

مرزا یونس بیگ سے تانبہ کی متذکرہ بالائتختی مل جانے کے بعد محکمہ جاتی طور پر خزانہ برآمد کرنے لئے خط و کتابت ہوتی رہی۔ آخر ۲۰ فروری ۱۹۷۹ء سے صوبائی محکمہ آثار قدیمہ نے کھدائی کا کام شروع کیا جو ۲۰ مارچ ۱۹۷۹ء تک چلتا رہا۔ سرکاری اطلاعات کے بموجب اس مصنوعی قبر سے نہ تو نواب شجاع الدولہ مرحوم کا آٹھ کروڑ روپے کے سکے کا خزانہ ملا اور نہ کوئی ایسی رہنمائی مل سکی جس سے دھینے کے محل وقوع کا پتہ مل سکتا۔ البتہ کھدائی کے دوران کچھ پرانی اینٹیں ضرور ملیں جو دو ہزار سال پرانی بتائی جاتی ہیں۔

نواب شجاع الدولہ کے اس الف لیوی خزانے کا راز جاننے والے اب اتنے زیادہ لوگ "معتبر جانکار" کی حیثیت سے لیکن آئے ہیں کہ قبول سہائے (برج نند)، "افشائے راز کی حقیقت سے شاہی خزانے کا راز اور زیادہ گہرا ہو گیا ہے"۔ محکمہ آثار قدیمہ کے حکام کو خزانہ پالینے کا یقین ہے۔ پریس اطلاعات کے بموجب سرمایہ کی کمی کی وجہ سے مزید کھدائی کا کام فی الحال بند کر دیا گیا ہے۔

یہ ہے "شکار گاہ" میں واقع جنگی شہداء کے مزاروں کے علاقہ کی موجودہ حیثیت۔ اس کھدائی میں خزانہ کے برآمد نہ ہونے کی سرکاری اطلاع پر جتنی منہ اتنی بات کی مشل صادق آتی ہے۔ اچودھیا اور فیض آباد کے باشندوں کی ایک بڑی تعداد (خصوصاً مسلمانوں میں شیعہ حضرات کی) یہ بات تسلیم کرنے کیلئے قطعی تیار نہیں کہ اس کھدائی

میں دفتینہ برآمد نہیں ہوا۔ اکثر لوگوں کا کہنا ہے کہ کھدائی میں دفتینہ برآمد ہوا تھا جسے راتوں رات ٹرکوں اور جیپوں کے ذریعہ ہٹا دیا گیا۔ اور حکام نے یہ اعلان کر دیا کہ کھدائی میں خزانہ برآمد نہیں ہوا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ خزانہ تو نہیں ملا، یہ سچ ہے لیکن خزانہ کا راز اس کھدائی سے نہ ورل کیا ہے۔ آئندہ کسی وقت حکومت چپکے سے اس خزانہ کو نکالوائے گی۔ — اب اس سرچھلے کو پڑی ہے کہ وہ ہر کسی کا منہ پکڑتا پھرے!

جھوٹ جو سچ پر بھاری رہا

چونکہ خزانہ نواب شجاع الدولہ سے منسوب ہے، اس لئے عوام تو عوام، خواص اور اہل علم کی ایک بڑی تعداد بھی بلا تحقیق، حقائق سے آنکھیں پھیر کر، اس سفید جھوٹ کو درست تسلیم کر لیا اور نقد و تبادہ سے بھی گریزاں رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خزانہ کی موجودگی کی تائید میں بہت سی بے سرو پاد استائیں وسط ۱۹۷۹ء کے تین مہینوں (اپریل ۱۹۷۹ء، مئی ۱۹۷۹ء، جون ۱۹۷۹ء) میں اخبارات و رسائل کے صفحات پر دستاویزی حیثیت سے بکھیر دی گئیں اور لوگ اس سفید جھوٹ کی سیاہی سے اس قدر موعوب و خائف ہو گئے کہ حقیقت و صداقت کی تلاش کا تصور بھی محال ہو گیا۔

ہم نہیں جانتے کہ مرعوبیت کے اصل اسباب و عوامل کیا ہیں! نواب شجاع الدولہ روم کا بارعب اسم گرامی یا سونے کے سکوں کی کثرت و تعداد، ہمیں اس عوامی خیال سے اتفاق ہے کہ فیض آباد کی زمین کے شکم میں نوابین، امراء، رؤسا و اشرافیہ کے زرو و جواہر کا بڑا بڑا بھندہ بھینسا دفن ہے لیکن ضرورت اس افشائے راز کی ہے کہ کس نواب، امیر رئیس یا بیگم و محل کی، فیض آباد کے کس

حد اور مکان میں رہائش تھی اور اس وقت حالات کے تحت کون سی جگہ اُن کی نگاہ میں محفوظ جگہ تھی، جہاں پر انہیں اپنی دولت دفن کرنے میں کسی طرح کا وہی امکانی خطرہ نہیں تھا؟

کمپنی سرکار کا نواب شجاع الدولہ پر روز بروز بڑھتا ہوا دباؤ، امور سلطنت میں بے جا دخل در معقولات اور محنت اودھ میں کمپنی سرکار کے مفاد کی فوقیت، نواب کی متعدد اخلاقی اور کردار کی کمزوریوں سے بجا فائدہ اٹھاتے رہنے کا معمول، نیز حدود سلطنت میں کمپنی سرکار کی مسلسل ریشہ دوانیوں نے جو اتہ تی کے حالات اودھ میں پیدا کر دیئے تھے، اُن کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ امکان قطعی بعید از خیال نہیں کہ دورِ مذہب اصحاب اور بیگمات و محلات نے اپنی فاضل دولت اور زیورات و جوہرات کو لٹ جانے کے امکانی اندیشہ اور کمپنی سرکار کے محاذِ واکوڑا کے تحسین لینے کے خوف سے زیر زمین، کسی محفوظ جگہ پر دفن کر دیا ہو۔

صوبہ اودھ اور خصوصاً فیض آباد کے سیاسی و ملکی حالات کے نشیب و فراز اور خود دار الخزانہ کی تبدیلی اور اچانک نقل مکانی سے پیدا شدہ غیر یقینی حالات نے بہت سے لوگوں کو ان کی زیر زمین مدفون دولت کو باہر نکالنے کا موقع ہی نہ دیا ہو، اور وہ دولت آج تک زیر زمین "دفینہ" کی حیثیت سے زمین کے شکم میں محفوظ ہو۔

افواہ سے حقیقت تک

ان محدود صفحات میں، نواب شجاع الدولہ کے اس الف بیلوی خزانہ کی اصل و حقیقت کا تفصیلی جائزہ لینا ناممکن ہے اور ہمارے موضوع سے علاوہ

جی ہے۔

بات چونکہ جنگی شہید کے سزا کے تبرستان سے متعلق اس لئے اس خزانہ کی اصل و حقیقت کے راز پائے سربستہ کی نقاب کشائی تاریخ کی ناقابل تردید حقائق کی ٹھوس بنیادوں پر ایک ذمہ دارانہ فرض ہے۔ ہمیں اس بات پر بڑی کوفت ہوئی ہے کہ عوام و خواص نے بلا تحقیق و تصدیق مدفون خزانہ کی افواہ کو درست اور خزانہ کی موجودگی کو حقیقت سمجھ لیا۔

اور سچ کیا ہے

آئیے جانبدارانہ اور متعصبانہ رویہ اختیار کرنے کے بجائے سنجیدگی و متانت کے ساتھ اودھ کی مستند تاریخ کتب سے کم از کم یہ تو معلوم کریں کہ بائیس یا آٹھ کروڑ سونے کے سکے کا خزانہ کبھی نواب شجاع الدولہ یا ان کے پسر بزرگوار نواب ابوالمنصور سفدر جنگ کے پاس تھا بھی؟ اگر تھا تو کیا حقیقتاً اس کی حیثیت کسی ایسے محفوظ سرمایہ *RESERVED FUND* جیسی تھی جو کسی آڑے اور برے وقت میں بھی استعمال نہیں کیا جاسکتا تھا؟ اور کیا واقعی نواب شجاع الدولہ کی بیوی ”بہو بیگم“ صاحبہ نے نواب کی وفات کے بعد انگریزوں کے لوٹ لینے کے خوف سے کسی ”محفوظ مقام“ پر دفن کر دیا تھا؟

جب ہم نوابین سلطنت اودھ کی مستند تواریخ کی ورق گردانی کرتے ہیں تو ہم پر یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ نواب شجاع الدولہ کے پاس بائیس یا آٹھ کروڑ سونے کا سکے ہونا تو بڑی دور کی بات ہے۔ آٹھ لاکھ تانبے کا سکے بھی شاہی خزانہ میں نہیں

بکسر کی جنگ ۱۷۴۳ء میں ہوئی تھی اس میں نواب شجاع الدولہ کو زبردست شکست ہوئی تھی۔ اس جنگ کے اخراجات نے نواب موصوف کے شاہی خزانہ کو خالی کر دیا تھا کیونکہ پچاس لاکھ روپیہ کے تاوان جنگ کی فراہمی کے لئے نواب موصوف نے اپنوں اور پرائیوں سب سے کہا تھا کہ اس روز سیاد میں سب ہی منہ موڑ گئے۔ کسی نے ایک پیسہ بھی نہیں دیا۔ اس آڑے وقت میں انکی بی بیابیوی امتہ الزہر (بہو بیگم صاحبہ) نے اپنا تمام نقد روپیہ، جڑاؤ زیور حتی کہ ناک کی تختہ تک نواب کے حوالہ کر دیا تھا جسے فروخت کر کے نواب نے تاوان جنگ ادا کیا۔

جب نواب شجاع الدولہ کے شاہی خزانہ کی یہ حالت رہی ہو تو پھر بائیس کروڑ سونے کا سکہ دفن کرنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے؟ شیخ تصدق حسین نے لکھا ہے کہ بکسر کی جنگ کے تاوان جنگ کی ادائیگی نے "بہو بیگم" صاحبہ کو قلاش بنادیا تھا۔ اس صورت حال کے تحت بہو بیگم صاحبہ کا اتنا عظیم الشان خزانہ دفن کرنا بعید از وہم و گمان ہے۔ اور اتنا بڑا جھوٹ ہے جو نہ زمین میں سما سکتا ہے اور نہ آسمان میں۔

۱۰۶۔ بکسر کی جنگ میں نواب شجاع الدولہ نے ۲۵ ریح ثانی ۱۱۹۰ ہجری مطابق ۲۲ اکتوبر ۱۷۴۳ء کو

شعبہ انگریزوں کے ہاتھوں شکست کھائی تھی۔ Oriental biographical Dictionary

by T. W. Beale.

۱۰۷۔ تاریخ بیگمات اودھ صفحہ ۳۵۔ انوپ گیر اور امراد گیر گوشائیں جو نواب شجاع الدولہ کے بڑے چہیتے اور معتقد تھے، بکسر کی جنگ کے بعد جب نواب کا آفتاب اقبال گہنا گیا تھا، اُس برے وقت میں یہ دونوں

کھادی ان کا ساتھ چھوڑ کر علیحدہ ہو گئے تھے۔ تاریخ اودھ لخص صفحہ ۱۲۰۹

بکسر کی جنگ کا اثر

نواب شجاع الدولہ نے اپنے پدر بزرگوار نواب ابوالمنصور صفدر جنگ کے
تقدیر کی تعمیر اور فنیس آباد میں نئی پختہ و خام عمارات کی تعمیر نیز اپنی منشی بے راہ روی
میں اپنے باپ نواب صفدر جنگ کا شاہی خزانہ تو پہلے ہی خالی کر چکے تھے۔ رہی ہی
کے بکسر کی جنگ کے تاوان جنگ کی ادائیگی نے پوری کر دیا تھا

شجاع الدولہ نواب تھے

اس الف سیلوی خزانہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ نواب شجاع الدولہ نے
رائی کبٹی سے حاصل کیا تھا۔ یہ بات ۱۷۵۹ء اور ۱۷۶۰ء کے درمیان کی ہے
۱۷۶۱ء کی سیٹائی کی کتاب میں اس حیثیت کی رائی کبٹی کا ذکر نہیں ملتا۔ چند پرگنہ
جات پر تصرف رکھنے والی ایک عورت کا اس حیثیت میں پیش کرنا ناقابل غور خیانت
ہے جس سے بے جا تعصب کی ہوتی ہے۔

اگر فاضل محققین اور معتبر دانشدار اصطلاحات کی دہوئی کی خاطر تھوڑی
دیر کے لئے مان بھی لیا جائے کہ سونے کا یہ عظیم الشان خزانہ نواب شجاع الدولہ نے
رائی کبٹی سے حاصل کیا تھا تو ذہن میں ابھرنے والے ان سوالوں کو کس جواب سے
مہم کیا جاسکے گا کہ اتنا بڑا خزانہ رکھنے کے باوجود نواب شجاع الدولہ نے بکسر کی
جنگ کا تاوان جنگ ادا کرنے کے لئے اپنی اور پرائیوں سے قرض مانگ کر اپنی
فیرت و محبت کو مجروح کیوں کیا؟ اپنی پیاری بیوی (جو بیگم صاحبہ) کی ناک کی تھک
ذوخت کر دینے کی ذات کو کیوں برداشت کیا؟ کیا نواب شجاع الدولہ نواب سے

زیادہ "بڑے بنیا" تھے کہ چڑی چلی چلنے مگر دمڑی نہ جانے پائے!
کیوں ہماری صاف گوئی سے قیامت ہو رہا

محفل یاراں سلامت ہم تو اپنے گھر چلے

۴ جون ۱۹۷۷ء کو جب نواب شجاع الدولہ کی والدہ نواب صدر جہان بیگم (نواب بیگم) صاحبہ کا تقرب ۷۵ سال کی عمر میں انتقال ہوا تو دس پندرہ لاکھ روپے سے زیادہ کا اثاثہ ان کے یہاں سے برآمد نہیں ہوا۔ حالانکہ نواب شجاع الدولہ کے اکلوتے بیٹے نواب آصف الدولہ بھی یہی یقین رکھتے تھے کہ انکی دادی کے پاس قارونی خزانہ موجود ہے۔ لیکن نواب بیگم صاحبہ کے بچے کے بعد حقیقت سامنے آئی وہ بالکل عکس قبی۔ نواب آصف الدولہ کی توقعات اور امیدوں کے بالکل غلطی۔ چونکہ اودھ اور نوابین و بیگمات اودھ سے متعلق کسی مستند علوم کتاب سے نواب شجاع الدولہ کی بیوی (بیگم) صاحبہ کے پاس کوئی عظیم الشان خزانہ ہونا ثابت نہیں ہے۔ اس لئے شکار گاہ یا اور کسی جگہ پر نواب موصوف کا خزانہ

۱۰۸ تاریخ اودھ جلد سوم

۱۰۹۔ تلک بیگمات اودھ۔ در بیان "نواب صدر جہان بیگم"

۱۔ تاریخ اودھ مولفہ حکیم مولوی غلامی راہ پوری ۲۔ تفسیر انعامین مترجمہ شریعہ مولفہ۔

۳۔ گذشتہ مکتوبہ از مولانا عبدالحلیم شرر مکتوبی ۴۔ علم از سید المصطفیٰ علی تہوں ۵۔ قیصر تہذیب

از علامہ ابن ندیم ۶۔ تاریخ دہلی جس از مولوی محمد فیض بخش کاکوروی ۷۔ فضل التواریخ از منشی اسماعیل

تہنا ۸۔ تاریخ اودھ ملخص مرتبہ ذکی کاکوروی ۹۔ بیگمات اودھ از شیخ تصدق حسین ۱۰۔ وقائع دہلی

در بعد الاصدرباط ۱۱۔ احوال و واقعات از مولوی حکیم فدا حسین قلمی ۱۲۔ نساء بیت از نواز حبیب

دفن ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ جو بک نواب تجار الدولہ کے پاس خزانہ ہونے اور نہ فونانہ کرنے کی بات کرتے ہیں یا اس بریقین رکھتے ہیں وہ محض خیر ہے۔
 — بہتہ ہو ملوں اور چائے خانوں میں بیٹھ کر وقت گزاری کرنے کا ایک بہتہ من اور دلچسپ موضوع ضرور ہے۔

جستجو بعد میں بھی غیروں کی ہو سکتی ہے

پہلے اس بھیڑ میں اپنے کو تو پاؤ لوگو

راجا گاجا شہید

جنگل شہید کے قبرستان سے پورب جانب یعنی آئی۔ ٹی۔ آئی۔ کالج سے پورب
 دو کے باغوں میں لاجا گاجا شہید کے نام سے دو قبریں مشہور ہیں جو نہایت
 قدیم ہیں اور ایک ہندو چوہترہ پر اب تک موجود ہیں۔ زمانہ ماضی میں یہاں آموں کا ایک
 بہت کھنا باغ تھا جو خود رو بھاریوں کی وجہ سے مسیب جنگل بن گیا تھا۔
 موجودہ چوہترہ کی حالت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چھ سات سو سال سے کم پرانا نہیں
 ہے۔ ۱۸۵۵ء تک یہ دونوں قبریں ایک بہت بڑے آم کے درخت کے نیچے تعمیر لیکن
 اب اس عمارت کوئی سیما پرانا درخت نہیں ہے۔ باوجودیکہ آج بھی یہ علاقہ جنگل کی طرح ہے لیکن
 فضا پر ایک عجیب سی خاموشی اور رعب سا طاری محسوس ہوتا ہے۔ اکثر اہل حدیث جمعہ

نائب سرور۔ ۱۱ حافظ رحمت خاں ایف۔ اے۔ پرنسپل میونسپل ہائی اسکول جگم اودھ۔ موداحی حاسی۔

۱۵ تاریخ صفی ردو ۱۶ دی دست نو دہس آن اودھ ازڈاکٹر آشیر وادی لال شریو استہ۔ حریف

نرمہا نی ۱۸۔ دبستان لکھنؤ ازڈاکٹر ابواللیث صدیقی ۱۹۔ سفرنامہ کرنل مسیمین وغیرہ وغیرہ

کے دن عمومی طور پر ان شہیدوں کے زیارات پر حاضر ہو کر فاتحہ خوانی کرتے ہیں اور تکمیل مراد کے لئے دعا مانگتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان شہداء کی برکت سے دعائیں شرف قبولیت پاتی ہیں۔
 راجا جہاں شہیدوں کے متعلق کسی کتاب میں کوئی ذکر نہیں ملتا کہ یہ کون لوگ تھے اور کس زمانہ میں تھے؟ ان کا مسجد یہ تھا؟ اور یہیں شہید ہوئے؟ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ سید سالار مسعود غازی رحمتہ اللہ علیہ کے زمانہ کے شہداء ہیں جنہوں نے آپ کے جہاد میں جام شہادت نوش فرمایا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

سید سالار مسعود غازی کے زمانہ کے شہداء

موجودہ آئی. ٹی. آئی. کالج کے اندر اور اس کے ارد گرد چہار طرف جو فیض آباد
 اجودھیا روڈ کے دھن جانب قبرستان ہے اُسے یہاں کے عوام زمانہ دراز سے سید
 سالار مسعود غازی رحمتہ اللہ علیہ کے زمانہ کے ان شہیدوں کے زیارات بتلاتے ہیں
 جو جہاد میں کام آئے تھے۔

متذکرہ شرک کے دھن جانب محمد اسلام انصاری کے مکان سے ملے ہوئے
 ایک مورتہ پر زمانہ قدیم کی تین قبریں موجود ہیں۔ ان کے متعلق بھی لوگ ہی بتاتے ہیں۔
 حضرت سید سالار مسعود غازیؒ کے زمانہ کے شہداء ہیں۔ مولوی عبدالغفار انصاری صاحب
 سابق پیش امام جامع مسجد بابر (اجودھیا) نے بھی ان قبور کو سید سالار مسعود غازیؒ
 کے زمانہ کے جہاد میں شہید ہونے والے مجاہدین کی قبریں بتاتے ہیں۔ مولوی صاحب
 کی عادت ہے کہ وہ معمولی باتوں کو اس قدر اہمیت دیکر بیان کرنے کی کوشش کرتے
 ہیں کہ بات سے زیادہ ان کی اپنی شخصیت کی اہمیت کا گوشہ نمایاں ہو جائے۔

موصوف نے یہاں بھی سنی سنائی "کتھاؤں" کو دستاویزی حیثیت سے پیش کرنے کی بے سود کوشش کیا ہے۔ حالانکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ وہ یہ بتلاتے کہ ان قبیلوں کو پختہ کرنے کی ضرورت اس وقت عوام کو کیوں پڑی۔ مجاہدین کے عزیز و اقارب یا اصحاب تو یہاں پر تھے نہیں، یہ جہاد فی سبیل اللہ تھا۔ مجاہدین نے فقط اللہ کی تمنا، خوشنودی کے حصول کے لئے اسکی راہ میں جام شہادت نوش کیا تھا اور ان کی تعداد بھی ایک دو میں نہیں ہزاروں میں رہی۔ یقیناً ان کی ایک بڑی تعداد گل در گل، گنج شہدائے طور پر دفن کی گئی ہوگی۔ جہاد میں شہید ہونے والے ہر شہید کے لئے ایک قبر، وہ بھی پختہ و بیل بوٹے سے آراستہ و پرآستہ بنانے کی کس کو فرصت تھی اگر چند قبریں پختہ و نمایاں ہوتیں تو یہ گمان ہو سکتا تھا کہ یہ مجاہدین کے شکر میں کسی عہد پر رہتے ہوں گے اور بعد کے لوگوں نے انکی قبروں کو پختہ کر دیا کر اپنے جذبہ عقیدت کے تحت انکی یادگار باقی رکھنا چاہو گا لیکن اتنی کثیر تعداد میں آج بھی اس مہلتہ میں پختہ قبریں موجود ہیں کہ تمام قبروں کو سید سالار مسعود غازی کے مجاہدین کی قبریں تسلیم کرنے پر آمال ہوتا ہے۔

نئی ٹی بی۔ کالج کے مشہور چھانک کے دھن جانب ڈھال پر، امرود کے باغوں کے درمیان پتھر کے ایک بورڈ پر "مسلم یتیم خانہ بڑی بوا صاحبہ روڈ" اردو اور انگریزی میں لکھا ہوا نظر آئے گا۔ اس راستہ پر آگے دھن جانب، امرود کے باغوں میں بہت سی قدیم پختہ قبریں پوشیدہ اور شکستہ حالت میں اکثر چوڑوں پر اوڑھتی سی ادھر ادھر کھیتوں اور امرود کے باغوں کے اندر نظر آئیں گی۔ اس راستہ پر تقریباً دو ڈھالی سو میٹر دھن جانب چلنے کے بعد ریلوے لائن کا پھاٹک نظر آئے گا۔

جو عموماً حادثات سے بچنے کے پیش نظر بند رہا کرتے۔ چھانٹ کے تار سے
 لیوے لائن پار کرنے کے بعد "بڑی بوا صاحبہ" کے نام سے خوب برسوں کے
 ملاقہ میں آپ آجائیں گے۔

لیوے لائن پار کرنے کے بعد ایک راستہ کھیتوں سے ہوتا ہوا سید صاحبہ صاحبہ
 مای خلد کو چلا جاتا ہے۔ دوسرا راستہ جو رلیوے لائن سے تقریباً دس بارہ فٹ
 سید صاحبہ صاحبہ جانے کے بعد پورب جانب یعنی بائیں ہاتھ کو مڑ جاتا ہے
 سب راستہ پر تقریباً بیس میٹر چلنے کے بعد مسلم یتیم خانہ بڑی بوا صاحبہ کی
 عظیم الشان عمارت ملے گی۔ اس عمارت کا صدر دروازہ پورب کی طرف ہے
 جس کے سامنے ہی حضرت بڑی بوا صاحبہ رحمۃ اللہ علیہا کی درگاہ ہے۔ مسلم
 یتیم خانہ بڑی بوا صاحبہ کے صدر دروازہ پر بائیں یتیم خانہ نام ایک سنگ مرمر
 کے پتھر پر کندہ ہے۔

چاہ صحت

مسلم یتیم خانہ بڑی بوا صاحبہ کے سامنے کے چاروں طرف کی حتماً
 بھج کے قریب ایک پائپ لائنوں میں سے ایک چاہ صحت کے نام سے مشہور تھا۔
 لوگوں کا عقیدہ تھا کہ حضرت بڑی بوا صاحبہ رحمۃ اللہ علیہا کی برکت سے اس کنویں کے
 پانی میں شفا کی تاثیر ہے۔ لوگ اکثر کہتے ہیں کہ اس کنویں کے
 پلانے کے لئے اس کنویں کے پانی لے جایا کرتے تھے۔

مسلم یتیم خانہ کے درباب محل وقوع نے بچوں کی حفاظت اور املاکی خطرات
 سے حفاظت کے پیش نظر اس کنویں کو پھوڑا دیا ہے لیکن کنویں کی پختہ اینٹوں کی

گولائی کا نشان ابھی تک نہ دیکھا ہے۔

حاجی اقبال خواجہ سرا کا مقبرہ

متم بیتیم خانہ بڑی واسعہ، حاجی اقبال خواجہ سرا کی وسیع و عریض چار دیواری
 اندر واقع ہے وسیع و عریض چار دیواری کے اندر وسطا حسن میں حاجی اقبال خواجہ سرا
 کا یہ مختلف اور عالی شان مقبرہ بنا ہوا ہے۔ اب مقبرہ کے اندر جانے کا راستہ دھن جانا
 ہے۔ یہ مقبرہ چوبیس محرابوں اور آٹھ گنبدوں کے درمیان ایک بڑے گنبد کے ساتھ
 بنا ہوا ہے اور فن تعمیر کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ مقبرہ کے اندر اس وقت تین قبریں
 ہیں جن میں بیچ والی قبر حاجی اقبال خواجہ سرا کی ہے۔ گم شدہ حالات ابودھیہ کے
 حاشیہ نگار نے لکھا ہے کہ حاجی اقبال خواجہ سرا کے مزار پر لگے ہوئے سنگ کتبہ پر یہ
 عبارت کندہ ہے۔

بسم الله الرحمن الرحيم

کل من علیہا نان ویسقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام

۱۱۱۔ تاریخ گم شدہ حالات ابودھیہ صفحہ ۴۔ یہ مولوی عبد الغفار صاحب نے لکھا ہے کہ حاجی اقبال

خواجہ سرا نواب سعادت علی خاں کے زمانہ کے مجتہد امیر ہیں سے تھے جو بالکل غلط ہے۔ نواب سعادت

علی خاں ۱۲۱۱ھ تا ۱۲۹۶ھ، بغایت ۱۲۰۹ھ تا ۱۲۱۲ھ ۱۲۱۳ھ ۱۲۱۴ھ اگر مولوی شمس

پنے پردیس کے کسی اسکول میں پڑھنے کے سہ علم کرتے تو وہ انہی بتاتے۔ یہ نواب شجاع الدین کے

دور حکومت کا ہے۔ اس لیے حاجی اقبال خواجہ سرا نواب سعادت علی کے مزار میں ہو ہی نہیں سکتے۔

تاریخ وفات خان مغرت نشان حاجی اقبال فی شہر ذی قعدہ ۱۳۵۲ ہجری قمری
تقریباً ڈیڑھ سو برس تک یہ قبرہ بغیر خجہداشت و توجہ اس جنگل میں
پڑا رہا۔ انہیں ایام میں شہریتا کسی نے کتبہ کو اکھاڑ کر پھینک دیا۔ اس وقت سے اب تک
مزارب کتبہ ہے۔

مقبرہ کی تعمیر سطح زمین سے تقریباً تین میٹر کی بلندی پر ہے۔ سابقہ چہار دیواری
سے ملا کر اب ہر طرف کمرے اور اس کے سامنے دالان بنادیے گئے ہیں جو یتیم خانہ کے
بچوں کے ہاسٹل اور درسگاہوں کے مدرسے میں ہیں۔ ۱۹۲۴ء میں ایک ادارہ ۵۔

حاجی اقبال خواجہ سرخواب شجاع الدولہ کے عہد میں معتبر امر میں سے تھے۔ مرتف
۱۱۲۔ زمانہ انہی میں حاجی اقبال خواجہ سرکایہ مقبرہ چہار جانب سے کھلا ہوا تھا جس کے ہر جانب
اور گوشوں سے قبریں نظر آتی تھیں لیکن یتیم خانہ بن جانے کے بعد ہر چہار جانب کی محرابوں اور
گوشوں کو بند کر کے کوٹھریاں بنادی گئی ہیں اور دکن جانب کی ایک محراب میں دروازہ لگا دیا
گیا ہے جس سے قبرہ کے وسطی حصہ میں جہاں پر قبریں ہیں، اس دروازہ سے جایا جاتا ہے۔ مقبرہ
کے اندر صفائی وغیرہ کا اچھا انتظام ہے۔ مولف

۱۱۳۔ قف مقبرہ کے اندر کسی مزار کے سرانے کوئی کتبہ نہیں ہے اور نہ کوئی ایسی علامت یا
نشانی بتاتی ہے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ کتبہ اس قبر کے سرانے لگا ہوا تھا۔ مقبرہ کے
اندہ کی تینوں قبروں کی ظاہری حالت و حیثیت کو دیکھنے کے بعد یہ گمان ہوتا ہے کہ بیچ میں جو
قبر دیگر قبروں سے زیادہ نمایاں ہے، اسی کو حاجی اقبال خواجہ سرکایہ مقبرہ ہونا چاہئے۔ واللہ اعلم
بالصواب۔۔۔۔۔ مولف

یہ مقام موجود حیات شہر میں ۲۱ اپریل ۱۹۴۲ء مطابق ۱۵ ذی قعدہ ۱۳۵۲ ہجری روز شنبہ کو ہوا تھا۔

مولف

”مجلس ایک آنہ فنڈ نے فیض آباد شہر سے چار میل، تقریباً چھ کیلو میٹر پورب حاجی اقبال خواجہ سرا کے اس مقبرہ میں ایک اسلامیہ مکتب اور یتیم خانہ قائم کرنے کا پروگرام مرتب کیا لیکن اس وقت یہاں رہائش اور درگاہ کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔

مسلم یتیم خانہ بڑی بوا صاحبہ

اسی سن میں شہر اجودھیا میں ہندو مسلم ہنگامہ ہوا۔ جس میں اکثر شہر مسلمان شہید ہوئے تھے۔ اس ہنگامہ میں شہید ہونے والے مسلمانوں کے وارثان کو حکومت برطانیہ کی طرف سے جان کا معاوضہ ملا تھا۔ معاوضہ یا خون بہا پانے والے بعض لوگوں نے معاوضہ کی رقم کو ”مجلس ایک آنہ فنڈ“ فیض آباد کو دیدیا اور ۱۹۲۰ء میں اس مسلم یتیم خانہ کی جڑ پھیلی، مگر تیسری ہوئی تھی وہ کسی مادی خوں بہا کی رقم سے ہوئی تھی۔ یتیم خانہ کی ایک تہائی مغربی اور مکمل جنوبی چہار دیواری کے سہارے جو پختہ عمارت آج ہماری نگاہوں کے سامنے ہے وہ بس اسی خوں بہا کی رقم سے تعمیر ہوئی ہے۔ جنوبی دریں گاہ بہہ جو تار یعنی قطعات لکھے ہوئے ہیں ان میں سن تعمیر کے ساتھ اس خوں بہا کی رقم کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

اول ہوا جو عرف عمارت پر روپیہ
وہ تھا اجودھیا کے شہید و نکاح خوں بہا

مسلم یتیم خانہ بڑی بوا صاحبہ میں غریب و نادار بچوں کے قیام و طعام اور لباس و علاج معالجہ کے بندوبست کے ساتھ ان کی دینی و دنیوی تعلیم کا بھی مکمل اور باضابطہ

انظام ہے۔ اٹھارہ سال تک کی عمر کے بچوں کی تعلیم کا خرچہ یتیم خانہ ہی برداشت کرتا ہے۔ آج بھی کئی بچے اپنی اسکول، اسٹریٹ میجسٹریٹ اور ڈگری کلاسوں میں زیر تعلیم ہیں ان کی تعلیمی فیس اور دیگر تمام اخراجات کی کفالت یتیم خانہ ہی کرتا ہے۔

مسلم یتیم خانہ بڑی بوا صاحبہ کی مجلس انتظامیہ اور جنرل باڈی میں مشہور میمن آباد کے تقریباً تمام صاحب حیثیت و صاحب علم و نمایاں شخصیتیں ہیں۔ ان لوگوں کی کوششوں اور تعاون سے یتیم خانہ کی شہرت بیرون ملک تک ہے کہتے ہیں کہ یتیم خانہ میں پرورش پائے ہوئے بچے آج سعودی عرب، فلسطین، ریاستوں قطر، دوبئی، دوحہ اور ایران و عراق میں اچھے عہدوں پر فائز اور مختلف کاموں میں لگے ہوئے ہیں اور اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔

بچوں کی نگہداشت اور ان کی فطرت کے عین مطابق، ان کی دلچسپیوں کا یتیم خانہ کے ایجنار جی عبدالجبار صاحب کو وسیع تجربہ ہے جو انتہائی نظم و ضبط کے ساتھ بچوں کی ذہنی، درہمائی نشوونما کے لئے ہمہ وقت کوشاں رہتے ہیں۔

مسلمانوں کے اہلکار کے طویل زمانہ کی اس تیرہ و تار رات میں یہ ٹٹھاتی ہوئی مہم کی روشنی بھی غنیمت ہے کہ مسلم یتیم خانہ بڑی بوا صاحبہ میں داخل بے سہارا بچوں کو محض مسجد کا موزن اور امام بنانے والی، عام اسلامی مدارس و مکاتب میں مروجہ تعلیم جیسی تعلیم کا بندوبست نہیں ہے بلکہ پرانی قدروں کے بوسیدہ ڈھانچے پر نئی قدروں کی ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے باوقار اور فعال شہری بنانے کی کوشش کی جاتی ہے

یتیم خانہ میں داخل اور زیر تربیت بچوں کے لئے جو نظام الاوقات اور

دستور العمل اس وقت نافذ العمل ہے وہ جاگیردارانہ اور برٹہ دانی نظام کے تحت آج سے سیکڑوں سال پہلے اس وقت بنائے گئے تھے جب سماج پران کی مکمل رفت قوی۔ محنت کش عوام کی عزت نفس سے لطف اندوز ہونے کے لئے جاگیردارانہ نظام نے اتنے منصوبہ بند طریقے اور ذرائع رائج کر رکھے تھے کہ زندگی کا کوئی شعبہ اور گوشہ ایسا باقی نہیں رہا تھا جس سے اپنے طبقہ کی امارت کی ناش کے مواقع نہ ملتے رہے ہوں۔ درس و تدریس کے ادارے تو اس وقت اظہارِ مارت اور خودنائی کے لئے سب سے زیادہ ارزاں اور آسان میڈیا Media تھے جس جاگیردارانہ دور کے غیر سائنٹفک اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں سے محروم اصول و ضابطہ عہدِ حاضر کے فرد کی ذہنی بیداری اور جوہرِ نفس کی نشوونما کی صلاحیت نہیں رکھتے بلکہ فرد کشی کے لئے ان کی مضرت مسلم ہے۔

یتیم خانہ کی مجلسِ استقامیہ میں یقیناً کچھ ایسے باصلاحیت دانشور افراد ضرور ہوں گے جو جدید علمِ نفسیات میں فرد کی جوہرات کی عظمت اور فرد کی بدوشیہ فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے رموز و اسرار سے واقفیت رکھتے ہوں گے اور انہوں نے اس اہم گوشہ کے مضمرات پر سنجیدگی و تامل سے غور و فکر بھی کیا ہوگا۔ لیکن روایات کے خلاف اظہارِ رائے کے رد عمل کی متوقع شورش کی مقابلہ کی جرأت کے فقدان یا مصلحتِ وقت کے کسی اہم تقاضا کے تحت جو کچھ جیسے اور جس طرح بھی ہوتا چلا آ رہا ہے ٹھیک ہے۔ کی روایت کو مناسب سمجھ کر شاید خاموش رہنا ہی ٹھیک سمجھا ہو۔

اصلاحِ حال یقیناً دشوار کام ہے اور دشواریوں سے خوفزدہ ہو جانا خصوصاً

اس وقت جبکہ ملت کے بے سہارا نو بہالوں کے مفاد اور ان کے مستقبل کیلئے ہو تو زیرِ قائل ہے۔ مصلحتِ وقت کے تقاضے تو زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ لمحہ بلمحہ بدلتے رہتے ہیں ان بدلتے ہوئے حالات کے تحت ملت کے بہی خواہوں پر اصلاحِ حال کی ذمہ داریاں اور بھی زیادہ اہم اور شدید ہو جاتی ہیں

کچھ اور مقابر

جامی اقبال خواجہ سرا کے مقبرہ کے ساتھ ہی قنورے قنورے فاصلہ پر ایسی طرزِ تعمیر کے چار مقبرے اور تھے جن میں فی الوقت تین مقبرے انتہائی خستہ اور منہدم ہو جانے کی حالت میں موجود ہیں۔ ایک مقبرہ تو یتیم خانہ دہلوی بھی دہلوی کے دہلوی کوٹے پر تقریباً بیس میٹر کے فاصلہ پر کھیتوں میں موجود ہے۔ امید ہے کہ آنے والے چند سالوں کی بارشیں اسے زمیں بوس کر دے گی۔ دوسرا مقبرہ نواب جعفر حسین خان دکن باری تعالیٰ قبرستان دہلوی تر بنو قدس بہتر ہے۔ یہ مذہبوں کی اسکی نگہداشت پر اب توجہ دی جانے لگی ہے۔ یہ مقبرہ فی الوقت امرودوں کے باغ کے اندر ہے۔ باغ دار، عموداً مقبرہ کے اندر ہی رہتے ہیں۔ اس مقبرہ میں دو قبریں۔ پہلی قبر جو پورب جانب ہے اسپر یک سرخ پتھر کا کتبہ لگا ہوا ہے اور عربی خط تحریر کے آخر میں (نیچے) صاحب قبر کا سن وفات ۱۱۸۳ ہجری کندہ ہے تیسرا مقبرہ موجودہ آئی ٹی آئی کالج کے پورب، فیض آباد اور دھیاروڈ پر اب ٹرک واقع ہے۔ اور اول الذکر مقبرہ کے مثل خستہ حالت میں ہے۔ لیکن اسے زمیں بوس ہونے میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔ کیونکہ یہ مقبرہ یتیم خانہ بڑی بوا صاحب کی انتظامیہ

کی نگرانی میں ہے۔ اس لئے عام غریبی سرگرمیوں سے بہت بڑی حد تک محفوظ ہے۔
دوسرے سطح زمین سے بلند مقام پر واقع ہے۔

اس مقبرے میں ایک پختہ قبر اب تک موجود ہے جس کے سر پر ایک واضح تیسرے کا
نشان بنا ہوا ہے جسکی نوک شمال کی طرف ہے۔ جو مینہ طرز پر کوئی اشارہ ہے۔

ایسا ہی اشارہ "بی ایک بوسیدہ اور نسبتاً قبر گنبد بخشی بابا کے قبرستان میں" اثر
جانب کرارہ پر گزشتہ دنوں (جولائی، ۱۹۶۱ء) مولف نے دیکھا تھا جس کے بارے میں
اکثر لوگوں نے بتلایا تھا کہ اب سے تقریباً ساٹھ، ستتر سال کا زمانہ گزرا ہوگا کہ بنجاروں
کے ایک قافلہ نے اس قبر کے نزدیک ہی سے دفینہ نکالا تھا۔ مولف اس قبر اور مینہ مقام
دفینہ کو بغور دیکھنے و سمجھنے کے بعد پیمائش کر کے اس نتیجہ پر پہنچا کہ جتنی قبر کی لمبائی تھی
تقریباً اتنے ہی فاصلہ کے بعد مقام دفینہ تھا۔

اس تیسرے مقبرے سے چند میٹر کے فاصلہ پر ب جانب ایک قدیم مسجد کے
باقیات اب تک موجود ہیں لوگ اعتماد کے ساتھ بتلاتے ہیں کہ جس وقت صاحب گنج محلہ
کے سیٹھ صاحب دین بیٹا رام جی اپنی اس مقبوضہ اراضی کا احاطہ تعمیر کر رہے تھے اس
وقت مذکورہ بالا مسجد کے صحن کا کچھ مشرقی حصہ بھی کھدوا دیا تھا۔ اس کھدائی میں مسجد کے
صحن کے نیچے انہیں سوئے پٹھان دی کے سکوں سے بھری ہوئی ایک دینغلی تھی (والہم
بالصواب) اب بھی مسجد مذکورہ کے صحن تقریباً نصف سے زیادہ باقی بچا ہوا ہے (والہم
بالصواب) سیٹھ صاحب دین بیٹا رام جی کے اندراب بھی موجود ہے۔

"مقبورہ سے ملحق مسجد کے صحن سے دفینہ برآمد ہونے کی افودہ" میں کچھ بھی حقیقت
ہے تو مقبرہ کے اندر موجود قبر کے اوپر سر پرانے کی طرف مینہ طرز پر تیسرے کے نشان کو بے معنی

نہیں سمجھا جاسکتا۔ مذکورہ قبر کی لبائی تقریباً ساڑھے چھ فٹ ہے۔ اس قبر سے پیدھے
اُتر جانب تقریباً اتنے ہی فاصلے کے بعد مقبرہ کی گیلری میں کسی انشائے راز کو بعید اند
امکان نہیں قرار دیا جاسکتا۔

مقبرہ کی پورب اور دکھنی گیلری کا فرش اکھڑ چکا ہے۔ اس سے کسی "انشائے راز"
کا اشارہ نہیں ملتا۔ لیکن شمالی گیلری کے فرش میں باوجودیکہ بہت سی دراڑیں چڑھکی ہیں
اور جگہ جگہ بے چٹخ بھی گیا ہے تاہم قد سے بہتر حالت میں ہے۔

شمالی گیلری کا فرش اب تک کیوں خراب نہیں ہوا؟ جبکہ خرابی کے اسباب ہر چہ بار
جانب تقریباً یکساں سے رہے ہیں۔ کیا اس جانب کا فرش کچھ زیادہ مضبوط بنا ہوا تھا؟
مولف کو امید ہے کہ جب کبھی مقبرہ کی شمالی گیلری کا فرش ٹوٹے گا اس وقت
"راز" کی صداقت کھل کر سامنے آجائیگی۔ فی الوقت مولف کے پاس زدت ہے "ذرائع
اور رسائل ہیں۔ اور زس کے تحقیقی مقاصد کا حاصل "حقیقت" کا اصل فیصلہ مستقبل کے
اُن خوش قسمت ہاتھوں کے سپرد ہے جنہیں منشاء قدرت نے اس کیلئے منتخب کیا ہے۔"

نوٹ: گذشتہ ۹ ستمبر ۱۹۷۲ء کو مولف کے ایک شناسا مسٹر نثار احمد صاحب نے خط کے
ذریعہ مطلع کیا کہ گذشتہ دنوں کچھ لوگوں نے آئی۔ ٹی۔ آئی۔ کالج کے پورب جانب اب ٹرک
واقع مقبرہ کی شمالی گیلری کا فرش توڑ کر کتاب شہر اولیا میں تحریر صداقت کا راز "معلوم
کرنے کی کوشش کیا تھا۔ چونکہ ابھی گڈھا بند نہیں ہے اس لئے آپ بھی آکر دیکھ لیں
۔۔ چنانچہ میں نے ۱۱ ستمبر ۱۹۷۲ء کو اتوار کے دن نثار احمد، محمد شفیق اور دوسرے بہت
سے لوگوں کے ہمراہ متذکرہ مقبرہ کی شمالی گیلری کے ٹوٹے ہوئے فرش اور گڈھے کو درجواب
مٹی سے بند کر دیا گیا تھا، دیکھا گڈھا تیسرے تہی دوری پر کھودا گیا تھا جتنی دوری کا اندازہ

مولف نے کتاب شہزادہ میں کیا تھا۔

چونکہ اس وقت گڈھے کو مٹی سے بند کیا جا چکا تھا۔ اس لئے لوگوں سے اس سے متعلقہ جو تفصیلات معلوم ہوئیں وہ یہ سب کہ گڈھے کے وسط میں گیری کے فرش سے تقریباً دو فٹ نیچے سب سے کا ایک پائپ لگا ہوا تھا جو تھپا ایک اینٹنی گولڈی میں تھا گڈھا کھودنے والے پائپ کو سمجھاں کر گڈھا کھودتے رہے تقریباً ساڑھے چار فٹ کی گہرائی تک کھودنے کے بعد پچھم جانب انھیں ایک دروازہ کا ادھر ہی متعین نظر آیا۔ کھودنے والے محنت سے مٹی ہٹاتے رہے۔ ابھی ایک باتھ سے کم ہی دروازہ معلوم ہونے پایا تھا کہ صبح کے اندر نمودار ہوئے۔ اور سڑک پر لوگوں کی آمد رفت ہو جانے کی وجہ سے لوگ جلدی میں گڈھے کو بغیر بند کئے ہوئے ہی وہاں سے ہٹ گئے۔

چونکہ یہ مقبرہ مسدود تھا۔ خانہ بڑی بڑی مجلس انتظامیہ کے زیر نگرانی رہا۔ جب متعین کو اطلاع ہوئی تو انھوں نے اگر گڈھے کو مٹی سے بند کر دیا۔ اس جگہ کے رات بتلاتے ہیں کہ رز کی مخافت کیلئے انتظامیہ نے رات کو رکھوا کر کہنے کیلئے ایک شخص کو لازم رکھ لیا ہے۔ تاہم کوئی شخص کھانڈ نہ کرنے پڑا۔

محل لوگوں نے موافق کو یہ بھی بتایا کہ یہ بات اب بہت عام ہو چکی ہے ورنہ انھیں متعین میں سے ہی لوگوں کے منہ میں پانی آ رہا ہے۔

۱۱۸۳-۱۱۸۵ ہجری مطابق ۱۷۶۹-۷۰ء۔ یہ مقبرہ بھی نواب شجاع الدولہ کے عہد حکومت میں تعمیر ہوا یہ مقبرہ بھی حاجی اقبال خواجہ سز کے مقبرہ کی طرح پتلی زلاب درجے کے کسی امیر یا مقرب کا ہونا چاہئے۔ نہیں باہری مزاروں اور چار اندر دلی مزاروں پر ایک بڑے بڑے کے ساتھ یہ مقبرہ بنا ہوا ہے اور طرز تعمیر بھی مقبرہ حاجی اقبال کے مقبرہ کے مثل ہے۔ — مولف

کیا یہ بے معنی ہے

جو تھے مقبرہ کے متعلق اکثر لوگوں نے بتایا کہ حاجی اقبال خواجہ سرا کے مقبرہ کے پچھم، اول الذکر مقبرہ کے الٹا سلسلے تقریباً تین سو میٹر کے فاصلہ پر واقع تھا۔ مگر جو تھے مقبرہ کی جگہ اب کھیت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اسس مقبرہ کے قریب زمانہ ماہ کی جو قدیم مسجد تھی وہ اب خستہ حالت میں موجود ہے۔ کچھوروں اور آموں کے درختوں کے باغ وغیرہ کی موجودگی اور محل وقوع کے اعتبار سے اس کے قریب کہیں "مقبرہ" کا ہونا بے بنیاد بات نہیں معلوم ہوتی۔

آج اس مقام کو کتنا ہی غور و فکر کے ساتھ دیکھا جائے پھر بھی مقبرہ کی جگہ متعین کرنا قطعی محال ہے کیونکہ جس جگہ یا مقام پر لوگ مقبرہ ہونا بتلاتے ہیں وہ مقام اب کھیت میں تبدیل ہو گیا ہے اور ارد گرد نہ کہیں لمبہ کا نشان ہے اور نہ ایسے آثار و باقیات ہیں

ان چاروں بھوٹے مقبروں کے بارے میں جو حاجی اقبال خواجہ سرا کے عظیم الشان مقبرہ کے قریب میں ہیں، مولف کو کوئی دستاویزی معلومات نہ حاصل ہو سکیں۔ تاہم دوسرے مقبرہ کے اندر جو وقف باری تعالیٰ قبرستان کے اندر واقع ہے اس کے اندر قبر پر لگے ہوئے سنگی کتبہ کے سن وفات (۱۱۸۳ھ) کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ یہ تمام مقبرے حاجی اقبال خواجہ سرا کی موت کے بعد دیگر امرار نے یا ان کے وارثان نے اپنی دولت و ثروت کے مظاہرہ کے لئے تعمیر کرائے

ہوں گے کیونکہ حاجی اقبال خواجہ سرا کی وفات کا سن ۱۱۷۴ھ ماہ ذیقعدہ (یعنی جون ۱۷۶۱ء) ہے۔ اور متذکرہ دوسرے مقبرے میں دفن شخص کا سن وفات ۱۱۸۳ھ ہجری

یعنی دونوں اصحاب کی وفات کے درمیان نو سال کا وقفہ ہے۔
ان مقابر میں کون کون سی شخصیتیں دفن ہیں؟ اس کے متعلق کوئی معلومات نہ حاصل ہو سکی۔ البتہ حاجی اقبال خواجہ سرا کے متعلق یہ معلومات ضرور ہو گئی کہ موصوف نواب شجاع الدولہ کے عہد حکومت میں ان کے معتد امرائوں سے تھے اور دنیوی جاہ و جلال سے آراستہ و پیراستہ شخصیت تھی۔ سنت و الجماعت سے ہونے کے باوجود مذہب امامیہ کی طرف بظاہر زیادہ رجحان تھا لیکن "کھلے شیعہ" نہ تھے اور نہ اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے۔

دوسرے چاروں مقابر کے متعلق گمان ہے کہ یہ بھی نواب آصف الدولہ کے شجاع الدولہ کے عہد حکومت کے امرائوں و سار کے ہی ہوں گے۔ کچھ لوگ عدم تعینیت کی بنا پر انہیں کسی بزرگ دین کے مقابر سمجھتے ہیں لیکن وہ غلطی پر ہیں بہر حال ان چاروں مقابر کے تعمیر کرانے والوں اور ان کے اندر مدفون لوگوں کے حالات فراموشی کے اندھیروں میں ضم ہو چکے ہیں۔

مسجد حاجی اقبال خواجہ سرا

مسلم یتیم خانہ بڑی بوا صاحبہ کی عمارت کے اندر، حاجی اقبال خواجہ سرا کے مقبرہ کے پچھم جانب ایک وسیع و عریض، نہایت عالیشان مسجد ہے۔ اس مسجد

کا صحن کافی کشادہ ہے۔ مسجد کے باہری حصہ میں، وسطی محراب کے اوپر ایک سنگی کتبہ لگا ہوا ہے۔ جو کافی بلند سی پر ہونے کی وجہ سے صحن پر ٹھہ نہیں سکا۔

مسجد مذکور کے دکن جانب ایک کنواں ہے جس کا پانی زمانہ ماضی میں مسجد کا حوض بھرنے کے لئے نیز دیگر ضرورتوں کیلئے استعمال کیا جاتا رہا ہوگا۔ یتیم خانہ بننے کے بعد بھی اسی کنویں کا پانی بچوں کے پینے اور دیگر تمام ضرورتوں کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے لیکن بعد کے دنوں میں ہینڈ پائپ لگ جانے کی وجہ سے اس کنویں کے پانی کا استعمال محدود ہو گیا ہے۔ اب کنویں میں بورنگ ہو چکی ہے۔ جلد ہی پانی کی ایک ٹنکی بنانے کا منصوبہ زیر غور ہے جو چالیس فیٹ بلند ہوگی۔ جب یہ واٹر ٹینک تعمیر ہو جائے گا اس وقت تعمیر شدہ فلتش پاخانوں کا استعمال شروع ہو جائے گا جو ابھی بند ہے۔ یتیم خانہ کے اندر و باہر پانی کی فراہمی کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

حوض مسجد حاجی اقبال خواجہ سرا

زمانہ ماضی میں صحن مسجد سے پورب جانب اور حاجی اقبال خواجہ سرا کے مقبرہ کے عین جانب منسوب یعنی قبرہ اور مسجد کے درمیان تقریباً بارہ مکعب ہاتھ کا ایک پختہ حوض بنا ہوا تھا جس کے متعلق اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ یہ حوض شاید مردوں کے آخری "غسل پاکی" کیلئے استعمال کیا جاتا رہا ہوگا لیکن یہ خیال محض و اہم ہے کیونکہ حوض کے چاروں طرف نالیاں بنی ہوئی تھیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ حوض صرف وضو کے لئے بنایا گیا تھا اور وضو کرنے کے لئے استعمال بھی ہوتا رہا ہوگا

۱۹۳۴ء میں جب یتیم خانہ کے لئے اس جگہ کا انتخاب کیا گیا تھا، اس وقت یہ حوض خراب ہو چکا تھا اور ایک پختہ گڑھے کی شکل میں موجود تھا۔ ۱۹۷۷ء میں اس پختہ گڑھے کو مٹی سے برابر کر کے اسپر اینٹوں کا فرش لگا دیا گیا ہے۔

اس پر شکوہ مسجد نے مقبرہ کے احاطہ کے اندر وئی ماحول میں ایک عجیب و لکشی پیدا کر دی ہے۔ مسجد میں پانچوں وقت پابندی کے ساتھ باجماعت نماز ہوتی ہے۔ نماز جمعہ کا بھی باقاعدہ اہتمام ہے۔ یتیم خانہ کے بچے اور مشطین اس مسجد میں روزانہ صبح کے وقت پابندی کے ساتھ کلام پاک کی تلاوت کرتے ہیں۔ بچوں کی تلاوت کا یہ منظر بھی بڑا روح پرور ہوتا ہے۔

مسلم یتیم خانہ بڑی بوا (رحمۃ اللہ علیہا) کے چاروں طرف میلوں کے رقبہ میں زنا ماضی میں قبرستان تھا۔ آج بھی مسجد حاجی اقبال خواجہ سرا کے پیچھے یعنی پچھم جانب ساٹھ ستر میٹر چوڑا قبرستان موجود ہے جس میں پرانے درختوں اور جنگلی جھاڑیوں کے درمیان بہت سی قدیم پختہ قبریں بوسیدہ حالت میں موجود ہیں۔

یتیم خانہ کے صدر دروازہ کے سامنے ہی پورب جانب جنگل کی شکل میں وہ قدیم قبرستان ہے جس میں حضرت بڑی بوا صاحبہ (رحمۃ اللہ علیہا) کی درگاہ واقع ہے۔ یہ وسیع و عریض قبرستان جالپائال تک چلا گیا ہے جس میں آج بھی ہزار ہا پختہ قبریں موجود ہیں۔

درگاہ حضرت بڑی بوا صاحبہ رحمۃ اللہ علیہا

مسلم یتیم خانہ بڑی بوا صاحبہ کے صدر دروازہ کے سامنے ہی تقریباً پچاس میٹر پورب جانب حضرت بڑی بوا صاحبہ (رحمۃ اللہ علیہا) کی درگاہ ہے۔ حضرت بڑی بوا صاحبہ

حضرت نصیر الدین چراغ دہلی، خلیفہ و جانشین حضرت نظام الدین اولیاء، محبوب الہی (رحمۃ اللہ علیہ) کی ہمیشہ معظمہ میں۔ آپ اپنے وقت کی زاہدہ و عابدہ خاتون تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل بیکراں سے آپ کو نوازا تھا اور روحانیت کے عظیم مراتب عطا فرمائے تھے۔ اس وقت کے بڑے بڑے علماء و مسلمان آپ کی عظمت و بزرگی کے سبب احترام کرتے تھے۔ اور آپ کے ظاہری و باطنی کمالات کے معترف تھے۔ آپ عبادت و ریاضت، خدا ترسی و فیض رسانی اور خود و سخا میں دور دور تک مشہور تھیں۔

آپ کی درگاہ کے چاروں طرف آج بھی ہزار ہا پختہ و خام قبریں موجود ہیں۔ جو زمانہ قدیم کی ہیں۔ ان قبروں میں بہت سی قبریں عام لوگوں کی ہیں جنہوں نے حضرت بڑی بوا صاحبہ (رحمۃ اللہ علیہا) کی عظمت و بزرگی کی برکت کے خیال سے آپ کے مزار کا قرب حاصل کرنے کے لئے مدفون ہونے کی وصیت کیا تھا یا ان کے وارثان نے اسی عقیدت کے تحت آپ کے قرب میں دفن کرایا۔ یہ تمام علاقہ آج تک "بڑی بوا" کے نام سے مشہور ہے۔ یونٹو لوگ روزی زیارت و فاتحہ خوانی کے لئے آپ کے آستانہ پر آتے رہتے ہیں لیکن جمعرات کے دن عموماً لوگوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔

مرمت درگاہ بڑی بوا صاحبہ

مولوی عبدالغفار انصاری اودھی نے اپنے دادا مولوی عبدالکریم انصاری اودھی مرحوم کی یادداشتوں کے سہارے جو کتاب ۱۹۲۵ء کے درمیان مرتب کیا تھا، اس کے صفحہ ۷ پر لکھا ہے کہ بہت عرصہ گزرا کہ واجد علی خاں ناظم سلاطین نے درگاہ کی مرمت کرا دی تھی کیونکہ ان کے مرشد حافظ محرم علی صاحب نے اسکی ہدایت اور تاکید فرمایا

تھا۔ اس کے بعد فقیر آباد شہر کے ایک سوداگر شیخ رمضان علی نے بھی از سر نو مرمت کرائی تھی اب ۱۹۰۰ء میں گوگل بھون، اجودھیا کے مہنت شری منگل داس جی نے بڑی بوا صاحبہ کی درگاہ کی چار دیواری اور فرش وغیرہ کے پلاٹر کو جو کافی بوسیدہ ہو چکا تھا، اسکو از سر نو سینٹ سے پلاٹر کرا دیا ہے۔ لوگ بتلاتے ہیں کہ مہنت جی کو حضرت بڑی بوا صاحبہ (رحمۃ اللہ علیہا) سے بڑی عقیدت ہے اور وہ کشتہ فیوس و برکات کے لئے آستانہ پر حاضری دیتے ہیں۔

بڑی بوا صاحبہ کی توجہ کا اثر

مسلم یتیم خانہ بڑی بوا صاحبہ کے ذمہ داروں احمد اجودھیا و شاہجہانپور و بہادر گنج وغیرہ محلوں کے بہت سے ہندو مسلمانوں نے، جو ابھی بقید حیات ہیں اور صحت و تندرستی اور ہوش و حواس سے درست ہیں، بتلاتے ہیں کہ مسلم یتیم خانہ قائم ہونے سے پہلے اور کچھ عرصہ بعد تک بڑی بوا صاحبہ کے علاقہ میں ہندوؤں کا رات نہا انکی کثرت نے یتیم خانہ میں رہنے والوں کا عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا ان کے لئے نہ کھانا پکانا اور نہ کھانا کھانا ہی دشوار تھا بلکہ یتیم خانہ کی چیزیں اور بچوں کے پرے بستر و پادریں وغیرہ بھی اٹھایا اور بھاڑ ڈالنے لگے۔ بچے اور عظیمیں اس صورت حال سے مجبہ زیادہ پریشان تھے۔ کہ اچانک ایک دن رات کے وقت تمام بندروں نے بڑی بوا صاحبہ کا علاقہ کا تہلیہ کر دیا۔ اس دن سے آج تک ایک بھی بندر آ

اس علاقہ میں نہیں آیا۔ اگر کبھی کوئی بندہ بھولے بسرے اتفاقاً ادھر آ بھی
گیا تو شام ہونے سے پہلے ہی وہ اس علاقہ کو چھوڑ دیتا ہے

بڑی بوا صاحبہ کا سالانہ عرس

حضرت بڑی بوا صاحبہ رحمۃ اللہ علیہا کا کوئی سالانہ عرس
معمولاً نہیں ہوتا۔ دس پانچ سالوں کے بعد جب لوگوں کو عرس کرنے کا
خیال آتا ہے تو چند گھر کے عرس کے نام سے مراسم عرس ادا کر لیتے
ہیں۔ تقریباً دس بارہ سال کا عرصہ ہوا ہو گا جب لوگوں نے چند سے
ایک نہایت شاندار عرس کیا تھا۔ ہزاروں مردوں، عورتوں اور
بچوں کا مجمع اکٹھا ہوا تھا۔ صبح سے شام تک عرس کے مراسم لوہوتے
رہے۔ بعد نماز عشاء قوالیوں اور تقاریر کا سلسلہ شروع ہوا جو
سات بھر چلتا رہا۔ لوگ آج تک اس عرس کی بات کرتے ہیں۔

مزار الہی بخش مجذوب

گزشتہ سالات (جودھیا صفحہ ۴) میں لکھا ہے کہ الہی بخش مجذوب کی قبر حضرت
بڑی بوا صاحبہ رحمۃ اللہ علیہا کی قبر کے پاس ہے جو صحیح نہیں ہے۔ حضرت
الہی بخش مجذوب کی قبر حضرت بڑی بوا صاحبہ کی درگاہ کے پورب جانب تقریباً
پندرہ میٹر کے فاصلہ پر ایک قدیم قناتی مسجد کے باہر اتر جانب "شاہ جی کی کٹی"،
کو جانے والی پگھلڈی سے متصل ایک بوسیدہ چوترے کی شکل میں موجود ہے۔

کبھی کبھی بڑی بوا صاحب کی درگاہ کا چاروب کش جمعات کے دن اس چوترہ نما قبر
پر چادر چڑھاتا تھا۔

ابلی بخش مجذوب کے متعلق لوگوں میں مختلف روایتیں مشہور ہیں۔ کوئی دو
سوساں ۱۲ زمانہ بتلاتا ہے کوئی پانچ سو سال کا۔ لیکن قبر سے پانچ سو سال کی کہنگی
ظاہر نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ بعد کے زمانوں میں کسی نے اس کی مرمت کرا دیا

ہوئے

ابلی بخش مجذوب کے بارے میں علاوہ مولوی عبد الغفار صاحب انصاری کی
کتاب کے کسی کتاب میں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ پتہ نہیں کہ مولوی صاحب
نے کہاں سے اور کس سے سن سنا کر اپنی کتاب میں ایک مزید نام کا اضافہ
کر لیا۔ نہ ابلی بخش مجذوب کا زمانہ لکھانہ حالات لکھے اور سلسلہ کا ذکر کیا
سینہ بسینہ چلی آنے والی روایات کے بموجب آپ کا زمانہ حضرت بڑی بوا
صاحبہ سے بعد کا زمانہ لوگ بتلانے میں کہتے ہیں کہ آپ اسی جنگل میں گھوما
پھر کرنے گئے۔ اور غموں اور وقت آپ پر حالت جذب طاری رہتی تھی جو کچھ

۱۱۸۔ بسم اللہ شاہ صاحب محلہ شاہ پور کے رہنے والے اور درگاہ بڑی بوا صاحبہ
کے خادم ہیں انھوں نے اپنے بیٹے کے لئے درگاہ بڑی بوا صاحبہ کے پورب ایک
کوٹھری بنائی ہے جسے لوگ شاہ جی کی کٹھن کہتے ہیں اسی کٹھن میں وہ بیٹھتے ہیں اور حاجتمند
لوگ خصوصاً عورتیں ان کے پاس آکر اپنے مقصد کی برائری کے لئے توہید اور گنڈے وغیرہ
دیتے ہیں۔ روزانہ دس بیس لوگ آپ کے پاس دعا توہید کیلئے آنے رہتے ہیں۔ — مؤلف

زبان سے کہہ دیتے تھے وہ عموماً ہو جایا کرتا تھا۔ لوگ اکثر آپکو تلاش کرتے ہوئے
 اسی جنگل میں آپکی خدمت میں حاضر ہو کر دعاؤں کی درخواست کرتے تھے۔
 کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر کسی ناپاک عورت کا دامن یا اس کے جسم کا
 کوئی کپڑا کسی طرح آپ کے مزار سے چھو جائے تو اس کے کپڑوں میں آگ
 لگ جاتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تین بزرگوں کی قبریں

حضرت بڑی بوا صاحبہ کی درگاہ کے اتر جانب تقریباً دو من میٹر کے
 فاصلہ پر مشرقی گوشہ میں ایک قدیم چوتراہ پرچی قدامت کا اندازہ سیکڑوں
 سال سے کم نہیں کیا جاسکتا۔ تین بوسیدہ قدیم قبریں ہیں جو تقریباً ایک فٹ
 اونچی دیوار سے گھری ہوئی ہیں۔ ان قبروں کے بارے میں بھی لوگوں کی مختلف
 روایات ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ اپنے خاندان کے بزرگوں سے سننے
 چلے آ رہے ہیں کہ یہ قبریں تین رفیق بزرگ اصحاب کی ہیں جو ہمیشہ ایک ہی تھا
 رہتے تھے۔ اور مرنے کے بعد تینوں بزرگوں نے بموجب وصیت ایک ہی
 جگہ دفن ہوئے لیکن دوسرے لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ عام لوگوں کی قبریں
 ہیں جو اپنے زمانہ میں صاحب حیثیت اور بااثر افراد تھے۔ یہ تینوں قبریں
 ایک ہی خاندان کے افراد کی قبریں ہیں جو حضرت بڑی بوا صاحبہ (رحمۃ اللہ علیہا)
 کی عظمت و بزرگی کے لئے قرب میں بنوائی گئی تھیں۔۔۔

غیر معرود مقبرے

درگاہ مذکور کے اتر جانب مغربی گوشہ میں جو آستانہ بڑی ہوا سے تقریباً
دس میٹر کے فاصلہ پر "تالاب" کے کنارہ پر ایک خستہ حال مقبرہ ہے جس میں
اب قبروں کا نشان بھی معدوم ہو چکا ہے۔ اس مقبرہ سے متصل پچیم جانب ایک
دوسرا مقبرہ بھی ہے جو مذکور الصدر مقبرہ کی طرح انتہائی خستہ حالت میں ہے
اس مقبرہ میں بھی قبروں کے نشان معدوم ہو چکے ہیں۔ کوئی بھی شخص یہ بتانے
والا نہ مل سکا کہ یہ مقبرے کن لوگوں کے ہیں؟ یا ان میں کون لوگ آرام فرما رہے
ہیں؟۔

ان دونوں مقبروں کے طرز تعمیر سے اندازہ ہوتا ہے کہ انکی تعمیر کا زمانہ
تقریباً ایک ہی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ دونوں مقبرے ایک ہی خاندان
کے ذی اثر افراد کے ہوں۔
بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ مقابر بزرگوں کے ہیں لیکن مؤلف کو اسکی صحت
میں تاں ہے۔ ان مقابر کو غور سے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حاجی اقبال
- خواجہ سر کے مقبرہ بننے سے پہلے کے ہیں۔

تالاب حاجی اقبال خواجہ سرا

حضرت بڑی ہوا صاحبہ درجۃ اللہ علیہا کی اتر جانب اتر جانب چند میٹر
کے فاصلہ پر ایک بہت بڑا تالاب ہے جو زمانہ ماضی میں کافی گہرا رہا ہوگا قیاس

ہے کہ یہ تالاب حاجی اقبال خواجہ سرا کے مقبرہ بنانے کے زمانہ میں مٹی نکلوانے کی وجہ سے بن گیا تھا۔ فی الوقت یہ ایک وسیع و عریض گڑھے کی شکل میں موجود ہے۔ اب سے سیکڑوں سال پہلے یہ کافی گہرا رہا ہو گا لیکن اب پٹ چکا ہے بارش کے دنوں میں جب اس میں بارش کا پانی جمع ہو جاتا ہے۔ تو واقعی ایک خوب صورت تالاب بن جاتا ہے۔ بارش کے مہینے میں اس تالاب میں دھان کی کاشت ہوتی ہے۔ اور ماہ نومبر تک جب اس تالاب کا پانی خشک ہو جاتا ہے اس وقت اس میں گہیوں کی کاشت اُگائی جاتی ہے۔

منار لین والے بابا

اس تالاب کے اتر جانب اور درگاہ حضرت بڑی بوا صاحبہ کے تقریباً بالکل سربانے قدر سے پورب جانب ایک پختہ اور بلند چوترہ پر نیم گرد خست کے نیچے مین قبریں ہیں جنہیں آجکل لوگ لین والے بابا یعنی ریلوے لائن کے پاس والے بابا کے نام سے پکار رہے ہیں۔

مولوی عبدالکریم انصاری اودھی مرحوم نے لکھا ہے کہ یہ تمام قبریں زمانہ سلف سے ”گنج شہداء“ کے نام سے مشہور چلی آتی ہیں اور یہ شہداء زمانہ قدیم سے صاحب کرامت مشہور ہیں

جس زمانہ میں مولوی مراد اللہ صاحب بہرائچی، خلیفہ مولانا نعیم اللہ صاحب بہرائچی، فیض آباد کی مسجد ٹاٹ شاہ کے حجرہ میں مفیم تھے ہمیشہ حجرات کے دن فیض آباد سے فاتحہ خوانی کے لئے اس جگہ پر آتے تھے اور فیض حاصل کرتے

تھے۔

اب بھی جہرات کے دن لوگ اس چوترہ پر مزارات کی زیارت و دفن خوانی کے لئے آتے ہیں اور فیوض و برکات حاصل کرنے ہیں۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ مزارات سید سالار مسعود غازی کے جہاد میں شریک ہونے والے مجاہدین کے ہیں۔

ان شہداء کی کرامت کے واقعات

۱۱۱۔ تاریخ پارسہ مدینہ الاولیاء میں مرقوم ہے کہ ایک مرقبہ فیض آباد میں کچھ مخالف لوگوں نے مولوی سید مراد اللہ پیرا کچی کو جو مسجد ٹاٹ شاہ کے حجرے میں رہتے تھے بے عزت کرنے کا منصوبہ بنایا اور ایک ہجوم اکٹھا کر کے مولوی صاحب کی بے عزتی کے واسطے اس نازک اور مصیبت کے وقت میں ان شہداء نے ظاہری صورت اختیار کر کے مولوی صاحب کی مدد کیا اور تمام مخالف ہجوم کو درہم برہم کر کے منتشر کر دیا۔ مشہور ہے کہ مولوی صاحب خود بھی صاحب کشف و کرامات تھے۔

معبر اشخاص کی زبانی سنی ہوئی یہ روایت بھی نقل کی گئی ہے کہ جس وقت مخالف ہجوم نے مولوی صاحب کو زرخ میں لے لیا تھا میں اسی وقت دو اجنبی خوبصورت نوجوان اس ہجوم میں آگئے جو ہتھیار سے لیس تھے۔ انہوں نے مجمع کو منتشر کر کے بھگا دیا۔ لوگ یہ بھی بیان کرتے تھے کہ ان خوبصورت نوجوانوں کو نہ تو کسی نے آتے دیکھا اور نہ کسی نے انہیں جانے دیکھا۔ کبھی کسی نے مسجد میں انہیں نماز پڑھنے

کے لئے آنے دیکھا تھا۔ اور نہ مولوی صاحب کے پاس آنے والے لوگوں ہی میں سے وہ لوگ تھے۔

ہجوم منتشر ہو جانے کے بعد کسی نے مولوی صاحب سے دریافت کیا کہ یہ نوجوان لوگ کون تھے؟ جنہوں نے مجمع کو درجہ بدرجہ کر دیا تھا؟ ہم نے نہ کبھی انہیں مسجد میں دیکھا تھا۔ اور نہ یہ لوگ آپ کے پاس آنے جانے تھے؟۔ اس پر مولوی صاحب نے کہا تھا کہ یہ وہ شہداء تھے جن کے مزار پر میں ہر جمعرات کو فاتحہ خوانی کے لئے جاتا ہوں۔

۲۔ اس چوترہ پر مدفون شہداء کا ایک دوسرا واقعہ، جس کے جاننے اور اور دیکھنے والے اب بھی بقید حیات ہیں، یہ ہے کہ جس وقت اجودھیا ریلوے لائن بننے والی تھی اور لائن کی پیمائش کا کام ہو رہا تھا اس دوران اس شہداء کا چوترہ جس پر ان کا مزار ہے، ریلوے لائن کے درمیان آگیا تھا۔ لوگ بتلانے میں کہ ریلوے لائن بنانے کی جھنڈی جس وقت چوترے پر گاڑی گئی اور اسے کھودا جانے لگا اس وقت عجب قیامت کا منظر آیا تھا چار مزدوروں کی اسی جگہ فوری موت ہو گئی۔ اور ایک کھرام بچ گیا۔ ریلوے انجینئرز نے اس جگہ سے ریلوے لائن لیسنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور لائن کو (ترکی طرف کھانکر لیجانا طے کیا اور قبر کے اس چوترہ کو کافی مضبوط اور خوشنما بنادیا جو اب تک موجود

۱۱۹۔ ریلوے لائن بچا ہے والی سڑک جو پہلے بنائی گئی تھی اور جس کی وجہ سے یہ حادثہ

پیش آیا تھا، اس کا نشان اب تک نہایت واضح طور پر موجود ہے جو شہداء کے اس چوترہ کے کھن

جانب سے۔۔۔ مولف

ہے۔ اکثر لوگ یہاں جمہرات کے دن فاتحہ خوانی کے لئے آتے ہیں زمانہ سابق
میں یہ علاقہ خطیرہ پیر نام سے تھا۔

اس جگہ سے موجودہ ریلوے لائن کو پار کر کے اتر جانب چلے کسی زمانہ
میں یہ علاقہ وسیع و عریض قبرستان جنگل رہا ہوگا۔ اس علاقہ میں موجودہ اونچے اونچے
دلوں ہیکل پرانے دیختوں کو دیکھنے کے بعد یہاں پر خوفناک جنگل ہونے کی
فہاس کی تصدیق ہوتی ہے۔

وقف باری تعالیٰ قبرستان

اسی جگہ ایک قطعہ زمین ہے جو جدید چار دیواری سے گھرا ہوا قبرستان
”وقف باری تعالیٰ“ ہے۔ اس قبرستان سے ہٹ کر پورب جانب ”گرکل
آپور ویدک کالج اور ادشدھالیہ ہے جو زمانہ ماضی کے وسیع قبرستان کو
ایک حصہ میں واضح ہے۔

وقف باری تعالیٰ کی ارضی پرتعلیں نے سرد در قلمی آموں کا باغ لگوا دیا ہے۔ اب دوسرا
مقبورہ وقف باری تعالیٰ قبرستان کے باغ کے وسط میں ہو گیا ہے۔
مفتعلین وقف باری تعالیٰ نے باغ کی ارضی کی آپاشی کیلئے ۱۹۸۶ء میں ایک
ٹیوب ویل لگوا دیا ہے۔ مولف:

مزار مالک شاہ مجذوب

وقف باری تعالیٰ قبرستان میں جس مقام پر اب مفتعلین نے ٹیوب ویل لگوا دیا ہے اس

ٹیوب ویل کے کمرے کی چھپی دیوار سے متصل مالک شاہ مجذوب رحمن کے نام سے منسوب
مالک شاہ کی مسجد کا ذکر گزشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ مؤلف کی کچی قبر اب تک موجود ہے
اور لوگ اس کا احترام کرتے ہیں۔

۱۸۲۰ء کی گرمیوں میں رت طرستنے کے بعد تیسرے پہاڑ مالک شاہ مجذوب کا انتقال
ہوا۔ اور صبح سویرے جب اجودھیا اور فیض آباد میں لوگوں کو اطلاع پہلی تو دونوں شہر
کی روکائی میں لوگ میں بند ہو گئے۔ شہر اور نزدیک دروس کے ہزاروں لوگ شریک جنازہ ہوئے۔
مالک شاہ مجذوب کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے؟ حسب نسب کیا تھا؟ کس سلسلہ
سے تعلق تھا؟ باوجود تحقیق ان سوالوں میں سے کسی ایک سوال کا جواب بھی نہ تو سینہ بینہ چلی
آنے والی کسی روایت سے مل سکا اور نہ کسی کتاب میں آپ کے حالات ملے۔ البتہ اس بات
پر تمام بقید حیات لوگ متفق ہیں کہ مالک شاہ مجذوب نے نہ تو کسی کو اپنا خلیفہ بنایا اور نہ اپنے
جانشین اور نہ رواج کے مطابق قبر پر جارب کشتی کیلئے کسی کو مقرر کیا اور نہ اس طسرن کی
کوئی وصیت کیا تھا۔

سنگی لوح

ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ موجودہ کالا اسپتال کے پچھلے
حصہ تک چلے تو اسپتال اور ریلوے لائن کے درمیان قدرے بلند مقام
پر ایک سنگی دہتھر کی قبر کا لوح مزار ہے جسے لوگ شہید مرد کی قبر مانتے
ہیں۔ لیکن شہید مرد کے نام اور دیگر حالات سے سب لوگ ناواقف ہیں۔
مؤلف کا قیاس یہ ہے کہ یہ قبر کسی صاحب ثروت و اثر کی ہونی چاہئے

کیونکہ یہ پتھر کی قبر اس علاقہ کی تمام قبروں سے اپنے آپ کو نمایاں کرتی ہے جبکہ نمود و نمائش سے بزرگوں کو ہمیشہ نفرت رہی ہے۔

اس قبر کے اتر جانب سڑک کی دوسری طرف جو محلہ آباد ہے اسے کتھانہ کالیستھوں کی آبادی کا محلہ کہتے ہیں۔ اس کے سامنے سے فیض آباد اچودھیا روڈ گزرتی ہے۔ اس جگہ پر کھڑے ہونے سے سڑک کے پچھم جانب کامتا پرشاد سند رلال ساکیت ڈگری کالج کی عمارت نظر آتی ہے جس کے پچھم تک جنگی شہید کے قبرستان کا علاقہ چلا گیا ہے۔ (جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں آگیا ہے)

محل شاہ باز قلندر کا چلہ

ساکیت پوسٹ گریجویٹ کالج کے پچھم اور اتر تھوڑے فاصلہ پر اچودھیا شہر کی ہیں گاہ ہے۔ اس ہی گاہ کے پچھم زمانہ سابق میں ایک پختہ چوترا تھوڑا سا لوگ محل شاہ باز قلندر کا خانہ کہتے تھے۔ چوترا کے نیچے ایک کشادہ خانہ تھا۔ اب یہ چوترا اور اس کے اطراف کی آرائشی بیراگیوں کے قبضہ میں ہے۔

مؤلف تاریخ پارینہ مدینہ الاولیاء نے لکھا ہے کہ اس چوترا کے نیچے حضرت محل شاہ باز قلندر کا خانہ ہے۔ خانہ کے اندر اس قدر روشنی آتی ہے کہ یہاں بیٹھ کر کلام پاک کی تلاوت باسانی کی جا سکتی ہے۔ اور اس کے اندر اتنی جگہ ہے کہ

۱۶۱ مولوی عبدالعزیز نے اس قبر کا نام "خطیرہ بیرو کی قبر" لکھا ہے جو انکا اینار یا ہوانام ہے کیونکہ اس علاقہ کا کوئی فرد بھی اس قبر کو خطیرہ بیرو کی قبر کے نام سے نہیں جانتا۔ مؤلف

ایک امام اور سات مقتدی باجماعت نماز ادا کر گئے ہیں۔ مذکورہ کتاب میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ یہ خانہ کے اندر مغربی دیوار میں مسجد کی حراب بنی ہوئی ہے۔

کہتے ہیں کہ حضرت نعل شاہ باز قلندر حضرت بوعلی شاہ قلندر کے خلیفہ تھے یہ خانہ آپ کی حیات ہی میں آپ کی عبادت و ریاضت اور چلہ کشی کے لئے بنایا گیا تھا۔ بعد وفات آپ کو اسی خانہ میں دفن کیا گیا۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے خادین کو بھی آپ کے پہلو میں کیا گیا۔ ۹۵-۱۸۹۰ء کے درمیان اس چوترہ کی قدامت کا اندازہ مصنف کی تحریر کے موجب پانچ سو سال تھا اور اس وقت بھی چوترہ کے اوپر قبروں کے نشان بنے ہوئے تھے۔

اس چوترہ کے پاس پہلے گھرنی اور اٹلی کے بہت پرانے اور بڑے بڑے درخت تھے۔ لیکن اس وقت اس جگہ پر نہ کوئی گھرنی کا درخت ہے اور نہ اٹلی کا۔ البتہ خود رو جھاڑیوں اور درختوں کی وجہ سے یہ جگہ آج بھی جنگل معلوم ہوتی ہے۔ چونکہ مؤلف کو یہ چوترہ اور یہ خانہ دیکھنے کا موقع نہیں دیا گیا اس لئے نہ تو چوترہ کے اوپر بنے ہوئے قبروں کے نشانات ہی کی تصدیق یا تکذیب کہی جاسکتی ہے اور نہ یہ خالوں کے اندر کی قبروں اور مغربی دیوار میں حراب وغیرہ کی موجودگی پر تبصرہ کیا جاسکتا ہے۔

نعل شاہ باز قلندر کے صحیح اور تفصیلی حالات کسی کتاب میں مؤلف کی نگاہ سے نہیں گزرے لیکن کشمیر میں اس نام کی شخصیت بہت مقبول گزری ہے ممکن ہے کہ کشمیری کے رہنے والے ہوں اور زندگی کے آخری ایام میں شہر اودھ (اودھیا) چلے آئے ہوں۔ کشمیری زبان میں انہر جو نظمیں لکھی گئی ہیں وہ آج بھی بہت مقبول

ہیں۔

اب اس جگہ سے واپس ہو کر، کالرا اسپتال، کے پاس آئے۔ اسپتال سے پورب کی طرف اجودھیا روڈ پر اجودھیا کی طرف تھوڑی دور چلنے کے بعد اپنے ہاتھ پر ٹیڑھی بازار ریلوے گمٹی ملے گی۔ اس گمٹی سے ریلوے لائن کو پار کر کے دھن جانب جانے والی سڑک پر چلے۔

بھائی خاں شہید کی درگاہ

ریلوے لائن پار کر کے دھن جانب جانے والی سڑک پر چلے راستہ میں تختی آموں کا باغ ملے گا۔ یہ باغ اب سے سو برس پہلے بھائی خاں شہید کی درگاہ کے نام سے مشہور تھا۔ اس باغ کے دھن اور کچھم جانب جوگیا، جوگی قبروں کا محلہ ہے۔ آموں کے اس باغ میں بھائی خاں شہید کی قبر اب تک موجود ہے اس قبر کے پورب جانب زمانہ ماضی میں تختی آموں کا بہت گھنا باغ تھا جس میں بابائے پختہ قبریں موجود تھیں۔ بھائی خاں شہید کا قبرستان ریلوے لائن سے ملا ہوا ہے۔ اور لائن کے دھن جانب ہے۔

جس باغ میں بھائی خاں شہید کی قبر ہے وہ زمانہ ماضی میں وسیع قبرستان تھا۔ اس میں بیشمار پختہ و خام قبریں موجود تھیں لیکن اب صرف چند ٹوٹی پھوٹی قبروں کے علاوہ اس علاقہ میں کسی قبر کا نام و نشان نہیں باقی رہ گیا ہے۔

بھائی خاں شہید کے متعلق بھی کسی کتاب یا کسی شخص کی زبان کوئی معلومت

حاصل ہو سکی اور نا ہی یہ معلوم ہو سکا کہ آپ کا زمانہ کیا تھا؟ اور کس کے تھا
جہاد میں جام شہادت نوش کیا؟ یا کسی لڑائی میں قتل ہوئے اور عوام میں
شہید کے نام سے مشہور ہو گئے۔

مزارِ لعل خاں شہید

بھائی خاں شہید کی قبر کی اتر جانب لعل خاں شہید کا مزار ہے جو اس وقت
خستہ و شکستہ حالت میں ہے آپ کے متعلق تحریر ہے کہ صاحبِ نصرات بزرگ
ہیں۔ لوگوں میں آپ کی بہت سی کرامات مشہور ہیں۔ لیکن مؤلف کو تحقیق سے نہ تو سند
مل سکی اور نہ زمانہ اور سلسلہ کا پتہ چل سکا۔ اکثر ضعیف العمر لوگوں سے بات چیت
کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً تین ساڑھے تین سو سال قبل آپ کا زمانہ رہا ہوگا
لیکن مزارات کی کمنگی اور علاقہ کی یکسر تبدیلی سے اگر چار پانچ سو سال کا اندازہ کیا
جائے تو تردید نہیں کی جا سکتی۔

درگاہ حضرت شہید علیہ السلام

بھائی خاں شہید کی درگاہ کے قبرستان کے دکھن جانب سے وہ پختہ سڑک
گذرتی ہے جو فیض آباد سے منی پر بہت ہوئی ہوئی درشن نگر کو چلی گئی ہے اس پختہ
سڑک پر مین بکس میٹر چلنے کے بعد تھنی آموں کے باغ کے درمیان ایک راستہ نظر
آئے گا اس راستہ پر تھوڑی دور چلنے کے بعد تلی نالہ کا پل ملے گا پل سے آگے دکھن
مات بڑھے تو بائیں ہاتھ پر درگاہ حضرت شہید علیہ السلام ملے گی۔ درگاہ کے ہر چار

جانب خصوصاً پچھم جانب آج بھی زمانہ قدیم کی ہزار ہا پختہ قبریں، شکستہ مساجد، اجاڑے
 و بوسیدہ مقابر اور برباد شدہ خانقاہوں اور مدارس کے آثار ملیں گے کے نشان
 اب تک موجود ہیں۔ درگاہ حضرت شہید علیہ السلام کے دکھن جانب ٹیلے پر اب بھی
 ہزار ہا سال کے پرانے درختوں اور دشوار گزار جھاڑیوں کے جنگل اب تک موجود
 ہیں۔ جن میں لاتعداد شکستہ و بوسیدہ قبریں، مقابر و مساجد موجود ہیں۔ درگاہ حضرت
 شہید علیہ السلام کے قبرستان کا رقبہ مولوی عبدالکریم انصاری مرحوم نے اپنی کتاب
 تاریخ پارہ نہ مدنیۃ الاولیاء میں جا میں بیکہ پختہ پچیس ایکڑ، تحریر کیا ہے لیکن فی الوقت
 اس کا رقبہ بہت ہی کم رہ گیا ہے

اس قبرستان کے جنوبی سرحد کے پاس ایک تالاب ہے جسے دشری گنیش کٹڈ
 کہتے ہیں۔ میلہ کے ایام میں اہل ہنود اس تالاب میں نہاتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ
 اس تالاب میں نہانے سے لکشی جی گنیش جی کی بیوی جو دولت کی دیوی ہیں خوش
 ہوتی ہیں۔

مساجد محمد علی گنگ

اس قبرستان کی جنوبی سرحد پر زمانہ ماضی میں سات قناملی مسجدیں تھیں اور
 ہر ایک مسجد میں ایک مزار تھی۔ اب یہ مساجد محمد علی گنگ کے نام سے مشہور ہیں۔
 فی الوقت سات مساجد میں پانچ مساجد باقی ہیں لیکن خستہ حالت میں ہیں ان میں
 کو دیکھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ایک نیا کاریگر نے ایک ہی زمانہ میں بنایا ہے۔
 مولوی عبدالکریم انصاری مرحوم نے ان مساجد کے اندر قبروں میں مدفون

لوگوں کے بارے میں لکھا ہے کہ اب سے چار سو برس کا زمانہ گزرا ہے کہ سات بھائی
 یا شخص جو ایک ہی مرشد کے مرید یا خاندان کے افراد تھے۔ تمام روئے زمین کی سیر
 کر کے جپ ہو گئے تھے۔ یہ انھیں ساتوں افراد میں ہر ایک شخص کی مزار ایک ایک
 مسجد میں ہے۔^{۱۲۲}

ہم مولوی عبدالحکیم صاحب کی دیانت اور راست بازی پر تبصرہ
 کرنا نہیں چاہتے۔ لیکن اتنا بتانے کی جرأت ضرور رکھتے ہیں کہ اب سے پانچ سو
 سال کی دنیا بہت ہی محدود تھی اور ایک سیاح کا عجائبات عالم کو دیکھ کر خاموش
 ہو جانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ سیاحت نے دنیا کی بے ثباتی اور
 ناپائیداری کی حقیقت سے اس درجہ تاثر لیا ہو کہ خاموشی اختیار کر لیا ہو اور لوگوں
 میں گنگ مشہور ہو گئے ہوں۔ مولوی صاحب مرحوم نے بھی انھیں سینہ بسینہ چلی
 آنے والی روایت کے بموجب ان لوگوں کو گنگ لکھنا مناسب سمجھا ہو
 بہر حال ان لوگوں کے متعلق بھی باوجود بسیار کوشش کے کوئی معلومات
 نہ حاصل نہ ہو سکی۔

مزار حضرت شیت علیہ السلام

حضرت شیت علیہ السلام کے مزار اور اس کے احاطہ کو سلطان سکندر لودی
 نے ۱۳۹۲ھ میں از سر نو پختہ کرایا تھا اور درگاہ کے سامنے سے بہنے والے تلمی نالہ
 پر زائراں کی آمد و رفت کی آسانی کے لئے پختہ پل تعمیر کروا کر ایک آراستہ برائے

مصارف درگاہ عطا فرمایا تھا۔"

۸۹۰ ہجری مطابق ۱۴۹۲ عیسوی میں مملکت جو پور کے سرکش زمینداروں کی نذات کو کچلنے کے لئے سلطان سکندر لودی اپنی عظیم الشان فوج لیکر دہلی سے جو پور آیا تھا۔ باغیوں کی سرکوبی کرنے کے بعد جب اسے المہینان حاصل ہوا تو اس نے ایک ماہ کامل شہر اودھ میں گزارا تھا۔

تاریخ پارسہ دینہ الدلیا میں لکھا ہے کہ بادشاہ سکندر لودی کے ہمراہ اس کے مرشد حضرت جلیل الدینہ مشیر زادہ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ ابھی تھے۔ چونکہ حضرت موصوف کو کتب نوابی سے حضرت شہید علیہ السلام کے مزار کا ذکر ملک ہند کے بلاد اودھ (اجودھیا) میں دریا دو ٹیلوں اور شمال کی جانب دریا کا ہونا ملاحظہ فرما چکے تھے۔ لہذا بادشاہ سے فرمایا کہ یہ احاطہ مہ قبر کے پختہ کرادیا جائے۔ بادشاہ سکندر لودی نے آپ کے حکم کی تعمیل کیا۔ درگاہ موصوف اور قبر پختہ کرا کے معافی بنا بر مصارف درگاہ عطا فرمایا۔

حضرت شہید علیہ السلام کا عرس ہر سال ۴۰ رجب کو لوگ کرتے ہیں۔ لوگ بیان کرتے ہیں کہ عرس میں ہزاروں مردوں، عورتوں اور بچوں کا مجمع ہوتا ہے ختم کلام مجید میں سیکڑوں لوگ شریک ہوتے ہیں۔ علماء کی تقریریں اور محفل سماع کا خصوصی انتظام ہوتا ہے۔ اجودھیا اور فیض آباد کے علاوہ قرب و نواح کے ہندو مسلمان کثیر

۱۔ تاریخ فرستہ جلد اول صفحہ ۲۰۱ مطبوعہ مہتری نوکٹر پریس لکھنؤ، پنجواں، اپریل ۱۹۳۲ء

۲۔ علاوہ مذکور بالا کتاب کے کتبہ، کتاب میں حضرت جلال الدین کا تذکرہ، مرقوم میں مولف ۱۳۳۰ھ

حضرت آدم علیہ السلام جب عدن سے نکلے تو یروشلم نہیں گئے تھے اگر کوئی کہے کہ قریب دوسو برس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کی ہڈیاں حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر لے آئے تھے دیکھو پیدائش باب ۲۶ اور خروج ۱۳ باب ۱۱۹ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول صرف یروشلم میں ایلیا کی وفات سے تعلق رکھتا ہے۔ حضرت خرقیل علیہ السلام بنی بابل میں شہید ہوئے تھے۔ اور سام ابن نوح کی قبر میں مدفون ہوئے حضرت دانیال بابل میں وفات پائی۔ حضرت برصباہ مصر میں مقتول و مدفون ہوئے اور عرصہ دراز کے بعد سکند اعظم نے اسکندریہ لیجا کر دفن کیا تھا۔

صاحب تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیاء نے لکھا ہے کہ مولینا عنایت علی صاحب ایرانی جو ایک شہر عالم اور مجتہد تھے حضرت شیخ علیہ السلام کے مزار موجود بمقام اودھ ۱۱ جو دھیا کی تصدیق فرما چکے ہیں موصوف ۶۱۸۸۰ میں مزار پر انوار کی زیارت کے لئے ایران سے شہر اودھ شریف لائے تھے۔

کتاب ترجمہ طاہرہ عجائب القصاص جس کو مولوی فخر الدین دہلوی نے حسب فرمائش و اہتمام احترام الدولہ حکیم محمد احسن الشراخاں بہادر دہلوی نے طبع کرایا تھا۔ اس کتاب میں حضرت شیخ علیہ السلام کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ بعض مؤرخین لکھتے ہیں کہ قبر شریف آپ کی شہر اودھ ۱۱ جو دھیا ہند میں ہے۔

شاہ النور علی بنیرہ شاہ تراب علی کا کوروی نے اپنی کتاب -
انتصاح عن ذکر اہل الصلاح میں لکھا ہے کہ - شہر اودھ میں
سا کردہ حضرت آدم علیہ السلام کا ہے اور اسی شہر میں قبر حضرت شیث علیہ
السلام کی ہے۔

کتاب فحجم البلدان میں مولینا نجم الدین آفندی نے لکھا ہے
کہ - شہر اودھ کے بانی حضرت شیث علیہ السلام بن سیدنا حضرت آدم
علیہ السلام ہیں اس کے بعد ہن بن حام بن نوح علیہ السلام نے اودھ کو آباد
کیا۔ اس کے بعد یہ شہر راجگان ہنود کے تحت حکومت میں آیا جس کے بعد
مسلمانوں کا اس پر قبضہ ہوا۔

منشی سید عابد حسین نے اپنی کتاب تاریخ جاش میں جو ص ۱۲ ہجری
۱ مطابق ۷۵ - ۱۸۷۸ میں مطبع جلالی الہ آباد میں چھپی تھی، حضرت شیث
علیہ السلام کی قبر شہر اودھ (اودھیا) میں ہونا لکھا ہے۔

تواریخ انبیا میں منشی سرفراز خاں دہلوی نے تصحیح علماء اسلام د
فضلائے دہلی، لکھا ہے کہ حضرت شیث علیہ السلام کو اولیائے اول
کہتے ہیں حق تعالیٰ نے پچاس صحیفے آپ پر نازل کئے۔ بعض کہتے ہیں کہ
آپ کا مولد شام ہے حضرت شیث علیہ السلام کی اولاد اکثر راہ راست پر
رہی اور بعض نے عصیان اختیار کیا قبر آپ کی شہر اودھ میں مشہور ہے

تواریخ نادیر العصر و جغرافیہ ملک اودھ جو منشی نو لکھنؤ پریس لکھنؤ سے
۱۸۷۳ء میں شائع ہوئی تھی اس کتاب کے صفحہ ۱۶ پر لکھا ہے کہ فیض آباد

کے قریب دو بڑی قبریں ہیں۔ طول ان کا سات سات اور آٹھ آٹھ گز سے کم نہ ہو گا عوام اکثر حضرت شیث علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام سے منسوب کرتے ہیں

شہر اودھ اجودھیا میں حضرت شیث علیہ السلام کے مزار ہونے کا ذکر نہ صرف مندرجہ بالا کتابوں ہی میں مرقوم ہے بلکہ اکثر بزرگان دین نے احاطہ دیکھا ہے۔ یہیں میں چلہ کشی کر کے اپنے مکاشفہ روحانی کی بنا پر موجودہ مقام پر حضرت شیث علیہ السلام کی قبر کی صحت کی تصدیق کیا ہے^{۱۲۰}۔

مزار حضرت ایوب علیہ السلام

احاطہ دیکھا کہ حضرت شیث علیہ السلام میں پورب جانب ایک اور کافی لمبی قبر ہے جو حضرت ایوب علیہ السلام کی قبر کے نام سے مشہور غرضہ دراز سے ہے۔ عہد عالمگیری کے مشہور عالم اور تاریخ نویس سبھان رائے بھٹارسی، ملا محمد باقر اشاعتی، مولینا قاضی شہاب الدین جوینوری، مولینا عبدالحق محدث دہلوی وغیرہ کی کتابوں سے حضرت شیث علیہ السلام و حضرت ایوب علیہ السلام کے مزارات شہر اودھ میں

۱۲۰ - تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیاء صفحہ ۷۳

۱۱ - ملک العلماء قاضی شہاب الدین امیر بنہور کے ہنگامہ کے زمانہ میں بنام دہلی کو ترک کر کے بادشاہ ابراہیم شرقی کی خواہش پر جوینور شریف لائے اور قاضی لقضاء بقیہ^{۱۲۱}

ہونا ثابت ہیں۔

ان کتابوں کے علاوہ تاریخ کاشفی خلاصۃ الوقائع، ناسخ النواریح بحار الانوار، گلزار ابرار، سید المتاخرین، خلاصۃ النواریح، مہر بنم روز وغیرہ میں بھی ان دونوں حضرات کی قبروں کا ذکر موجود ہے۔ کہ یہ قبریں شہر اودھ آبادھیہ میں ہیں۔

مزار حضرت جلال الدین

حضرت شیخ علیہ السلام کے مزار کے احاطہ کے کچھم جانب جو دوسرا احاطہ ہے۔ اس احاطہ میں حضرت جلال الدین ہمیشہ زادہ حضرت خواجہ بیاد الدین نقیبند رحمۃ اللہ علیہ کی قبر بتائی جاتی ہے۔

کے عہدہ پر فائز تھے۔ آپ جملہ علوم میں حاضر اور جمیع علوم میں ماہر تھے، مکی شرح کافہ، کتاب الرشاد، بدیع البیان، بحر موبح، تفسیر قرآن مجید، رسالہ در تقسیم علوم وغیرہ آپ کی تصنیفات میں۔ آپ کا شمار ابراہیم شاہی دور کے زبردست شعرا میں ہوتا تھا۔ بادشاہ ابراہیم شرقی کی وفات سے دو سال قبل ۸۲۰ ہجری مطابق ۱۶۳۸ء میں انتقال ہوا۔ تاریخ فرشتہ جلد اول، اولہ رضویخان متصل جنوبی دروازہ مسجد اٹالہ مدفون ہوئے۔ آپ کی قبر سابق مشن اسکول اور شہزادہ راجہ کالج کے احاطہ کے اندر آج بھی موجود ہے۔ البتہ آپ کے مکان اور مدرسہ کا نشان بھی باقی نہ رہا ہے اور نہ اب آپ کی کوئی اولاد باقی ہے۔

۱۔ تہذیب نو دوم صفحات ۳۳ تا ۲۰۰، بحر زخار، اخبار الاخبار، تاریخ فرشتہ جلد اول خزینۃ الاصفیاء، کشف الظنون، لطائف اشرفی، سبحة المرجان، تاریخ ہند جوہرہ وغیرہ ۱۔ — مؤلف

آپکی قبر بھی حضرت شیت علیہ السلام کی قبر کی طرح گول بنی ہوئی ہے لیکن اس قبر کی لمبائی حضرت شیت علیہ السلام کی قبر کی لمبائی سے کم ہے اتنی مڈور گول، قبر علاوہ مزار حضرت شیت علیہ السلام کے اس علاقہ میں کوئی دوسری قبر نہیں مولوی عبدالغفار نے اپنی کتاب گم گشتہ حالات اچودھیا میں لکھا ہے کہ آپکا وصال ۱۹ رجب المرجب ۷۷۲ ہجری قمری بروز جمعرات ہوا تھا۔

مولوی عبدالغفار صاحب نے اپنے دادا مولوی عبدالکریم انصاری مرحوم کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ گم گشتہ حالات اچودھیا میں تحریر فرمایا ہے کہ حضرت جلال الدین ہمتیرزادہ حضرت خواجہ بیادین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ سلطان سکندری کے مرشد تھے۔ اور بار شاہ کے ہمراہ اچودھیا تشریف لائے تھے۔ نیز آپ ہی کے حکم سے سلطان نے احاطہ درگاہ اور قبر حضرت شیت علیہ السلام کو پختہ کر کے ایک آرائشی برائے مصارف درگاہ عطا فرمایا تھا۔

تاریخ فرشتہ جلد اول کے مطابق سلطان سکندری کی اردھ میں آمد و رفت ۸۷۷ ہجری میں ہوئی تھی۔ اور ایک ماہ کامل اس نے اودھ میں بسر کیا تھا۔ (یہ ماہ اپریل و مئی ۱۴۹۲ء یا ماہ رجب ۸۹۷ ہجری تھا۔ مؤلف یہاں تک حقائق تاریخ سے مطابقت کرتے ہیں۔ لیکن جب آپکی تاریخ وفات ۱۹ رجب ۷۷۲ ہجری یوم پنجشنبہ پر نظر پڑتی ہے تو مولوی صاحب کی علمیت اور تاریخ دانی کی دھجیاں بکھ جاتی ہیں۔ اور ان پر یہ مثل صادق آتی ہے کہ ”رونگو یادداشت نادر“ یعنی سلطان سکندری کے اودھ میں آنے کا زمانہ ۸۹۷ ہجری تھا۔ اس وقت حضرت جلال الدین صاحب

کو انتقال کئے ہوئے سواد و سوسال گزر چکے تھے۔ دوسری علمی بات یہ ہے کہ ۱۹ رجب ۶۷۲ ہجری کو پنجشنبہ کا نہیں بلکہ دو شنبہ کا دن تھا اور جنوری ۱۲۷۴ء کی ۲۹ دین تاریخ تھی۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ مولوی عبدالغفار صاحب کو اس قدر غلط بیانی کرنے سے کیا حاصل رہا؟ آپکی اس غلط بیانی کے منکشف ہو جانے کے بعد حضرت جلال الدین کی بتلائی جانے والی قبر کی حیثیت کبارہ جائیگی؟ کیا یہ عقل میں آنے والی بات ہے کہ آپ کے مرنے کے سواد و سوس برس بعد اپنی کسی کرامت سے سلطان سکندر لودی کے ہمراہ اودھ میں تشریف لائے تھے؟ اور احاطہ درگاہ و قبر حضرت شہید علیہ السلام کو پہنچنے کرانے کا حکم دیا تھا؟ ۶۷۲ ہجری کا زمانہ غیاث الدین بلبن کے عہد حکومت کا آخری زمانہ ہے۔

حضرت جلال الدین کی بتائی جانے والی قبر کے ساتھ چار قبریں اور ہیں جو کافی بوسیدہ اور خستہ ہیں۔ ان چاروں قبروں کے بارے میں یہاں کسی کو کوئی معلومات نہیں کہ یہ کن اصحاب کی قبریں ہیں جنہیں آپ کے قریب میں دفن کیا گیا تھا؟

سیر بسبز چلی آنے والی روایات کے بموجب جب سلطان سکندر لودی حضرت شہید علیہ السلام کی قبر اور درگاہ کی مرمت کرا رہا تھا۔ اسی زمانے میں اس نے حضرت جلال الدین کی قبر بتلائی جانے والی قبر کو بھی بنوا دیا تھا لیکن سلطان نے کسی شخص کی قبر تسلیم کر کے بنوایا تھا؟ یہ راز فراموشی کے عمیق غار میں دفن ہو چکا ہے۔

چاہ شفا

حضرت شہید علیہ السلام کے مزار کے احاطہ کے پورب جانب ایک جھوٹا سا احاطہ ہے محمد ہاشم انصاری صاحب نے مولف کو بتلایا کہ انھوں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ اس جھوٹے سے احاطہ کے اندر زمانہ ماضی میں ایک کنواں تھا جس کا پانی اس قدر ٹھنڈا اور میٹھا تھا کہ درگاہ شریف میں آنے والے زائرین اس کی ٹھنڈک، شیرینی، اور فرحت بخش تاثیر سے متعجب ہوتے تھے۔

حضرت شہید علیہ السلام کے مزار کی قربت سے اس پانی میں شفا تھی لوگ بیماری اور آسیدی شکایات میں اس کنوئیں کا پانی لے کر مریض کو پلاتے تھے اور مریض کو پواتے تھے اللہ تعالیٰ شفا دیدیتا تھا اب اس احاطہ کے اندر کوئی کنواں موجود نہیں ہے زمانہ ماضی میں لوگ اس کنوئیں کو "چاہ شفا" کے نام سے پکارتے تھے۔
 "چاہ شفا" کس زمانہ میں پاٹا گیا یا بند کیا گیا؟ اس کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا البتہ اس جھوٹے احاطہ کے اندر دیوار کے پاس دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس جگہ "چاہ شفا" ہوگا۔

ایک سنگی کتبہ

اس احاطہ کی مشرقی دیوار سے لگا ہوا ایک سرخ پتھر کا کتبہ رکھا ہوا ہے جو تقریباً سوا میٹر لمبا اور ایک گز چوڑا ہوگا اس پتھر پر یہ عبارت علی حرفوں میں کندہ ہے۔

هوالباقی یا محسن قد جاء المسی

چو خان بہادر آیات نشان جلوہ شد فرمائے باغِ خاں
بجستہ تاریخ از نام او بفرمود ہانفت کہ تمکین خاں

۵۳۰ + ۵۱۰

۱۸۱ ہجری

قطرہ تاریخِ دفات کاسینگی کتبہ پہلے کس جگہ نصب تھا؟ بارِ جود تحقیق
کے کچھ تہ نہ چل سکا۔ محمد باہم انصاری اور بہت سے ہندوؤں اور مسلمانوں
سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے بچپن سے اس کتبہ کو اسی جگہ رکھا ہوا دیکھ رہے
ہیں جو دیوار کے سہارے لٹکا ہوا ہے۔

مادہ تاریخ، تمکین خاں، سے ۱۸۱ ہجری کا سن نکلنا ہے جو نواب
شجاع الدولہ کا آخری عہدِ حکومت کا زمانہ ہے یہ کتبہ نواب شیخ الدولہ کے
امیر تمکین خاں کی مزار پر نصب رہا ہوگا۔ جو اسی دیوار میں کسی جگہ رہی ہوگی۔
جب مزار کسی طرح حادثاتِ زمانہ کا شکار ہوئی تو کسی نے کتبہ کو اس جگہ سے
اٹھا کر یہاں لا کر رکھ دیا ہوگا اور تب سے وہ اسی جگہ پر رکھا ہوا ہے۔

مزارِ خلیفہ حضرت نظام الدین اولیاء

درگاہ حضرت شیخ علیہ السلام کے باہر دکن جانبِ ٹیلے کی بلندی
پر جہاں آج بھی سیکڑوں سال پرانے اہلی کے درخت موجود ہیں اور جگے
اور گردِ خود رو جنگلی جھاڑیاں اگی ہوئی ہیں۔ اہلی کے ان درختوں کے نیچے ایک،
انتہائی بوسیدہ چوترہ ہے اس چوترہ پر ایک پختہ قبر ہے جو بڑی خستہ حالت

میں ہے اس قبر کے متعلق محمد ہاشم انصاری صاحب نے مؤلف کو بتلایا کہ یہ صاحب مزار حضرت محبوب الہی نظام الدین اولیا، رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیاء میں بھی اس قبر کو حضرت نظام الدین اولیا، رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ کی لکھا ہے لیکن نام اور دیگر ضروری تفصیلات کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ کبھی کبھار اکثر درویش قسم کے لوگ اس مقام پر کچھ وقفہ کیلئے آتے ہوئے اکثر لوگوں نے دیکھا ہے

صاحب مزار کا نام جن ضعیف العمر لوگوں سے معلوم کر نیکی کوشش کی گئی سب نے لاعلمی ظاہر کیا اور کہا کہ وہ صاحب مزار کا نام تو نہیں جانتے لیکن اپنے آباء واجداد سے یہی سنتے چلے آ رہے ہیں کہ یہ مزار حضرت نظام الدین اولیا، رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ کا مزار ہے اور یہ صاحب کرامت بزرگ ہیں۔ مولوی عبد کریم انصاری مرحوم نے آپ کا ذکر خواجہ ضیاء الدین بخشیش کے نام سے کیا ہے جو شاید کتابت کی غلطی ہے یا سمجھ عدم واقفیت کی بنا پر بخشیش کا لفظ اضافہ کر دیا گیا ہے آپ کا ذکر مؤلف کو کسی کتاب میں نہیں ملا۔

مزار اولیاء اللہ

اس جگہ سے دھن جانب کنڑ کے ایک چوتھرے پر ایک بہت پرانی قبر ہے جسے لوگ ایک اولیاء اللہ کا مزار ہے نے ہیں لیکن کس اولیاء اللہ کا مزار ہے یہ کوئی نہیں جانتا ۱۹۰۲ء اس چوتھرہ پر دو بہت پرانے درخت موجود تھے ایک درخت اہلی کا تھا اور دوسرا کھرنی کا جسے متعلقہ لوگوں نے فروخت کر ڈالا اور خریدار نے کٹوا لیا۔

اولیاء اللہ یا بزرگوں کے مزارات

درگاہ حضرت شہید علیہ السلام کے اتر جانب عام راستے کے کنار ہی دابنے ہاتھ پر کچھ پختہ قبریں ہیں جو زمانہ قدیم سے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ تمام قبریں اولیاء اللہ کی ہیں اور کچھ لوگ بالکمال بزرگوں کی قبریں بتلاتے ہیں۔ مؤلف نے اکثر لوگوں کو ان مزارات پر فاتحہ خوانی کرنے ہوئے دیکھا ہے۔ ان قبروں کے متعلق نہ تو کسی کتاب میں کوئی ذکر ملتا ہے اور نہ یہاں کے لوگوں کو یہی کچھ معلوم ہے۔ یہاں کے لوگوں نے بتلایا کہ جب بی حضرت شہید علیہ السلام کی درگاہ کی سفیدی ہوتی ہے اس وقت لازمی طور پر ان قبروں پر بھی سفیدی کی جاتی ہے لیکن اس عمل سے صاحب قبر کی اہمیت نمایاں نہیں ہوتی۔ مزارات کوئی الوقت دیکھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ادھر کئی سالوں سے سفیدی نہیں کی گئی ہے فی الوقت اس جگہ پر پانچ قبریں ہیں۔

گدی شاہ کا قبرستان

نالہ تلی اور پختہ سڑک کے اتر جانب زمانہ ماضی میں گدی شاہ کا قبرستان نام کا ایک وسیع قبرستان تھا جس میں بیشمار پختہ اور خام قبریں تھیں لیکن فی الوقت اس قبرستان کا رقبہ بہت کم رہ گیا ہے اور اب یہ اندازہ کرنا بھی مشکل ہو گیا ہے کہ کسی زمانہ میں اس جگہ کوئی قبرستان تھا۔

سرگزشت دل بیتاب نہ لاد لب پر
یہ حکایات نگاہوں سے کہی جاتی ہیں

مسجد پانچی شاہ یا مسجد پانچی ٹولہ | موجودہ فیض آباد اجودھیا روڈ جو ساکیت ڈگری کالج، کالرا

اسپتال وغیرہ کے سامنے سے گزرتی ہوئی آجودھیا میں دریائے گھاگھر کے کنارے
تک چلی گئی ہے۔ اسی سڑک پر مومن انصار یوں کا قدیم محلہ ہے ۱۳۰۔ جسے پانچی ٹولہ
کہتے ہیں۔ اس محلہ کے پورب جانب قدیم محلہ ”دلارے رائے کی لٹیا“ ہے جو
اب کثرت استعمال سے صرف لٹیا کہا جانے لگا۔ اس محلہ کی مسجد کو جو سڑک اتر
جانب ہے مسجد پانچی ٹولہ کہلاتی ہے۔

اسی محلہ کے نور باناں کے مقابل سڑک کے دوسری جانب پچھلی گوشہ میں محلہ
تضایذ میں ہے! ۱۳۲

۱۳۳۔ زمانہ ماضی میں یہ محلہ بازار شیر جنگ سے ملا ہوا تھا اور اسی کا آخری حصہ
تھا۔ لیکن انقلابات زمانہ کے ہاتھوں یہ تمام علاقہ تباہ و برباد ہو چکا ہے مجھے اس محلہ
کو دیکھنے کے بعد یہ شبہ نہیں ہوتا کہ یہ علاقہ کبھی بازار شیر جنگ کا آباد اور بار و نق حصہ
بھی رہا ہوگا۔ مولوی عبدالغفار کے علاوہ کسی نے بھی اس علاقہ کا ”محلہ نور باناں“
کے نام سے ذکر نہیں کیا ہے۔ منشی لچھی زائن صدر قانون گو نے بھی اپنی کتاب تاریخ
اجودھیا میں اس محلہ کا نام ”محلہ نور باناں“ نہیں لکھا۔ موری غفار نے سو کا اختراکی نام مروجانے
ذمہ دار ایر پن کا منظر پر کیونکہ اب مولوی صاحب موشو نصیری، سید آلہ نبی تبدیل ہوئے ہیں

خانقاہ و مزارات پیر رحیم الدین و پیر کریم الدین

محلہ قضاہ میں فی الوقت محمد یوسف قریشی کے مکان کے سامنے فیض آباد
اجودھیا روڈ پر لب سڑک پیر رحیم الدین اور پیر کریم الدین صاحبان کی مشہور
خانقاہ بمقام لوگ اب تک اس خانقاہ کا ذکر کرتے ہیں۔

مولوی عبدالکریم انصاری اور مہی مرقم نے بھی اس خانقاہ کا ذکر کیا ہے۔ انیسویں
صدی کے آخری دہائیوں تک اس خانقاہ بوسیدہ چار دیواری موجود تھی
لیکن اب اس کے آثار تک معدوم ہو چکے ہیں۔ البتہ ایک بوسیدہ چوتراہہ
چند شکاری قریب موجود ہیں جنکے بارے میں کسی کو کوئی علم نہیں ہے کہ یہ کن صحابہ
کی قبریں ہیں۔

شیخ کریم الدین کے متعلق اتنی معلومات ضرور حاصل ہونی چاہیے کہ آپ
حضرت جمال الدین اولیا کے خلیفہ تھے۔^{۱۲۳۴}

مزار امیر حبیب

محمد ہاشم انصاری صاحب کے مکان کے سامنے سڑک کے دوسری
جانب فیض آباد اجودھیا روڈ پر لب سڑک کھارمند کے سامنے اور

۱۲۳۴ - حضرت جمال الدین اولیا، حضرت مظفر بلخی کے خلیفہ تھے اور حضرت
مظفر بلخی حضرت شاہ شرف الدین بخشی مہتری کے خلیفہ مجاز تھے مؤلف

مسجد پانچي ٹولہ کے اتر جانب پا کر کے درخت کے نیچے ایک پختہ چوترہ پر کسی صاحب کی قبر ہے۔ لوگ اس قبر کو میر جینا کی قبر کہتے ہیں اور اس کا احترام کرتے ہیں۔

میر جینا کے زمانہ کا تعین تو نہیں جاسکا لیکن عوام میں مشہور روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اپنے وقت کے مشائخ میں سے تھے کچھ لوگوں نے بتایا کہ انھیں اپنے بزرگوں سے معلوم ہوا ہے کہ آپ کا ایک مدرسہ اور خانقاہ بھی اسی جگہ تھی۔

مولوی عبدالغفار نے میر جینا کا ذکر میر جینا کے نام سے کیا ہے لیکن دیگر حالات پر وہ کوئی روشنی نہ ڈال سکے۔ کاش ایسی ہی احتیاط وہ دوسری جگہوں پر بھی کر سکتے۔!

مزار پانچي شاہ

کہتے ہیں کہ پانچي شاہ درویش کا زمانہ شاہ عالم بادشاہ کا زمانہ ابتدائی ہے۔ یعنی ۱۰۰۰ء اور ۱۰۵۰ء جو دھیا کے مشائخ میں محترم شخص تھے اور زہد و تقویٰ میں اپنے ہمعصرین میں ممتاز تھے۔ بیعت کا سلسلہ باوجود تحقیق دستجو کے معلوم نہ ہو سکا لیکن آپ کے مریدین اور خلفاء کا ہونا ثابت ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپ قطب شاہ کے آخری عہد میں کسی مقام سے اجودھیا تشریف لائے تھے مسجد پانچي ٹولہ کے دکھن جانب آپ کا مزار تھا لیکن جب فیض آباد اجودھیا روٹ بننے لگی آپ کا مزار شریک میں آگیا اب ایک عرصہ دراز گزر جانے کے بعد وہ لوگ

میں باقی نہیں رہ گئے۔ جبکہ معلوم تھا کہ پانچویں شاہ کا مزار جس کے نام سے پانچویں ٹولہ کا محلہ آباد ہوا تھا، موجودہ سڑک میں کس جگہ تھا؟

پانچویں شاہ کے سلسلہ یادگیر خاندانی علمی حالات کے بارے میں کوئی تفصیل نہ حاصل ہو سکی ماسوا اس کے کہ آپ ایک صاحب کمال اور صاحب کشف بزرگ تھے اور زمانہ حیات اور بعد وفات لوگ آپ کے روحانی فیوض و برکات سے ایک زمانہ تک مستفیض ہونے رہے ہیں۔

مزار بہار شاہ

اسی مسجد پانچویں ٹولہ کے چیم جانب ایک قدیم اور بنسیدہ چوترہ پر کسی بہار شاہ نامی بزرگ کی لوگ قبر بناتے ہیں مؤلف نے اکثر لوگوں کو اس مزار پر فاتحہ خوانی کرنے بھول چڑھانے اور اگر تین سال گلنے ہوئے دیکھا ہے۔ اب لوگ بہار شاہ کو پہاڑ شاہ کہنے لگے ہیں آپکا ذکر مؤلف نے کسی مستند تارخی کتاب میں نہیں دیکھا۔

اس میں بہار شاہ یا پہاڑ شاہ کی مزار کے دھن جانب ایک

مزار مکی شاہ

قدیم چوترہ پر ایک مزار ہے جسے لوگ مکی شاہ کا مزار بتلاتے ہیں۔ اس محلہ کے ضعیف العمر لوگ بتلاتے ہیں کہ اس کے بچپن کے زمانہ تک اس جگہ پر کئی سایہ دار نیم کے درخت تھے اور یہ جگہ بڑی پُر فضا تھی لیکن فی الوقت اس جگہ پر نہ کوئی سایہ دار نیم کا درخت ہے اور نہ اس جگہ کُن فضا پُر فضا ہے۔

مکی شاہ کے بارے میں بعض لوگوں نے مؤلف کو بتایا کہ انھوں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ آپ عربی تھے اور ملک عرب کے کسی دیار شہر اور دھ

تشریف لائے تھے۔ اسی وجہ سے لوگ آپ کی شاہ کہنے لگے تھے آپ کے اصل نام سے کسی کو واقفیت نہیں ہے آپ کس زمانہ میں اجودھیا تشریف لائے تھے کب انتقال فرمایا؟ اس کے متعلق کوئی معلومات نہ ہو سکی

مزار قطب شاہ

مسجد پانچ ٹولہ سے تھوڑا آگے فیض آباد اجودھیا روڈ ہی پر شہر اجودھیا کی طرف چلے تو تیسرے قبرستان میں حضرت قطب شاہ کا مزار ملے گا۔ (یعنی سری رام اسپتال کے پورب جانب کے قبرستان میں) یہ قبر اب تک موجود ہے۔ قطب شاہ حضرت پانی شاہ کے خلیفہ تھے ان کے خرق عادات کے قصے جو سینہ بسینہ چلے آ رہے ہیں اکثر ضعیف العمر لوگ بڑی عقیدت سے بیان کرتے ہیں۔ آپ کے بارے میں لوگ بتلاتے ہیں کہ آزاد منشی درویش تھے۔ پنجت نہ کے دن خصوصاً کچھ لوگوں کو مولف نے اس مزار پر نانو خوانی کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ لوگ بتلاتے ہیں کہ نفرینا ڈھانی سو سال کا زمانہ ہوتا ہے کہ آپ کا انتقال ہوا تھا لیکن سن و مہینہ بازمانہ اقتدار حکومت کوئی نہیں بتلانا اور نہ ہی آپ کے دوسرے حالات کا کسی کو کوئی علم ہے۔

مزار پانی شاہ سری رام اسپتال کے پورب جانب کے قبرستان میں کھرو بنانا تالاب کے اتر جانب قطب شاہ کے مرشد پانی شاہ کا مزار ہے۔ آپ بھی آزاد منشی درویش تھے۔ آپ کی قبر کے پورب جانب کھرو بنانا تالاب ہے اس تالاب سے متصل پورب جانب

جلوآن پور نامی محلہ آباد ہو گیا ہے۔ دکن جانب اب سے تقریباً ایک سو سال قبل اس جگہ پر ایک بہت بڑی خانقاہ کے باقیات موجود تھے۔ مولوی عبد کریم انصاری مرحوم نے اس خانقاہ کے آثار و باقیات اور ایک بلند بھائٹک کے موجود ہونے کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے۔

جہاں تک کہ مولف کے مشاہدہ کا تعلق ہے یہ بات بھی بعید از امکان نہیں ہے کہ خانقاہ کہلانے والی عمارت کے آثار و باقیات کسی حوٹلی کے ہی ہوں۔ اجودھیا کے مہم بزرگ بتلاتے ہیں کہ انھوں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ اس جگہ پر زمانہ ماضی میں ایک وسیع و عریض قبرستان تھا جس میں ہزاروں پختہ قبریں زمانہ قدیم کی موجود تھیں۔ انقلابات زمانہ کے بیدار ہونے سے اس وسیع قبرستان اور عظیم الشان خانقاہ کو اس طرح تباہ و برباد کیا کہ اب ان کا نام سننا تک نہیں ملتا۔ البتہ اس وسیع قبرستان میں واقع ایک مسجد کے باقیات اب تک موجود ہیں۔ زمانہ ماضی کا وسیع قبرستان اور عظیم الشان خانقاہ اب کھبت اور باغوں میں تبدیل ہو چکا ہے۔

روضہ زین العابدین

گر بار نہ ہو ظل، نبی سے کردں سر

کچھ دوسرے زمینوں میں رہنا یا کے لگتے ہیں

موجودہ سری رام اسپتال اور محلہ پانچ ٹولہ سے جو سڑک اجودھیا ریلوے اسٹیشن کو جاتی ہے اس کے دتر ہے، پر گنبد بخشی بابا کے طرز پر بنا ہوا تقریباً اتنا ہی بڑا ایک عظیم الشان مقبرہ ہے۔ اس مقبرہ اور گنبد بخشی بابا کو عبور

دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں مقابر کی تعمیر کا زمانہ ایک ہی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان دونوں مقابر کے بنانے والے معمار بھی ایک ہی رہے ہوں یہ مقبرہ بھی اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ گنبد بخششی بابا۔ البتہ فرق یہ ہے کہ گنبد بخششی کی شہادت پر اتنی توجہ نہیں دی گئی جتنی کہ روضہ زین العابدین پر محلہ کے مسلمانوں نے توجہ دی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ روضہ زین العابدین آبادی کے اندر ہے اور ہر وقت لوگوں کی نگاہیں اس پر پڑتی رہتی ہیں اور محکمت و ریخت کی شر و عا ہی پر لوگوں کی نگاہیں پڑتی رہی ہیں۔ اور گنبد بخششی بابا آبادی سے باہر ویران و سنان مقام پر چونکہ وجہ سے اسکی شکلی اور موسم کے اثرات کی تباہ کاری پر لوگوں کی نگاہیں جلد نہیں پڑیں جب کوئی حصہ شکستہ ہو کر اس حالت پہنچ جاتا ہے کہ ناقابل مرمت ہو جاتا ہے اس وقت لوگ اس کی طرف توجہ ہونے میں۔ بدیں وجہ روضہ زین العابدین کی حالت گنبد بخششی بابا سے بہتر ہے۔

یہ مقبرہ جو اس وقت روضہ زین العابدین کے نام سے مشہور ہے زمانہ ماضی میں لوگ اسے "مقبرہ بعلی شہید" کہتے ہیں، مولوی عبدالغفار نے گم گشتہ حالات اور دھیا میں اس مقبرہ کا ذکر "مقبرہ بعلیا شہید" کے نام سے کیا ہے ادھر دس بارہ سال سے محلہ کٹیا کے مسلمان آپس میں چنہ کر کے ہر سال ماہ شعبان کی جو بیس کی تاریخ کو عرس کرتے ہیں۔ تقاریب عرس صبح سے شروع ہو کر رات کو ختم ہوتی ہیں۔ مراسم عرس ادا ہونے کے بعد راتوں کو مولویوں کی تقاریر کے بعد محفل سماع منعقد ہوتی ہے جو اکثر عجیب تک جی رہتی ہے۔

مسجد حضرت زین العابدین

مقبرہ حضرت زین العابدین: بجلی شہید کے دروازہ کے سامنے کچھ چار تقریباً ساٹھ ستر میٹر کے فاصلہ پر زمانہ قدیم کی ایک مسجد ہے جس کے صحن میں ایک قبر ہے لوگ کہتے ہیں کہ یہ بھی کسی بزرگ کی قبر ہے

مزار بنی بنا شاہ

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مسجد کے اندر جو قبر وہ حضرت بنی بنا شاہ نامی بزرگ کی قبر ہے۔ حضرت بنی بنا شاہ کے متعلق یہاں کوئی شخص کچھ نہیں جانتا عوام نے جو کچھ پرانا لوگوں سے روٹا سنا ہے اس کو رستا و بزمی حیثیت سے بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہر شخص کچھ گھٹا بڑھا کر بیان کرتے ہیں کسی کتاب میں حضرت بنی بنا شاہ کا کوئی ذکر مؤلف کو نہیں ملا۔

پہلے اس جگہ پر تین احاطے تھے مسجد زین العابدین کے صحن میں لوگ حضرت بنی بنا شاہ کی قبر بتاتے ہیں۔ دوسرے اور تیسرے احاطے میں جو قبریں تھیں اب ان کے نشانات معدوم ہو چکے ہیں۔

مزار سید جلال شاہ

تاریخ پار بنہ مدینہ الاولیاء میں لکھا ہے کہ حضرت شاہ جلال کی قبر حضرت پانی شاہ کے عجب کے اندر ایک احاطہ میں واقع ہے۔ لیکن

ان الوقت یہاں کسی احاطہ کے آثار و باقیات کا کوئی نشان نہیں ملتا ہے۔ صرف مزار باقی ہے جو موجودہ برلامندر کے پورب اور دکھن کے کونے پر موجود ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جنہیں پانی شاہ کے مزار کے صحیح محل وقوع کا علم ہے۔ عام لوگ تو اس مزار کو بھی دوسری مزاروں کی طرح کسی شہید مرد کی مزار ہونا جانتے ہیں باوجود تحقیق کے سید جلال شاہ کے متعلق بھی کوئی معلومات نہ حاصل ہوئی اور نہ آپکا زمانہ ہی معلوم ہو سکا۔

مزار شاہ بدیع الدین

اس وقت جس مقام پر برلامندر بنا ہوا ہے زمانہ ماضی میں قبرستان تھا جس کے تیکہ دار محبوب شاہ تھے محبوب شاہ کے مرنے کے بعد ان کے لڑکے عظیم الشان شاہ نے قبرستان کو فروخت کر ڈالا۔ اسی قبرستان کے اتر جانب ہنومان گڑھی محلہ ہے۔ پہلے دکھن جانب ایک باغ تھا جس میں شاہ بدیع الدین کا مزار تھا۔ باغ تو نہ جانے کب کا ختم ہو چکا ہے البتہ مزار خستہ حالت میں اب تک موجود ہے شاہ بدیع الدین کے متعلق کم گشتہ حالات اب جو دھیا میں لکھا ہے کہ آپ دارالعلوم جوپور کے رہنے والے تھے۔ اور حضرت اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ کے عہد حکومت میں آپکا شمار اس وقت کے مشائخ کبار میں ہوتا تھا۔ آپکی دائمی آرام گاہ اسی قبرستان کے اتر جانب محلہ ہنومان گڑھی کے دکھن جانب پہلے ایک باغ میں تھی اور آپکی مزار پر خوشبودار پھولوں کے پودے لگے ہوئے تھے لیکن اب نہ یہاں کوئی باغ ہے اور نہ قبر پر خوشبودار پودے لگے ہوئے

ہیں۔ بس مزارِ موسیٰ علیہ السلام میں اب تک موجود ہے
اب فیض آباد اور دھیاروڈ سے اجودھیا شہر کی طرف چلے اور اجودھیا
شہر کی موجودہ کوتوالی کی عمارت کے پاس آئے۔

مقبرہ تین درویش

اجودھیا شہر کی موجودہ کوتوالی کی عمارت سے لمحوں پر بجانے ایک گلی دکھن
جانب کو گئی ہے۔ کوتوالی کے سامنے والے پورے کونے سے اس گلی میں دکھن
جانب دس پندرہ میٹر اندر کی جانب چلے تو بائیں ہاتھ پر ایک میدان اور
ایک عظیم الشان مقبرہ ملتا ہے جو طرزِ تعمیر میں روضہ زین العابدین اور گنبد
بخشی بابا بجلی شہید کے مثل ہے اور اب لگان ہوتا ہے کہ ان دونوں مقامات
کے ساتھ ہی یا اسی زمانہ میں اس مقبرہ کی بھی تعمیر ہوئی ہے یا یہ مقبرہ متذکرہ

۱۲۵۔ تاریخ شیراز بنو پور صفحہ سید اقبال احمد مطبوعہ نائی پرس لکھنؤ طبع اول سن ۱۹۶۳ء

میں شاہ بدیع الدین نام کے کسی شخص کا کوئی ذکر نہیں اور نہ عہد عالمگیری کے جن نو

خاندانوں کا ذکر متذکرہ بالا کتاب میں کیا گیا ہے اس میں بھی آپ کا

کہیں ذکر نہیں آیا ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ عہد کے بہاؤ

شکر لکھ دیا ہے کہ شاہ بدیع الدین شیراز کے تھے

تھے اور آبکاش اور

دونوں مقابر کے قریب ترین زمانہ میں تعمیر کیا گیا ہوگا۔

اس مقبرہ کے اندر تین قبریں ہیں۔ مؤلف کو ان تینوں قبروں کے پاس جلی ہوئی اگر بنوں کے گل جھاڑو دے ہوئے فرش کو دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہاں حاجت مند اور عقیدت مند برابر آتے رہتے ہیں ان قبروں میں کون بزرگ یا لوگ آرام فرما ہیں؟ اس کا ذکر نہ تو کسی کتاب میں ملتا ہے نہ لوگوں سے دریافت کرنے پر بھی کچھ معلوم ہو سکا۔

محمد ہاشم انصاری صاحب جو اجداد صبا کے عوام کے پر خلوص اور بے لوث سماجی اور ملی کارکن ہیں اور اجداد صبا سے متعلق مولوی عبدالنظار انصاری سے بہت زیادہ معتبر اور وسیع معلومات رکھتے ہیں انھیں کی زبانی مؤلف کو معلوم ہوا کہ اس مقبرہ کو لوگ، تین درویش کا مقبرہ، کہتے ہیں اکثر بزرگوں نے بھی بتایا کہ فی زمانہ لوگ اسے تین درویش کا مقبرہ ہی کہتے ہیں۔ البتہ زمانہ ماضی میں لوگ اس مقبرہ کو کس نام سے پکارتے تھے وہ نہیں جانتے اور نہ انھوں نے اپنے کسی گرو سے ہی اس کے بارے میں کچھ سنا ہے۔

اس مقبرہ اور نوگری قبر کے علاقہ کو مؤلف نے محمد ہاشم انصاری کے ساتھ اور انھیں کی رہنمائی اور رہبری میں ماہ جولائی، ۱۹۷۷ء کے تیسرے ہفتہ کی تاریخوں میں دیکھا تھا۔ اس وقت کئی دنوں سے موسم خراب تھا تیز موسلا دھار بارش ہو رہی تھی سامنے کا میدان برسائی پانی اور چوڑے کے خود رو درختوں سے بھرا ہوا تھا یہ میدان قدرے نشیبی ہونے کی وجہ

سے برساتی پانی سے بھر جاتا تھا پاس کی آبادی کے رہنے والے مردوں عورتوں اور بچوں نے اس میدان میں اس قدر پاخانہ رکھتا تھا کہ چند قدم چلنا دشوار تھا۔ بارش کے پانی نے تو سارے میدان کو غلات سے بھر دیا تھا اس میدان میں بھی بہت سی قبروں کے نشانات موجود تھے جو زمانہ قدیم کی ہیں۔ اس میدان میں متصل آبادی کو اب محمد نوزی قبر کہتے ہیں۔

نوزی قبر

اس مقبرہ کے دکھن جانب تقریباً ایک سو میٹر کے فاصلہ پر وہ مشہور قبر ہے جسے زمانہ دراز سے لوگ نوزی قبر کہنے چلا آ رہے ہیں۔ مذکورہ قبر ایک چار دیواری کے اندر ہیں جسکی اوسنچالی تقریباً ایک گز ہے فرنگوں کو ایک پختہ چوترے پر بنی ہوئی ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ قبر کسی انسان کی نہیں ہے بلکہ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کے ٹکڑوں کی قبر ہے^{۱۳}

ایک روایت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ جس جگہ پر نوزی قبر بنی ہوئی ہے اسی جگہ پر کشتی نوح علیہ السلام کے آٹھ ٹکڑے پائے گئے تھے۔ جسے کسی نوری شاہ نامی شخص نے دوبارہ دفن کر کے قبر کی شکل بنادیا لیکن اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ یہ واقعہ کس زمانہ میں ہوا تھا؟ نوری شاہ کون تھا اور کن سائنٹفک ذرائع سے یہ معلوم کر کے تصدیق کی گئی کہ ٹکڑی کے وہ ٹکڑے جو اس جگہ زیر زمین پائے گئے تھے حقیقتاً حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کے ٹکڑے تھے؟

بہر حال عوام میں یہ قبر نوزی قبر کے نام سے مشہور ہے لیکن پیمائش میں چودہ گز سے زیادہ ہے

کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ قبر حضرت ہند علیہ السلام کی ہے کیونکہ یہ قبرستان جس میں نوگزی قبر واقع ہے بنی نوح کا قبرستان کہلاتا ہے۔ مولوی عبدالکریم انصاری مرحوم نے بھی یہی روایت کیا ہے کہ یہ کشتی نوح کے ٹکڑوں کی قبر ہے۔ نوگزی قبر کی اصل و حقیقت ہر زمانہ میں پوشیدہ رہی ہے۔ باصلاحیت ذہن کی دوراندیش شخصیتوں کے اتحاد و اتفاق کا یہ شاہکار اپنے منسوب الیہ کی شخصیت کی عظمت و احترام کے تغیل ہمیشہ نقد و تبصرہ سے بالاتر رہا۔

نوگزی قبر وہم و اعتقاد کا سنگم ہے، لیکن عقیدت و عقیدہ کی قلمرو میں شکوک و شبہات بھی خلافت ادب اور منوع میں۔ ہم اظہار خیال بھی مناسب نہیں سمجھتے۔ البتہ اس "قبر" کا کچھ "قریبی رشتہ" کشتی نوح سے جوڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس لئے آئیے ہم سنجیدگی و متانت کے ساتھ کچھ امکانات پر بھی غور کر لیں۔

کشتی نوح کی حقیقت اور تلاش

طوفان نوح اور کشتی نوح کا ذکر قرآن مجید، توریت اور دیگر آسمانی کتابوں میں مرقوم ہے اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ بتدارت انھیں زمانے سے ہیں طوفان نوح اور کشتی نوح کا علم ہوا تھا۔ لیکن اجودھیا میں کشتی نوح کا موجود ہونا یا اسکی لکڑی کے چند ٹکڑوں کو اجودھیا میں پائے جانے کے امکان کا ہم قدیم و جدید تحقیقات کی روشنی میں ایک سرسری جائزہ مینا ضرور چاہتے ہیں اور معلومہ حقائق و تحقیقات کی ٹھوس بنیادوں پر ہم یہ بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اجودھیا یا اس کے گرد و نواح کے کسی علاقہ میں کشتی نوح کا پایا جانا ممکن بھی ہے؟ کیا طوفان نوح میں حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی، اجودھیا میں ہی موجود کسی پہاڑ کی چوٹی پر ٹھہری تھی؟

کشتی نوح اور کوہ ارا راط

انیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں کے درمیان جب علم و تحقیق کے افق کچھ روشن ہوئے اور تحقیق و جستجو کے جذبہ کو سازگار حالات کا تودن اور موصلا فرمایاں میں تمنا بنیو نے کشتی نوح کو بھی تلاش سازنا شروع کیا۔

سب سے پہلے انیسویں صدی کی آخری دہائی میں آٹا بار کے ایک پادری۔ مرنوری (MORRY) نے جو 'ن' دونوں ایران اور کردستان کی سیاحت کر رہے تھے، کشتی نوح کو تلاش کرنے کا ارادہ کیا۔ قدیم کتابوں میں کشتی نوح کے متعلق جو کچھ انھوں نے پڑھا تھا، اس کے بموجب وہ جگہ باتل کے تباہ شدہ شہر سے آٹھ سو کیلو میٹر کے فاصلے پر تھی۔ مرنوری (MORRY) کی شخصیت بارقار اور قابل، عماد تھی اُسے دنیا کی بارہ زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا اُس نے چین، برما، آسٹریلیا، افریقہ اور یورپ کی سیاحت کیا۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتا، کشتی نوح کے بارے میں تذکرہ ضرور کرتا۔

مرنوری تین مرتبہ کھوج لگانے میں ناکام رہا۔ وہ اپنی ناکامیوں سے ہمت حوصلہ نہیں ہوا۔ آخر کار وہ چوتھی مرتبہ کامیاب ہو گیا۔ وہ لکھتا ہے۔

— پانچ ہزار برس پرانی کشتی مسیری نخلوں کے سامنے تھی وہ نصف کے قریب جھیل میں تھی اور بقید نصف حصہ برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ میں نے اسکی پیمائش کی تو اُسے توریت میں دی گئی لمبائی، چوڑائی اور اونچائی کے عین مطابق پایا۔

کوہِ اِراٹ کی ایک اور تصدیق

آئندہ کے مشہور سیاح ڈاکٹر نان سین نے بھی مشرقی ملک کے بیان کی تصدیق کیا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب "آرمینیاں اور مشرقِ قریب" کے صفحہ ۱۱ پر لکھا ہے کہ کشتی نوح کوہِ اِراٹ پر موجود ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں میں نے اسے بار بار دیکھا ہے۔ یہ کشتی پانچ سو ٹن پس فٹ لمبی، اٹھاسی فٹ چوڑی اور ساڑھے باون فٹ اونچی ہے، اور اب بھی اچھی حالت میں موجود ہے۔

کلاڈیس جینر نے جو ۱۸۸۰ء میں بغداد میں ایٹانڈیا کمپنی کا نمائندہ تھا۔ اس نے اپنی کتاب "کردستان میں قیام" جلد دوم میں لکھا ہے کہ میں آٹا نے مجھے بتایا کہ اس نے کوہِ اِراٹ پر موجود کشتی نوح کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ کوہِ اِراٹ پر واقع عیسائیوں کے ایک گاؤں سے ایک تنگ راستہ پر ایک گھنٹہ چلنے کے بعد کشتی نوح کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اُس کے سامنے ایک بہت بڑا مہار تھا جو شکستہ ہو چکا تھا۔ اس میں ایک ایکٹ فٹ لمبے کیل نظر آ رہے تھے۔

حکومتِ ترکی کے ماہرین کا خیال

حکومتِ ترکی نے ۱۹۳۲ء میں کوہِ اِراٹ پر ماہرین کی ایک ٹیم روانہ کی تھی جس کا مقصد اس اچانک آنے والے طغیانیوں کے اسباب معلوم کرنا تھا جس سے پہاڑ کے ارد گرد کی آبادی تباہ و برباد ہو رہی تھی۔ ماہرین کی اس جماعت کو کافی بندی پر ایک ہیل کے کنارے برف میں دبا ہوا ایک ببر نظر آیا تھا۔

اخبار کنگز ہرلڈ کی اطلاع

کشتی نوح کے بارے میں ایک اطلاع دونوں عالمی جنگ کے درمیان امریکہ ایک اخبار کنگز ہرلڈ (KINGS HERALD) میں شائع ہوئی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ انقلاب روس سے کچھ عرصہ پیشتر روسی بازوؤں کا ایک چھوٹا سادہ کوہ آرات سے تقریباً چالیس کلو میٹر کے فاصلے پر ایک عارضی ہوائی اڈے پر مقیم تھا۔ یہ اگست کے ایک دن کا واقعہ ہے اس دن گرمی بہت زیادہ تھی۔ کپتان نے بتایا کہ جہاز نہر سات بندی پر تھم جاتی پر دوازہ کیسے بالکل تیار ہے۔ کپتان اور سکورسکی کو جہاز اڑانے کا حکم ملا۔ ان کے ساتھ ایک معاون ہوا باز بھی تھا۔ دونوں کافی دیر تک فضا میں چکر لگاتے ہوئے چورہ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ گئے اور انھوں نے جہاز کا رخ کوہ آرات کی طرف کر دیا۔ وہ پہاڑ کے ساتھ ساتھ پرواز کرتے رہے کہ انھیں ایک نیلی بھیل دکھائی پڑی جو شفاف نیلم کی طرح چمک رہی تھی۔ اس کے اطراف میں برف جمی ہوئی تھی۔ جب انکا جہاز بھیل کے اوپر سے گزر رہا تھا تو انکی حیرت کی کوئی انتہاء نہ رہی، انھوں نے بھیل کے کنارے ایک بہت بڑی کشتی دیکھی جس کا بالائی حصہ گول تھا۔ عرشہ پر پانچ فٹ چوڑا ایک پل بھی بنا ہوا تھا۔ نزدیک پرواز کرنے پر معلوم ہوا کہ کشتی کا تین چوتھائی حصہ زیر آب ہے۔ اور وہ ایک طرف سے شکستہ ہو چکی ہے۔ دوسری جانب ایک دروازہ تھا جو تقریباً بیس مربع فٹ تھا۔

جب روسی ہوا باز کپتان اور سکورسکی ہوائی اڈہ پر واپس پہنچا تو اس نے کپتان سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ کپتان جہاز پر سوار ہو کر بھیل کے قریب پہنچا اور واپسی پر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ کوہ آرات پر جو کشتی انھوں نے دیکھی ہے وہ دراصل کشتی نوح ہے۔ جسکا تذکرہ اکثر پرانی کتابوں میں ملتا ہے۔

شہنشاہ روس کی دلچسپی

روسی مشن نے اس کشتی کی تفصیلی اطلاع حکومت روس کو دیا۔ شہنشاہ روس راز نے حکم دیا کہ مزید معلومات حاصل کر کے کیلئے بہتر ساز و سامان کے ساتھ مہم روانہ کی جائے۔ اس مہم نے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ تک کشتی نوح کے قریب قیام کیا۔ اس کے نوٹوئے پیمائش کیا اور خوب اچھی طرح اس کا جائزہ لیا۔ کشتی ایسی سکڑی کی بنی ہوئی تھی جو صرف قبریں (سائپرس) کے جنگلات ہی میں پائی جاتی ہے۔ اس پر جو روغن کیا گیا تھا، اس میں اس قدر چکنائی ملی ہوئی تھی کہ ہزاروں برس گزر جانے کے بعد بھی اس کی چمک باقی تھی۔ نیچے کے کمرے وسیع و عریض تھے اور ان میں زرد و ونٹ موٹی لکڑی کے جنگلے لگے ہوئے تھے۔ جو شاید ایتھیوں اور عظیم الجثہ جنگلی جانوروں کیلئے تھے۔ اوپر کا حصہ پرندوں کیلئے مخصوص تھا۔ کشتی کی کاریگری اور نقاشی اعلیٰ تہذیب کی منظر تھی۔

کشتی نوح کی اطلاع۔ آسٹریا ریڈیو سے

دوسری جنگ عظیم کے دوران ڈو آسٹریاوی ہوا بازوں نے انگلستان کے ایک ریڈیو میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو کشتی نوح کی تصویریں دکھلایا تھا۔ آسٹریا ریڈیو اسٹیشن نے مزید بتلایا تھا کہ جنگ کے دوران یہ سادہ دھڑکے میرز کے مقام پر جو رائل کی ایک فائونٹین نے بتلایا تھا کہ وہ شہری نفاذیہ (ROYAL AIR FORCE) کے ایک ایسے نوجوان ہوا باز کو جانتی ہے جس نے کوہ ارات پر پرواز کی اور کشتی نوح کو قریب دیکھا ہے۔ بد قسمتی سے وہ نوجوان جلد ہی ایک حادثہ میں ہلاک ہو گیا اور اس سے مزید معلومات نہ حاصل کی جاسکی۔

حکومت ترکی کے سروے کا نتیجہ

۱۹۶۰ء میں ترکی کا ایک برقی پہاڑ جو ہونی کی رو سے میں تھا، حکومت ترکی کے محکمہ دفاع کیلئے نقشہ بنانے کیلئے مشرقی ترکی کے پہاڑی علاقوں کا سروے کیا اور ہندو ہزار فٹ کی بندی سے ہزاروں منفیاں (NEGATIVES) لئے۔ اور ان میں سے ایک منفی (NEGATIVE) کو دیکھ کر کیپٹن ڈیورنار جو ترکی آرمی کے جوڈیٹک سروے رپارٹمنٹ (GEODETIC SURVEY DEPARTMENT) کا ایک ماہر ملی انیسر تھا، دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔

کشتی نوح کوہ جودی پر

کوہ جودی کے پہاڑی سلسلہ پر تقریباً تین ہزار فٹ کی بندی پر جو گلیشیوز حاصل کی گئی تھیں، ان میں لاوے سے بھرے ہوئے ایک چشمہ میں ایک گڑھی ہوئی چیز نظر آ رہی تھی جو ایک بڑے جہاز کے ماٹل تھی۔ کیپٹن ڈیورنار نے اپنے دوستوں کے اعلیٰ عہدید، ساتھیوں کو وہ گلیشیوز دکھلایا۔ سب لوگوں نے اس بات کی تصدیق کیا کہ جودی پہاڑ کے سلسلوں میں ایک بھاری جسامت والا جہاز موجود ہے۔ چنانچہ اس جہاز کی پیمائش کرنے اور اسکی تفصیلات معلوم کرنے کیلئے احکام صادر کر دیئے گئے۔ نتائج بڑے تعجب خیز اور چونکا دینے والے تھے۔

یہ کشتی نوح کا عرض و طول ہے

کوہ جودی کے پہاڑی سلسلہ کی چھ ہزار فٹ کی بندی پر جو جہاز نظر آیا تھا وہ چار سو پچاس فٹ لمبا اور ایک سو پچاس فٹ چوڑا تھا۔ جہاز کی اندرونی پرچھائیوں کے اندازے کے بموجب اس کی اندرونی گہرائی سوڑ سے (تھارہ فٹ) ہے۔ حالانکہ یہ جہاز ٹھوس لاوے کی وادی میں تقریباً چودہ فٹ کی گہرائی تک دھنسا ہوا تھا۔ نیز یہ بھی محسوس کیا گیا کہ لاوا جہاز کے اندر داخل نہیں ہوا، کیونکہ لاوا اگر اندر جاتا تو اندرون سطح کی اونچائی وہی مورتی جو باہری سطح کی تھی۔

ہواسٹ یونیورسٹی کے ڈائریکٹر کا بیان

ہواسٹ یونیورسٹی کے ڈائریکٹر آر تھو برانڈن برک نے نگیشیوز کی جانچ کرنے کے بعد جو بیان دیا تھا، اُس میں انہوں نے کہا تھا کہ میں نے اس شے سے تعلق رکھنے والی نگیشیوز (NEGATIVES) کی جانچ کر لی ہے۔ بے شک جودی پہاڑ پر ایک جہاز ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ یہاں کیسے آیا ہے۔ میں جو کچھ جانتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ یہاں ایک کشتی ہے۔ کوئی دوسرا ہی اس بات کا پتہ لگا سکے گا کہ وہ یہاں کیسے پہنچی!۔

آرمی جیوڈٹک تجربہ گاہ کے ماہرین

انقرہ کی آرمی جیوڈٹک تجربہ گاہ (ARMY GEODETIC LABORATORY) کے اعلیٰ ذمہ دار عہدیداروں میں سے ایک اعلیٰ ذمہ دار عہدیدار جو فوٹو گرافی کا ماہر تھا، اس نے کہا ہے کہ:-

— یہ شے سڑی کی بنی ہوئی نظر آتی ہے، اور تمام ضروری چیزوں کی حال ہے ہمارے پلاٹ گراف اسٹوڈیو کے ماہرین ہی ان تمام چیزوں کا تعقیب کر سکتے ہیں۔ اور وہی جان سکتے ہیں کہ اس رات جو شے امن کو بھی کشتی نظر آرہی ہے، وہ فی حقیقت کیا شے ہے؟۔ بہر حال اس رات ہم جو کچھ جانتے ہیں وہ من ہی ہے کہ مرنے ایک ایسی چیز دریافت کی ہے جو چند ہزار فٹ کی بندی پر ایک کشتی کے مانند نظر آتی ہے۔ اور ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ ایک تحقیق طلب مسئلہ ہے۔“

مشرقی زرکی کا یہ علاقہ نہایت پرخطر ہے۔ خطرناک درندے اور بھیسے ٹیے غول پہاڑوں میں پھرتے رہتے ہیں۔ انکی خوں خشک کر دینے والی مہیب آوازیں پہاڑی میں چاروں طرف گونجا کرتی ہیں۔

کشتی نوح موجود ہے۔۔۔ مگر کہاں؟

قدیم اور جدید تحقیقات سے اس بات کا اندازہ ضرور ملتا ہے کہ کشتی نوح موجود ہے۔ لیکن ابھی قطعی فیصلہ نہیں دیا جاسکتا کہ کشتی نوح کوہ اراک پر ہے یا کوہ جودی پر؛

نوغزی قبر کے پچھم جانب جس ثنائی مسجد کا ذکر مولوی عبدالکریم انصاری مرحوم نے کیا ہے وہ منہدم ہو چکی ہے البتہ اسکے آثار و باقیات اب تک موجود ہیں! اس مسجد کی قدامت کا اندازہ لوگ آٹھ نو سو سال کرتے ہیں جو مبالغہ آمیز ہے اسکی قدامت زیادہ سے زیادہ تین چار سو سال کے درمیان ہونا چاہیے

نوگزی قبر کے ارد گرد آج سے تقریباً سترہ سو برس پہلے کیوڑے کا
 بہت گھنا جھل تھا اب آبادی ہو جانے کی وجہ سے کیوڑے کا باغ ختم ہو چکا
 ہے۔ بنی نوح کا قبرستان اب محلہ نوگزی قبر کہلاتا ہے اس محلہ کے اندر جگہ جگہ
 پرانے آموں اور کٹھنل وغیرہ کے پرانے درخت اب تک موجود ہیں

کیوڑا مسجد

اب نوگزی قبر کے پاس سے پھر اسی راستے پر آجائے
 جدھر سے آپ نوگزی قبر کے پاس والے میدان میں داخل ہوئے تھے یعنی
 پچھم جانب والے میدان میں آکر عام راستہ سے پورب کی طرف چلے
 تقریباً پچیس تیس میٹر آگے پورب کی طرف اسی راستے پر چلنے کے بعد داہنے
 ہاتھ پر بلندی پر ایک مسجد ہے جسے لوگ کیوڑا والی مسجد کہتے ہیں۔ مسجد کی حالت
 دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دو سو سال پرانہ زیادہ پرانی نہیں ہے
 کیونکہ یہ مسجد ابھی نہایت اچھی حالت میں ہے خشکی کے آثار کہیں سے بھی نظر نہیں آتے
 البتہ نمازی نہ ہونے کی وجہ سے مسجد میں جگہ جگہ درختوں کی پتیوں کا ڈھیر لگا ہوا
 ہے۔ اس مسجد میں پنج وقتہ نماز یا جماعت کا کوئی اہتمام نہیں ہے۔

محمد ہاشم انصاری نے مولف کو بتلایا کہ ادھر گزشتہ چند سالوں سے
 انھوں نے کوشش کر کے اس میں نماز جمعہ کا بندوبست کیا ہے۔ نزدیک و
 دور کے پندرہ بیس نمازی آجاتے ہیں۔ اور نماز جمعہ ہو جاتی ہے۔
 شروع شروع میں جب نماز جمعہ کا اہتمام ہوا تھا اس وقت محمد ہاشم
 انصاری ہی اس مسجد میں امامت کے فرائض انجام دیتے تھے لیکن جب برابر

نماز جمعہ ہونے لگی تو امامت کی ذمہ داریاں دوسرے لوگوں کے سپرد کر دیا۔
آجکل منشی احمد علی صاحب نماز جمعہ کی امامت کرتے ہیں۔

کیوڑا مسجد کے نام کی وجہ تسمیہ معلوم کرنے پر معلوم ہوا کہ پہلے اس مسجد
میں کیوڑا کے درختوں کا باغ لگا ہوا تھا جس کی وجہ سے لوگ اس مسجد کو کیوڑا
والی مسجد کہنے لگے تھے۔ بعد کو لوگ کیوڑا والی مسجد کے بجائے صرف کیوڑا مسجد
کہنے لگے۔ جو اب تک چلا آ رہا ہے اب اس مسجد میں کیوڑا کا کوئی درخت نہیں ہے۔
۱۹۵۰ء سے پہلے تک اس مسجد میں عید بقرعید کی باقاعدہ نماز ہوتی تھی
لیکن بعد کے سالوں میں نہ جانے کن حالات و وجوہات نے اس مسجد کو
ویران کر دیا؟ اب اسے دوبارہ آباد کرنے کی کوشش وجہ جہد کی
جاری ہے۔

مزار مولانا تقی الدین اودھی

کیوڑا مسجد کی پشت سے ایک راستہ اترے پورب کو جاتا ہے
جس پر بیٹوں کا فرش لگا ہوا ہے اس راستہ پر اتر کی جانب تھوڑی دور چلنے
کے بعد آپ سڑک پر آجائیں گے، جو رام داس براس مرحنٹ کی دوکان سے
شروع ہو کر چھوٹی کیٹا مندر کے سامنے سے ہوتی ہوئی اودھ پرکاش پانڈے
کے مکان تک چلی گئی ہے، میں بائیس میٹر داہنے ہاتھ یعنی پورب جانب چلنے
کے بعد پھر مووین چھوٹی کیٹا نامی مندر ملے گا یہ مندر ایک ایک بڑے اور
بلند پھاٹک کے اندر ہے پھاٹک کے سامنے ہی ایک بہت بڑا میدان ہے

جس میں اکثر جگہ آم کے پرانے درخت اب تک موجود ہیں

اس مندر کے پچھلے ملک کے اندر جانے کے بعد ہی جس جگہ سے میدان

شروع ہوتا ہے ٹھیک اسی جگہ داہنے ہاتھ پر تقریباً ایک یا سو ابالشت اونچے

چوڑے پر حضرت مولینا نقی الدین اودھی کا مزار ملے گا۔ جو کافی بوسیدہ

حالت میں ہے قبر پر چونا کی سفیدی کی ہوئی ہے اور مزار کے آس پاس صفائی

ہے ان دونوں باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مندر میں سہنے والے ہیرا کی اس مزار کا کچھ

ادب احترام کرتے ہیں جس کی وجہ سے قبر کی سفیدی اور قبر کے آس پاس صفائی ہے۔

محمد ہاشم انصاری اور بہت سے ہندو مسلمانوں نے مولف کو بتلایا

کہ ۱۱۔ ۱۹۱۰ء تک اس جگہ بیشمار پختہ و خام قبریں تھیں جن میں بہت سی قبریں

صاحب کمال اور صاحب تصرفات بزرگوں کی تھیں جن پر لوگ اکثر فاتحہ

بخرازی اور نذر و نیاز چڑھانے کے لئے آیا کرتے تھے لیکن جب سے یہ

قبرستان مذکورہ مندر کی حدود میں آگیا لوگوں کا آنا تقریباً بند ہو گیا ہے

مندر کے ہیراگیوں نے تمام قبروں کو نیست و نابود کر کے اب اس پر آموں کا باغ

لگا دیا ہے۔

مولینا نقی الدین اودھی حضرت مولانا محمد داؤد صاحب کے برادر زادہ

تھے آپ صاحب کرامت و صاحب تصرف بزرگ ہیں یہ آپ کی روحانی طاقت

کا اثر ہے کہ ہیراگیوں نے اب تک آپ کا مزار باقی رکھا ہے بلکہ مزار کی دیکھ بھال بھی

کے لئے کرتے ہیں۔

۱۲۶۔ حضرت مولینا نقی الدین اودھی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرت بابا زید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔ مولف

بیراگی ہی کرتے ہیں۔ مندر ہی کے رہنے والے لوگوں نے مولف کو بتلایا کہ حبيب بھی کسی نے اس مزار مولینا تقی الدین اودھی کی بھرنی کر کے کارادہ کیا فوراً ہی اسکو کوئی سزا ملی۔

اس مندر کے بیراگی انجان زائر کو خود ہی مزار تک پہنچا دیتے ہیں آپکے فیوض و برکات سے یہ جگہ زمانہ ماضی میں درگاہ علم بخش کے نام سے مشہور تھی۔ اب سے تیس پتیس سال پہلے تک ہر بخشہ کو طالب علم آپ کے مزار پر انوار پر ترقی علم و ذہن کے لئے خصوصیت کے ساتھ حاضری دیا کرتے تھے لیکن اب مندر کے احاطہ کے اندر ہو جانے کی وجہ سے طالب علموں اور دوسرے لوگوں کی آمد و رفت برائے نام رہ گئی ہے۔

مولینا تقی الدین اودھی کے فیوض و برکات کے بارے میں اکثر کتابوں میں لکھا ہے کہ آپ ظاہری و باطنی کمالات میں ہمیشہ تھے۔^{۱۳۹} لطائف اشرفی میں بھی آپ کے مزار کا ذکر موجود ہے جس طرح آپ اپنے زمانہ حیات میں خلق اللہ کو فیض پہنچاتے رہے اسی طرح بعد رحلت بھی لوگ آپ کے فیوض و برکات سے مستفیض ہوتے ہیں۔

مزار خواجہ کڑے شاہ

اسی پرمود بن جھوٹا کبٹا مندر کے باہر واسٹے ہاتھ پر (یعنی اتر جانب) مندر

۱۳۸۔ مولینا محمد داؤد کا مزار موضع گاؤں میں ہے جو فیض آباد سے ۲۳ کلومیٹر پچھم جانب ہے اور شمالی ریلوے کا اسٹیشن ہے۔ مؤلف ۱۳۹۔ یک تن از رجال الغیب فوت شد و برائے زین حضرت جناب مرشد شاہ قدس سرہ آل عہدہ رجال الغیب تجوید فرمودند (اخبار الاخبار)

مذکورہ بالا کے احاطہ کا چاروں طرف کی ساری میں پورے جانب ایک پختہ قبر ہے جسے لوگ خواجہ کرطے شاہ نامی کسی بزرگ کی قبر بتاتے ہیں جو صاحب تصرفات ہیں۔ اس جگہ کے لوگوں کا بیان ہے کہ آج بھی جب کوئی پیرا کی کسی تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے تو آپ کے مزار پر عطر کا پھاہا رکھو اور اگر بیتیاں وغیرہ جلا کر اپنی صحت کے لئے درخواست کرتا ہے اور آپ کی توجہ و برکات سے اللہ تعالیٰ امراض کو شفا کے کلی عطا فرماتا ہے لیکن مؤلف کو لوگوں کے اس بیان سے مباذاری کا شک ہوتا ہے۔ کیونکہ جس مزار کو خواجہ کرطے شاہ کی مزار بتلایا گیا ہے اگر واقعی اس مزار کا پیرا کی ادب و احترام کرنے میں تو گویا اور کوڑا کرکٹ کے انبار جو قبر کے پاس ڈھیر سے لگے ہوئے ہیں کے کیا معنی؟ اسے ادب و احترام کی نشانی تو نہیں کہا جاسکتا!

بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مزار جس مقام پر واقع ہے صاحب مزار کی کسی کرامت ہی کی وجہ سے اب تک باقی رہ گیا ہے ورنہ دیگر مزارات کی طرح جو اس قبر کے ارد گرد تھے کھود کر بھینک دیا جاتا اور اس مزار کا نام و نشان بھی باقی نہ رہ جاتا۔

خواجہ کرطے شاہ کا ذکر مؤلف کو کسی کتاب میں نہیں ملا ممکن ہے کہ کسی دوسرے نام سے کہیں کوئی ذکر ہو لیکن عرف عام میں اس وقت خواجہ کرطے شاہ کے نام سے مشہور ہیں اسی لئے اسی نام کو کتابوں میں تلاش کیا گیا۔ آپ کے حالات و زمانہ سے متعلق بھی کوئی معلومات نہ ہو سکی اور نہ سلسلہ ہی معلوم ہو سکا۔

مزار قاضی طیب صاحب

اسی پر مود بن کٹیا مندر کے پاس ایک مکان کے اندر قاضی طیب نام کے ایک صاحب کرامت بزرگ کا مزار بتایا جاتا ہے۔ جہاں بہت سی کرامات اور واقعات اب بھی لوگ سناتے ہیں جو کہ آپ کا مزار فی الوقت مکان کے اندر وئی حصہ میں ہو گیا ہے۔ اس لئے مؤلف اسے دیکھ نہ سکا کہ اب اس کی موجودہ حیثیت کیا ہے؟ واقعی اب تک مزار موجود بھی ہے کہ نہیں؟ قاضی طیب صاحب کون تھے؟ کس زمانہ میں تھے؟ اس کے متعلق کوئی معلومات حاصل نہ ہو سکی

یسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں قاضی طیب صاحب کے مزار کی حالت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ — اس وقت قناتی مسجد کے صحن میں مزار شریف موجود ہے۔ لیکن شکستہ حالت میں ہے^{۱۴۰} اس ستر بہتر سال کی طویل مدت میں اگر مزار عوام کی توجہی کا شکار رہا ہوگا تو یقیناً اس کا وجود مٹ چکا ہوگا۔

خورد ملہ کا قبرستان | خورد۔ موجودہ پر مود بن کٹیا مندر کے پچاسک سے نکل کر بائیں ہاتھ کی طرف یعنی اتر جانب تیس چالیس میٹر سڑک پر چلنے کے بعد داہنے ہاتھ یعنی پورب جانب

سڑک کو پار کرنے کے بعد گندگی اور غلاظت سے بھرا ہوا ایک باغ ملے گا جس میں بیشمار خورد و جگرلی پودے اگے ہوئے ہیں۔ کبھی یہ قبرستان ایک وسیع احاطہ کے اندر رہا ہوگا۔ کیونکہ قدیم ترین چار دیواری کے باقیات اب بھی جگہ جگہ موجود ہیں۔ باغ کا یہ احاطہ جس کے اندر خورد و جھاڑیاں اگی ہوئی ہیں خورد مکہ کہلاتا چلا آ رہا ہے۔

یہ باغ زمانہ ماضی سے زمانہ حال تک کہلاتا چلا آ رہا ہے۔ انیسویں صدی کے آخری سالوں تک خورد مکہ کا یہ قبرستان پختہ چار دیواری کے اندر تھا۔ جس میں ہزاروں پختہ اور خام قبریں موجود تھیں جس زمانہ میں آج درشن سنگھ نے نالہ کھدوایا بہت سی قبریں اس نالہ میں آکر تلف ہو گئیں^{۱۲۱}۔

مزار علاء الدین خراسانی | اسی خورد مکہ قبرستان میں حضرت

نظام الدین اولیاء محبوب الہی رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور خلیفہ اور ترجیح ہند مایماں کے مصنف حضرت علاء الدین خراسانی کے مزار کے علاوہ ان کے اجداد اور دیگر افراد اور دیگر متعلقین کے مزارات بھی ہیں خورد مکہ کے قبرستان میں آج بھی بہت سی قدیم پختہ قبریں موجود ہیں لیکن مؤلف کو باوجود تحقیق و تلاش کے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ حضرت علاء الدین خراسانی کا مزار کونسا ہے۔

۱۲۱۔ پہلے برساتی نالہ تھا اب گندے نالے کی شکل میں خورد مکہ قبرستان کے پورب جانب سے بہ رہا ہے۔ مؤلف

تو کسی شخص سے کچھ معلوم ہو سکا اور نہ کسی کتاب میں آپ کا ذکر موجود ہے۔ روایت
 بھی کوئی کچھ بتانے والا نہیں ملا البتہ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ بہت بڑے
 باکرامت بزرگ تھے۔ اور غالباً عظیم آباد پٹنہ کے رہنے والے تھے۔ پنجاب
 اور پانی پت وغیرہ کی سیاحت کرتے ہوئے ماہ مارچ ۱۸۷۱ء مطابق ماہ صفر ۱۲۹۰ء
 میں شہر اجودھیا تشریف لائے تھے۔ اجودھیا کی سیاحت اور یہاں کے بزرگوں
 کے مزارات کی زیارت کرنے کے بعد دریائے گھاگھرا کو پار کر کے گونڈہ کی
 طرف جائیکا ارادہ تھا۔

دریائے گھاگھرا کے کنارے بابا گھونا تھ داس بیراگی کی چھاؤنی تھی
 جس میں اسکے سیکڑوں بیراگی چلے رہے تھے ایک دن آپ بھی تفریحاً بابا
 گھونا تھ داس بیراگی کے یہاں چلے گئے تھوڑی دیر بابا گھونا تھ داس
 بیراگی کے پاس بیٹھنے کے بعد واپس آنے لگے تو بابا جی نے اپنے آدمیوں سے
 کہا کہ آپ کو مسافر شاہ کریم بخش راشن دے دو جیسا کہ اس کے یہاں کا دستور تھا
 کہ ہر سادھو فقیر اور درویش وغیرہ کو جو اسکے پاس آتے وہ ان سب کو ایک غراک
 دیتا تھا۔ مسافر شاہ نے فرمایا کہ میں آپ کے پاس راشن لینے نہیں آتا تھا بلکہ آپ کی
 فقیری دیکھنے آتا تھا۔ بابا گھونا تھ داس بیراگی نے آپ کا یہ جواب سن کر بد زبانی کر
 کلمات زبان سے نکالے جس سے آپ کو رنج ہوا جو بخش شاہ صاحب کو بابا گھونا تھ
 داس بیراگی کے آدمیوں نے لاکر دیا تھا۔ اسے آپ نے اسی جگہ موجود ضرورت مندوں
 میں تقسیم کر دیا۔

بابا گھونا سھ داس ہیراگی کی جھادنی سے واپس آکر دریائے کنارے ہی
ایک آم کے درخت کے نیچے کچھ دنوں کیلئے مقیم ہو گئے اور بابا گھونا سھ داس ہیراگی
کی طرح روزانہ غریبوں اور محتاجوں کو جنس تقسیم کرنے لگے اس طرح لوگ
روز بروز آپکی طرف رجوع ہوتے لگے۔

مولوی عبدالکریم انصاری مرحوم نے آپکے حالات میں تحریر فرمایا ہے
کہ آپکے مختصر قیام کے زمانہ میں اتفاقاً اجودھیا میں دہائی بیماری پھوٹ پڑی تھی
اور لوگ بڑی تعداد میں مرنے لگے تھے۔ اس موقع پر بہت سے لوگ آپکی دعاؤں
سے صقیاب ہوئے جسکی وجہ سے بڑے بڑے لوگ مستفد ہو گئے تھے۔

شاہ مسافر کے حالات میں آپکی اس کرامت کا واقعہ بھی لکھا ہے کہ اس دہائی
بیماری میں ایک جوان لڑکا مر گیا لوگ اس لڑکے کو لیکر شاہ صاحب کی خدمت
میں حاضر ہوئے لڑکے کو دیکھتے ہی شاہ صاحب کے منہ سے نکل گیا کہ یہ تو
زندہ ہے۔ پھر آپنے دو کھنکریاں لیکر اس مردہ کے کان (دو) کے نیچے اوپر پر
رکھ کر دبا دیا۔ لڑکا آپکے حکم سے اَللّٰہ کا لفظ کہہ کر اٹھ بیٹھا۔ آپکی اس کرامت سے
خلق خدا ٹوٹ پڑی۔ بابا گھونا سھ داس ہیراگی جو درویش کامل ہوئے کا دعویٰ کرتا
تھا آپ سے حسد کرنے لگا۔ آخر کاہ ۹ مئی ۱۸۷۵ء مطابق سرربیع الثانی ۱۲۹۲ ہجری
بروز اتوار رات کے وقت لاٹھیوں سے مار کر آپ کو شہید کر دیا۔ اجودھیا شہر کے
مسلمانوں نے آپ کو اس خور و مکہ کے قبرستان میں دفن کیا۔ لوگ بیان کرتے ہیں کہ شہادت
کے وقت سے لیکر دفن کرنیکے وقت تک آپکے جسم سے برابر تازہ خون نکلنا جاری رہا
فی الوقت آپ کے مزار کے پائنتی گوبر اور کوڑے کا انبار ہے اور مزار کے

اور گرد کافی گندگی ہے مؤلف کو کچھ ایسا محسوس ہوا کہ اب لوگ مسافر شاہ شہید کو بھول چکے ہیں۔ اور ان سے متعلق بے سرو پا کرامات ہی انکی یادوں کا سرمایہ رہ گئی ہیں۔

مسافر شاہ کامزار اب اس قدر گناہی کی حالت میں ہے کہ شاید ہی کبھی کوئی زائر آتا ہو۔ مسافر شاہ کا اصل نام کیا تھا۔ اس کے متعلق کسی ذریعہ سے کوئی معلومات حاصل نہ ہو سکی۔ قیاس ہے کہ آپکی شہادت چونکہ مسافرت کے عالم میں ہوئی تھی۔ اور کوئی شخص آپکے نام اور دیگر تفصیلات سے واقف نہ تھا اس لئے آپ مسافر شاہ کے نام سے مشہور ہو گئے۔

اب خوردمک کے قبرستان سے
محلہ تھوٹی دیو کالی سے پچھم جانب

مزار شمس الدین فریادرس

والی سڑک سے ہوتے ہوئے بکسریا ٹولہ نامی محلہ میں آئے اور سنیہ ساگر (सत्यसागर) جسے اٹوانالاب بھی کہتے ہیں اس تالاب کی طرف نظر کیجئے تو تو شہزادی صاحب (ولد) کے مکان کے پاس ایک بلند

قطعہ ارضی پر پورب جانب ایک نہایت شکستہ دہشتہ حال چار دیواری نظر آئیگی۔

اب سے تقریباً سنی پچاسویں سال قبل یہ ایک پختہ احاطہ تھا اب اس احاطہ کی پچھم طرف کی دیوار منہدم ہو چکی ہے۔ اتر پورب اور دکھن کی دیواریں ابھی باقی رہ گئی ہیں۔ جو نہایت خستہ حالت میں ہیں اور امید ہے کہ آئندہ دو تین سالوں کی برسات میں یہ دیواریں بھی زمین بوس ہو جائیں گی۔

یہ وہ احاطہ ہے کہ جس کے اندر حضرت مخدوم جہانگیر اشرف سمنانی (رحمۃ اللہ علیہ) کے خلیفہ اعظم حضرت شاہ شمس الدین فریادرس جو خواب

میں اس احاطہ کو دیکھنے کے بعد ایسا احساس ہوتا ہے کہ نہ ماہِ دراز سے
یہ جگہ مسلمانوں کی عدم نوجہی کا شکار رہی ہے فی الوقت احاطہ مذکور
کے اندر خود ردچوڑ کے پودوں کا جنگل ہے مزار پر ایک قدیم پار کا درخت
سایہ کئے ہوئے ہے۔

نظامِ مہنی مؤلف لطائفِ اشرفی نے لکھا ہے کہ حضرت مخدوم اشرف سمنانی
جب پہلی مرتبہ کچھوچہ شریف لائے وہ اسی وقت سے اپنے اکثر احباب سے کہا
کرتے تھے کہ اودھ اچودھیا سے ایک دوست کی خوشبو آ رہی ہے چنانچہ
کچھ دنوں کے بعد آپ اچودھیا شریف لائے اور ایک مہینہ میں قیام فرمایا تو
اکابر شہر ملاقات کے لئے آئے ان ملاقاتیوں میں ایک نوجوان شمس الدین نامی بھی
تھے جو علوم ظاہری کی تکمیل کر چکے تھے۔ اور فضائل صوفیہ کی تلاش میں تھے حضرت
مخدوم نے فرمایا کہ شمس الدین! میں تیرے کمالے یہاں آیا ہوں۔

سیرۃ الاشرف میں مرقوم ہے کہ چند دنوں کے بعد حضرت مخدوم سمنانی نے
شمس الدین کو خلوت میں بٹھایا اس دن میں شمس الدین داتا گاندیؒ کا نزول ہونے لگا۔ افسر
ایسا بڑھا کہ ضبط نہ کر سکے اور خلوت سے باہر نکل پڑے خادم انکو گھنچ کر خلوت میں
لے گیا۔ اور دروازہ مضبوط بند کر دیا جب خلوت تمام ہوئی خرقہ عطا ہوا۔

لطائفِ اشرفی کے بموجب حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی فرماتے تھے
کہ "اشرف شمس الدین اشرف"۔ یعنی ہم دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں۔

کچھ دنوں بعد اچودھیا میں قیام کے بعد حضرت مخدوم اشرف سمنانی صاحب

سجود، لکھنؤ، جالس ہوتے ہوئے کچھ چھ والیں تشریف لے گئے۔ انھیں دنوں
اجودھیا کے ایک منصب دار رئیس سیف خاں اپنے ندیوں کیساتھ قد موسیٰ کیلئے حاضر
ہوئے۔ کچھ دنوں بعد سیف خاں کو حضرت مخدوم اشرف سمنانی نے مرید کیا انھیں
سیف خاں کے اصرار پر حضرت موصوف نے اودھ (اجودھیا) میں اپنے لئے
ایک خانقاہ بنوائی جس میں شیخ شمس الدین رہتے تھے۔^{۱۲۵}

بحرِ خار میں لکھا ہے کہ حضرت شمس الدین فریادرس کے لقب سے
مشہور ہوئے۔ انکا مزار اودھ میں حاجت روائے خلق ہے جس شخص کو کوئی اہم
بیش آئے وہ شیخ فریادرس کے مزار کی طرف رخ کر کے فاسحہ پڑھے تو اس کی حاجت
پوری ہو جاتی ہے۔ سیرۃ الاشرف میں فاسحہ پڑھنے کی ترکیب اس طرح لکھی ہے کہ ایک بار
سورہ فاسحہ تین بار سورہ اخلاص ایک مرتبہ آیتہ الکرسی اور ایک بار درود پڑھے^{۱۲۶}
اکثر لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر کوئی شخص آدھی رات کے وقت آپ کے مزار پر
حاضر ہو کر اپنی حاجت بیان کرے تو اللہ تعالیٰ آپ کی دعاؤں اور توجہ کی برکت
سے حاجتمند کی حاجت کو پوری کر دیتا ہے

سلاطین دہلی نے حضرت شمس الدین فریادرس کی مزار و درگاہ کی
مرمت اور اخراجات عرس و عزیزہ کے لئے درگاہ کے قریب ہی ستر بیگہ
پختہ کی آراضی عطا فرمایا تھا۔^{۱۲۷}

درگاہ کور کی ویرانی کے اسباب و وجوہات معلوم کرنے پر حقیقت
واضح ہوئی کہ جس شخص کے نام سند معانی عطا ہوئی تھی اسکی ناخلف

اولادوں نے نہ صرف درگاہ شریف ہی کو ویران کر ڈالا بلکہ درگاہ کے احاطہ کے اندر واقع درختوں کو بھی بیڑگیوں کے ہاتھ بیچ کر کھا گئے، آج اس درگاہ کا چہ چہ اپنے مسلمان کہلانے والے سپوتوں کے کارناموں پر نوحہ خواں ہے۔

حضرت شاہ شمس الدین فریادرس نے، محرم الحرام سنہ ۱۰۰۰ ہجری قمری
بروز جمعہ مطابق ۲۲ ستمبر سنہ ۱۹۸۱ء داعی اجل کو لبیک کہا۔ مؤلف
قطعہ تاریخ وفات یہ ہے۔

یہ ہفتم محرم کہ روز جمعہ

رسیدند رضواں مثال شمع

کہ بالملک علوی شد ہم مقال

حضرت شیخ شمس الدین فریادرس کی خانقاہ

کے پیچھے یعنی کچھم جانب بیسویں صدی کی ابتدا

دہائیوں تک ایک قدیم مسجد اور خانقاہ کے باقیات موجود تھے معتبر اور ضعیف العمر

لوگ آج بھی بتلاتے ہیں کہ اس جگہ پر سید شاہ عثمان اور سید رضی اور سید رضی

وغیرہ نامی بزرگوں کی قبریں تھیں اور لوگ اکثر ان مزاروں پر فاسخ خوانی کے

لئے آیا کرتے تھے۔ اور فیوض و برکات حاصل کرتے تھے۔ آج اس جگہ

پر نہ کسی مسجد و خانقاہ کے باقیات کے آثار موجود ہیں اور نہ گمان ہوتا

ہے کہ یہاں پر کبھی کوئی مسجد و خانقاہ رہی ہوگی۔ ان بزرگوں کی قبروں کے

نشان تک مٹ چکے ہیں۔

لوگ اس وقت جس جگہ پر سید شاہ عثمان اور سید رضی اور سید رضی

وغیرہ بزرگوں کی قبروں کی نشاندہی کرتے ہیں وہ سرسبز کھیت کا درمیانی حصہ ہے۔ اس قبرستان کا تمام علاقہ اب ذرا عمتی آرا ضعی میں تبدیل ہو کر کھیت بن چکا ہے۔

ان تینوں بزرگوں کے متعلق بھی کوئی معلومات نہ حاصل ہو سکی کہ یہ کون کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے؟ کس کے عہد حکومت میں آئے اور ان کا سلسلہ کیا تھا اور کب انتقال کیا؟

مزار جمال اولیاء

اسی بحر باٹولہ محلہ کے پچھم جانب محلہ سید واڑہ ہے۔ اس محلہ میں علامہ صاحب کے مکان کے پچھم جانب اب سے تقریباً ایک سو برس قبل ایک شکتہ احاطہ موجود تھا۔ لوگ بتلاتے ہیں کہ انھوں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ اس احاطہ میں جمال الدین اولیاء نامی ایک بزرگ کا مزار تھا لیکن اب اس جگہ نہ کوئی احاطہ موجود ہے اور نہ اس کے باقیات و آثار باقی ہیں البتہ کچھ شکتہ مزارات اس جگہ ضرور ہیں جن میں ایک شکتہ مزار کے بارے میں اکثر لوگوں نے بتلایا کہ یہی حضرت جمال الدین اولیاء کا مزار ہے۔

مزار کی حالت اور اس کے آس پاس کی افتادہ زمین کو بغور دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اب شاید ہی کبھی کوئی شخص اس جگہ فاسخ خوانی کیلئے آتا ہوگا۔

مزار حضرت کمال الدین

آپ کے بارے میں کوئی تفصیلی معلومات نہ حاصل ہو سکی۔
جس زمانہ میں حضرت جمال الدین اولیاء کا حاطہ موجود تھا اس وقت اس اساطہ
کے اندر ہی پور بی گوشہ میں حضرت کمال الدین صفا کا مزار تھا جو آپ کے برادر
حقیقی تھے۔

صمد اللہ صاحب کے مکان کے پاس پچھم جانب جو چند شکستہ قبریں ہیں
مکن ہے کہ انھیں میں توں بہ حضرت کمال الدین صاحب کی بھی ہو لیکن مؤلف کو
نشاندہی نہ کرائی جاسکی۔

مسجد فریدی

حضرت شاہ شمس الدین فریادرس رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ سے پچھم جانب
محلہ بگم پورہ ہے۔ اس محلہ میں لب سڑک ایک بہت پرانی قناتی مسجد تھی جسے
لوگ فریدی مسجد کہتے تھے۔ مولوی عبدالغفار کے بموجب ۱۹۲۰ء کے
درمیان مرزا احسن علی کے لڑکے احمد مرزا نے سفالہ پوش کرادیا تھا۔

مسجد مذکور کا ذکر جس انداز میں مولوی غفار صاحب نے کیا ہے۔
ضروری تھا کہ اس مسجد کا اگر کوئی تاریخچی پس منظر ہوتا تو اسے ضرور بیان کرنا چاہئے
تھا۔ ورنہ اس کا ذکر کیا ضروری تھا؟ اجمودھیا میں بیشمار مساجد ہیں۔ ان میں
ہر ایک مسجد کا کوئی نہ کوئی نام بیکر تاریخچی معلومات کا رعب تو ڈالا ہی جاسکتا

ہے۔

مزار فرید الدین قتال

لوگ بتلاتے ہیں کہ فریدی مسجد کے صحن میں حضرت عبدالرزاق نور الدین
کچھو چھوی کے ہمیشہ زادہ حضرت مخدوم اشرف جہانگیر صمنانی (رحمۃ اللہ علیہ)
کے پانچ صاحبزادوں میں سے ایک صاحبزادہ حضرت فرید الدین قتال کا مزار ہے^{۱۲۸}

کالے پہلوان کا مزار حضرت شیخ شمس الدین فریادرس رحمۃ اللہ
کی درگاہ کے دھن جانب ٹیلہ پر جہاں

فی الوقت ہر پنجوں اچاروں کی بستی ہے اس بستی میں ایک شکستہ قتالی مسجد ہے
جس کے صحن میں دو پختہ قبریں ہیں جو اب تک اچھی حالت میں ہیں۔ ان دو قبروں
میں جو قبر بچھم جانب ہے اس کے متعلق لوگ بتلاتے ہیں کہ یہ کالے پہلوان
کی قبر ہے۔

مولوی سید عبدالغفار نے لکھا ہے کہ کالے پہلوان کے مزار کے احاطہ
میں زمانہ ماضی میں شاہی کچہری تھی اور اس وقت عدالت شاہی سے کچھ سکے
راج الوقت ہر جمعرات کے دن برائے فاسخہ و روشنی مزار کے لئے مقرر رہتا
کچہری کا مکان ایک زمانہ ہوا نیست و نابود ہو چکا ہے اب اس کے آثار بھی نہیں
معلوم کئے جاسکتے۔

مؤلف گم گشتہ حالات ابودھیائے کالے پہلوان کا ذکر اس انداز میں

کیا ہے جیسے وہ کوئی بہت بڑے بزرگ یا اولیاء اللہ تھے حالانکہ حقیقت
برعکس ہے۔ کالے پہلوان کے ساتھ عوام کی عقیدت ان کے پہلوان کے فن
کیوجہ سے تھی نہ کہ کوئی روحانی عظمت و بزرگی کے سبب

بعض کتابوں میں کالے پہلوان شہید نام کے کسی شہید کا نام مؤلف
کی نگاہ سے گذرا ہے اگر یہ مزار کالے پہلوان شہید کا ہے تو مؤلف گم گشتہ حالات
اجودھیا کو بالتصریح لکھنا چاہئے تھا۔ لیکن کالے پہلوان شہید کے مزار و
بیرون حدود شہر اودھ، کو اندرون شہر اودھ، کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے

بند گنبد یا بند مقبرہ | کالے پہلوان یا کالے پہلوان شہید کے مزار
سے چند میٹر دھن جانب چلنے کے بعد ایک

تراپا ملتا ہے تراپے سے پورب جانب جو پختہ سڑک کو جاتی
ہے اس پر چند میٹر پورب جانب چلنے کے بعد سڑک کے اتر جانب یعنی
بائیں ہاتھ پر سطح زمین پر بنا ہوا ایک مقبرہ نظر آئیگا جو اب سے تقریباً پچاس
ساتھ سال پہلے ہر چار جانب سے بند تھا۔ یعنی مقبرے کے اندر قبر تک جا
کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اور شاید اسی وجہ سے لوگ اس مقبرہ کو بند مقبرہ
یا بند گنبد کے نام سے پکارنے لگے۔

چونکہ ایک زمانہ سے عوام و خواص اس گنبد کو اسی طرح ہر چار
جانب سے بند دیکھتے چلے آ رہے تھے اس لئے ہر زمانے میں لوگ اس
کے متعلق مختلف قیاس آرائیاں کرنے رہتے تھے۔ زمانہ ماضی میں
یہاں کے عوام میں مشہور تھا کہ یہ کسی بہت بڑے بزرگ دین یا اولیاء

اللہ کا مقبرہ ہے جنہوں نے اپنی زندگی ہی میں اس مقبرہ کے اندر بیٹھ کر
اس کو ہر چہار جانب سے بند کر دیا تھا۔ بعد کو ان کے معتقدین نے ان کی
وصیت کے مطابق اس پر ہر چہار جانب چوڑے کا مضبوط پلاستر کروا
دیا تھا۔

کچھ لوگ بیان کرتے تھے کہ اس مقبرہ کے اندر ایک بالکال بزرگ
”جس دم“ کئے ہوئے ہیں۔ اگر مقبرہ کھول دیا جائے تو وہ بزرگ ”
جس دم“ کی ہوئی حالت میں ملیں گے۔

الغرض اسی قسم کی نہ جانے کتنی بے سرو پا روایات عوام میں
مشہور تھیں لوگ ان بیشمار روایات کی سہول بھلیوں میں گم ہو کر حقائق
سے اس قدر دور ہو گئے تھے کہ اب صداقت کی تلاش و جستجو کا تصور بھی
ذہن پر بار ہوتا تھا۔ اور کسی کو کیا پڑی تھی کہ وہ کسی مدفون صداقت
کو فراموشی کے غمق غار سے باہر نکالنے کی جدوجہد میں اپنے مصروف
اوقات کو ضائع کرتا جنہیں اس بزد گنبد یا بند مقبرہ کا راز کا علم تھا کہ یہ
مقبرہ امیر الدولہ جدر بیگ خاں کے بڑے بھائی نور بیگ خاں بہادر
کی داکنی آرام گاہ ہے وہ مصلحتاً خاموش تماشائی تھے۔ ان کا خیال تھا
کہ افشائے راز سے وقت کے ساتھ ساتھ مندر مل ہونے والے زخم
بھر ہرے ہو جائیں گے اور نور بیگ خاں کے مظالم اور شقاوت کی
تمام مہوئی اور سچی داستان جو اس وقت لوگوں میں چنگیز خاں اور ہلاکو
خاں کے روئے کھڑے کر دینے والے قصوں اور کہانیوں کی طرح بیان

بے فرش کا دھنسا ہوا حصہ اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ یہی نور بیگ خاں بہادر کی اصل قبر ہے جو سبھی مصالح کی بنا پر فرش زمین کی برابر ہی بنادی گئی تھی۔ اور ایک پختہ مصنوعی قبر بنا کر، انور بیگ کی قبر کی بھرتی کے امکانی خطرات کا دفعہ کر دیا گیا تھا۔

مولوی عبد الغفار نے لکھا ہے کہ اس جگہ کے قبرستان کی تمام قبریں "سید احمد" بانیسی کے خاندان والوں کی ہیں جو نواب شجاع الدولہ بہادر کے عہد میں الہی پٹن کے افسر تھے۔ جس میں بانیس سو اودو ہزار دو سو اودو سپاہی تھے۔ ۱۴۹۔ مولوی صاحب کی تاریخ دانی پر سر دھنئے۔ اور گھر کی بات سے اتنی بخبری پر آنسو بہا ہے ان پچاسے کو کل کی یہ بات بھی معلوم نہیں کہ نواب شجاع الدولہ کے پاس بانیس ہزار بانیس سو نہیں۔ مولف ہندو فوجوں کی ایک پٹن تھی جس کا ہر سپاہی بانیسی کہلاتا ہے اس پٹن کے سپہ سالار اعظم سید احمد بالنسی والا تھے ۱۵۰۔ نواب مرتضیٰ خاں رنج، سید احمد بالنسی والا، میرالو البرکات، جو کاکوری کے شیخ زادوں میں سے تھے اور بہت تجربہ کار تھے تاریخ آصفی صفحہ ۲۶۰ شیخ احسان وغیرہ جو نواب شجاع الدولہ مرحوم کے

۱۴۹۔ صفحہ ۲۸

۱۵۰۔ تفسیر الغالین کے مقدمہ میں مرزا ابوطالب صفہانی نے لکھا ہے کہ میر احمد نے شریف لوگوں کو اکٹھا کر کے انہیں فید والی بندوق دیکر اصلاحات اور حرکات کے قواعد سکھائے تھے اور انگریزی فوج کی طرح اسنے بھی فوجی عہدہ پر مقرر کئے تھے اس فوج کے سپاہی نوپ اور بندوق بڑی تیزی اور ہوشیاری سے چلاتے تھے۔ مولف ۱۵۱۔ گذشتہ اکھنڈ صفحہ ۱۵۱

معتمد فوجی افسران تھے۔ فیض آباد میں جگہ کی تنگی کی وجہ سے اجودھیا اور
فیض آباد کے درمیان خیموں میں رہنے لگے۔ ان سب کے خاندان کے
افراد کی قبریں جگہ شہید اور بڑی بڑا صاحبہ کے قبرستانوں میں تھیں۔
حیدر بیگ خاں اور نور بیگ خاں کے قریب میں ان لوگوں میں سے
کسی ایک شخص کے افراد خاندان کا قبرستان ہونا یوں بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان
لوگوں میں سے کسی ایک شخص کے بھی تعلقات حیدر بیگ خاں سے اچھے نہیں
تھے۔

اور نہ ہی حیدر بیگ خاں ان میں سے کسی کا قرابت دار تھا دوسرے یہ کہ کسی
بزرگ دین یا اولیاء اللہ کی قبر کو اس طرح محفوظ کراد بنا کہ لوگ اس کی بستی
نہ کرنے پائیں بڑی عجیب اور مضحکہ خیز بات ہے جسے تسلیم کرنے کے لئے
کوئی سنجیدہ ذہن کبھی تیار نہیں ہو سکتا۔

امیر الدولہ حیدر بیگ خاں کا بڑا بھائی نور بیگ خاں اپنی سخت
گیری خود غرضی، بے مروتی اور نفس پرستی و بددیانتی و غیرہ میں یگانہ روزگار
تھا۔ رعایا اس کے ظلم و جبر اور تشدد و ہلاکت خیزی سے نالاں تھی۔ ان دونوں
بھائیوں نے راجہ جی بہادر کے نیابت کے زمانہ میں پرگنوں کی آمدنی میں
خیانت کر کے خوب دولت و شہرت حاصل کیا تھا۔ جب نواب شجاع الدولہ
مرحوم کو ان دونوں بھائیوں کے کارناموں کی مفصل اطلاع ہوئی تو انھوں
نے دونوں بھائیوں کو گرفتار کر کے سخت تقاضا کیا لیکن جب تحصیل وصول
کرنے والا کو کچھ ملنے کی امید نظر نہ آئی تو انھوں نے دونوں بھائیوں کو دھوپ

میں لپی لپا کر لائوں، گھونسوں، اور جوتوں سے دل کھول کر، مرمت کرنا شروع کر دیا۔ نور بیگ خاں بہادر نو" بھرتا جگر وہیں کیفر کردار کو پہنچ گیا جیدریگ خاں بھی مرنے کے قریب تھا کہ بہادر علی خاں نے اس پر رحم کھا کر اسکی مرمت کا حال نواب بیگم والدہ شجاع الدولہ تک پہنچا دیا جب جم کی یہ درخواست نواب بیگم صاحبہ سے کی گئی تو ان پر رحم علی طاری ہو گئی جو عورتوں کا لازمی خاصہ ہے۔ بیگم صاحبہ نے نواب شجاع الدولہ کو بلا کر کہا، اب بہت ہو چکا کیوں عزیز کی جان کے لالے پڑے ہو! درگزر کرو، کہہ کر معاملہ رفع و دفع کر دیا۔ اور اس طرح جیدریگ خاں اپنی ہلاکت سے بچ گیا۔^{۱۵۲}

نور بیگ خاں کی سقی القلبی، ہلاکت خیزی، بے ایمانی و غابازی کی حرکات رعایا کو بوٹنے اور انکی بھولیسوں کو زبردستی آلہ کار بنانے کی بہت سی طویل اور لرزہ خیز داستانیں ہیں۔ رعایا میں اس کے خلاف زبردست نفرت و غصہ پایا جاتا ہے۔ اسکی علاوہ عتاب الہی کے نزول کا بھی خون تھا۔ اور ان تمام سیاسی اسباب کی بنا پر نور بیگ خاں بہادر کے چھوٹے بھائی امیرالدو جیدریگ خاں نے اپنے بڑے بھائی نور بیگ خاں بہادر کی قبر کو ایک مصنوعی پختہ قبر کے ساتھ مغرہ کے اندر محفوظ کر دیا تھا۔ اور تقریباً ڈیڑھ صدیوں تک مغرہ بند رہنے کے بعد قدرت نے بارش کو ایک بہانہ بنا کر نور بیگ خاں کی قبر کو دیدہ بینا کو عیرت و نصیحت کے لئے کھول دیا۔ مولوی سید عبدالغفار نے بلا علم و بغیر تحقیق دعوائے ہمدانی کے اظہار کیا

لئے وہ بائیں لکھڑا لاجونہ لکھنے سے کہیں زیادہ بہتر رکھا۔
 نور بیگ خاں بہادر کے مقبرہ کو کسی بزرگ یا اولیاء اللہ کا مقبرہ باور
 کرانا یا خود نور بیگ خاں کی شخصیت کو صالحین کی کسی صف میں کھڑا کرنا اب
 شاید مولوی صاحب کے بس کی بات نہیں رہ گئی ہے۔

قبر کمال الدین شہید

گم گشتہ حالات اجودھیا میں لکھا ہے کہ محلہ سید واڑہ کے اتر جانب
 لب دریا آراضی قلعہ مبارک مشہور ہے یہ قلعہ بادشاہ سکندر لودی نے تعمیر
 کرایا تھا اس قلعہ کے دروازہ کے سامنے ہی کمال شہید کا مزار تھا لیکن
 اب نہ سلطان سکندر لودی کا تعمیر کرایا ہوا قلعہ باقی ہے نہ قلعہ کا دروازہ اور
 نہ دروازہ کے سامنے کمال شہید کا مزار۔

باطن ہر ذرہ عالم مزار پار دہے
 اور خاموشی بے ہستی پہ آہ سرد ہے

مسجد قلعہ مبارک

کمال شہید کے مزار کے ساتھ سلطان سکندر لودی کی تعمیر کرائی ہوئی
 قلعہ کی مسجد کا بھی ذکر کیا گیا ہے ۱۹۲۰ء تک یہ مسجد شکستہ حالت میں موجود تھی
 اب دریا بڑھ چکی ہے۔

لوگ بتلاتے ہیں کہ اس مسجد کے اتر جانب نمازیوں کے وضو کرنے

کے لئے دریا میں پانی تک پہنچنے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں مولوی
عبدالکریم انصاری مرحوم نے ان سیڑھیوں کو "رحمن گھاٹ" کے نام
سے ذکر کیا ہے۔ تقسیم ملک کے بعد جب ہندوستان آزاد ہوا تو سوبائی
حکومت نے رحمن گھاٹ کو از سر نو نمبر کرایا اس سے متصل لچمن گھاٹ
ہے۔

مسجد سورگ دواری

سلطان سکندر لودی کے قلعہ کی مسجد کے پورب جانب دریائے
گھاگھرا کے کنارے محلہ سورگ دواری ہے۔ اس محلہ میں شہنشاہ شاہ جہاں
کی بنوائی ہوئی ایک نہایت خوبصورت مسجد تھی جو سارے ہندوستان میں
مسجد سورگ دواری (सुरगद्वार) کے نام سے مشہور تھی بیسویں
صدی کی اول ربیعہ صدی کے بعد تک اسکے دو بلند مینار موجود تھے ۱۹۶۱ء
میں بابو پریم دت رام نے اپنی چیرمینی کے زمانہ میں سرکار کی اجازت سے اتر
جانب کا مینار منہدم کر دیا تھا کیونکہ وہ مخدوش ہو گیا تھا۔ اب صرف
ایک ہی باقی رہ گیا ہے جنوبی مینار، شہر فیض آباد اور اجودھیا میں شاہی خانہ
کی بیشمار مساجد ہیں لیکن کسی ایک بھی مسجد کا مینار اس قدر بلند ہے۔

یہ مسجد اب بھی موجود ہے لیکن انتہائی خستہ حالت میں ہے اس وقت
صرف ایک جنوبی مینار اور کچھلی دیوار باقی رہ گئی ہے اس مسجد کے دکھن
جانب مدرسہ و مکانات کے باقیات کے آثار بیسویں صدی کی پہلی دہائیوں

کے بعد تک موجود تھے اب ان کے آثار و نشانات بھی مٹ چکے ہیں۔
 مسجد سورگ دواری کو شہنشاہ شاہجہاں نے بنوایا تھا اسکی نگہداشت
 اور مرمت کے لئے ایک فرمان معافی جس کی اراضی ضلع گونڈہ میں تھی ملا
 تھا۔ ۱۵۳

زمانہ ماضی میں اس مسجد کے دکن جانب درس و تدریس کے لئے
 درسگاہیں اور اساتذہ کی رہائش کیلئے مکانات بنے ہوئے تھے مولوی
 عبد الکریم انصاری مرحوم نے لکھا ہے کہ اس درسگاہ میں حضرت ابراہیم شاہ
 صاحب درس و تدریس کے علاوہ وعظ و نصیحت بھی دیا کرتے تھے۔
 مؤلف گم گشتہ حالات اجمودھیا کے بموجب اس درسگاہ کے تین چار
 کمروں میں شاہ ابراہیم صاحب کا عظیم الشان کتب خانہ تھا جس میں بیشمار قیمتی
 اور نایاب کتابیں موجود تھیں۔ کچھ نوادرات اور تبرکات بھی تھے۔ یہ
 عظیم الشان کتب خانہ اور نوادرات و تبرکات انکے اخلاف نے اپنی غربت
 و جہالت کی بنا پر تباہ و برباد کر ڈالا۔ ساری کتابیں ردی کاغذوں کے بھاؤ
 میں بیوں اور کباڑیوں کے ہاتھوں بیچ دی گئیں۔ ۱۵۴
 شاہ ابراہیم صاحب کی وفات کے بعد انکے پوتوں اور نواسوں کی حالت
 زار کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ آپکے نواسوں اور پوتوں میں اس قدر
 بے علمی تھی کہ وقت تقسیم ترکہ آبائی کتابوں کو ترازو میں تول کر بانٹا گئے۔

ایک عالیشان مسجد کے باقیات | مسجد سورگ دواڑی، اجماع الکھار

پرنوا میں اودھ کی حکومت کے زمانہ میں ایک نہایت عالیشان اور مضبوط مسجد تھی جو طلب دریا ایک بلند مقام پر واقع تھی صاحب تاریخ پارسہ مدینہ الاولیاء نے لکھا ہے کہ یہ مسجد الہ جانی گھاٹ پر لب دریا ایک بلند مقام پر واقع تھی۔ مسجد مذکور کے باقیات دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مسجد نہایت مضبوط بنی رہی ہوگی۔ اب پچھلی دیوار اور سامنے کے در کھڑے ہوئے ہیں یہاں کے ممبر لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ مسجد مسجد سورگ دواڑی کے بعد کے زمانہ میں تعمیر ہوئی ہے۔ لیکن کس بادشاہ کے عہد حکومت میں یہ مسجد تعمیر ہوئی؟ اور کس شخص نے بنوایا تھا؟ اس کے بارے میں کوئی معلومات نہ حاصل ہو سکی۔

۱۵۴۔ مولوی عبدالغفار مرحوم نے اپنے والد مولوی عبدالرؤف انصاری مرحوم کے حوالے سے لکھا ہے کہ ستر کے مین چار بڑے کمروں میں نایاب اور قیمتی کتابیں بھری تھیں تبرکات میں حضور بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا موسے مبارک اور ایک پٹارا، میں خرقہ مبارک تھا آٹنے تبرکات کی فہرست میں ایک عصا کا بھی ذکر کیا ہے لیکن یہ نہیں تحریر فرمایا کہ یہ عصا کس کا تھا۔؟ اور موسے مبارک اور خرقہ کے متعلق تحریر فرمایا کہ یہ تبرکات حضرت شاہ بہیم صاحب تک کس دار ہوں سے پہنچا تھا؟ — قباس ہے کہ یہ نام تبرکات و نودرات کے اٹھے وارثان کی کم علمی اور بے محنتی کے سبب تلف ہو گئے کیونکہ بسیار تلاش و جستجو کے باوجود کسی کے پاس موجر ہوئے کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ مؤلف

یہ بھی ہوا تھا

اس عالیشان مسجد کے بارے میں انگریزی عملداری کا یہ واقعہ بھی لکھا ہوا ہے کہ :-

— ۱۸۶۴ء میں رام شاستری نامی پنڈت نے شمال کی طرف پشتہ سے ملا کر مکان اپنی نشست گاہ کا بنالیا حکام کو اطلاع دی گئی اس وقت ڈپٹی کمشنر نے حکم دیا کہ اگر اہل اسلام اس کی مرمت نہ کریں گے تو یہ مسجد نیلا کر دی جائے گی۔ اہل اسلام نے یہ ضامن علی تحصیلدار کی کوشش سے چندہ جمع کر کے پہلے احاطہ اور جنوبی برج جو کہ گر گر راستہ میں پڑا ہوا تھا بنوایا۔ جب تعمیر برج شروع ہوئی تو رام شاستری نے راجہ مان سنگھ کو براہِ تختہ کیا۔ راجہ صاحب اس وقت کمشنر صاحب کے ہمراہ تحصیل کمشنر صاحب پر پرگنہ رول میں موجود تھے انھوں نے دو چار چٹھی کمشنر صاحب کے نام سے اس قسم کی چھپو میں جسکا یہ مضمون تھا کہ مسلمان سب الہ جانی گھاٹ کی مرمت جو مندروں کے درمیان ہے، کرانا چاہتے ہیں۔ اہل ہندو بلوہ پر آمادہ ہیں اور اس قدر مجمع ہے کہ اگر روکا نہ گیا تو مثل بلوہ ۱۸۵۵ء کے ہوگا جو عہدِ واجد علی شاہ مابین ہندو مسلمان ہوا تھا۔^{۱۵۶}

۱۵۶۔ دیکھئے تفصیل کیلئے ”واجد علی شاہ کے زمانہ کا : پندرہ دوسرا سکر ” جہاد“۔ جو آئندہ صفحات میں مرقوم ہے — مولف

پہلے راجہ صاحب کمشنر صاحب کے پاس جا کر بیٹھے بعد اسکے ان کو
 سرکاروں کو جن کی معرفت یہ چٹھیاں کمشنر صاحب کے پاس بھیجی گئی تھیں
 خانگی طور پر کمشنر صاحب کے سامنے پیش کئے گئے۔ اور وہ چٹھیاں جو
 علی النوا ترنگھی گئی تھیں وہ بھی راجہ صاحب نے پڑھ کر سنائیں اور رنجیدہ
 ظاہر کی۔ چونکہ کمشنر صاحب کو معلوم تھا کہ اس وقت کمیٹی میں تمام راجگان
 کی طلبی بمقام کلکتہ ہے اور راجہ صاحب اس وقت رنجیدہ و ملگن معلوم ہوتے
 ہیں۔ پوچھا راجہ صاحب خبر تو ہے؟ ان چٹھیوں کے آنے سے آپکی طبیعت
 کو پریشانی کیوں ہو؟ عرض کیا کہ ان چٹھیوں میں لکھا ہے کہ جس طرح ۱۸۵۵ء
 میں مابین اہل ہنود و اسلام فساد ہوا تھا ویسا ہی ہونے والا ہے تو مصلحت
 وقت یہی ہے کہ میں اودھ چلا جاؤں اور اس فساد کو رفع کروں اور فی الحال
 کلکتہ نہ جاؤں۔ ادھر راجہ سے طلبی قسط بھی تھی۔ اس فریب سے کلکتہ نہ گئے
 اور قسط سے بھی مہلت لے لی۔ کمشنر صاحب نے گھبرا کر وہ چٹھیاں ابابیان
 پولیس کے پاس بھیج دیں۔ کہ مسلمان مسجد کی مرمت نہ کرانے پائیں اسی وقت
 مسجد کی مرمت بند کر دیجئے اور یہ فریب کی باتیں حکام کے دل پر اثر کر گئیں
 کہ اس مسجد کے لئے فساد ہوا ہے حالانکہ اس کی صفائی کے متعلق بہت سی شہادتیں
 ہندوؤں کی کہ اس میں کبھی فساد نہیں ہوا ہے مسلمانوں نے مرتبہ کر کے
 پیش کیا تھا مگر راجہ صاحب کے سبب سے حکام نے ان شہادتوں کا
 کچھ بھی لحاظ نہیں کیا اور جس حالت میں تھی ویسا ہی رہنے دیا ۱۵۹

مسجد امیرالدولہ حیدر بیگ خاں | اس مسجد کے متعلق مولوی عبد الغفار

نے اپنی کتاب گم گشتہ حالات

ابودھیا میں لکھا ہے کہ یہ مسجد ۱۱۱۵ ہجری قمری میں امیرالدولہ حیدر بیگ خاں نائب نواب آصف الدولہ بکھی خاں جنت مکانی نے تعمیر کرایا تھا۔^{۱۵}
مولوی عبد الغفار کی علمی قابلیت اور تاریخ دانی کا اس سے بڑا اور
کیسا ثبوت ہو سکتا ہے کہ انھیں یہ بھی نہیں معلوم ہے کہ امیرالدولہ حیدر بیگ
خاں سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں مرحوم کے نائب تھے۔^{۱۶}
(۱۷) ۱۰۱۳ء میں تو سلطنت نوابین اودھ کے بانی بانی محمد امین نیشاپوری سوادت
خاں برہان الملک ہی ہندوستان میں نہیں آئے تھے۔ ۱۱۱۵ ہجری محمد شاہ
رنگیلے کا عہد حکومت ہے نواب آصف الدولہ نے ۱۱۸۸ ہجری لغایت ۱۲۱۷ ہجری
یعنی ۱۷۰۳ء تا ۱۷۵۰ء مطابقت ۱۰۰ لغایت ۱۰۹ء حکومت کیا ہے اس لئے مشدہم میں
حیدر بیگ خاں کیونکر مسجد بنوا سکتے ہیں جبکہ اس سن میں حیدر بیگ
خاں کی ماں کی بھی ولادت نہیں ہوئی تھی۔

مسجد کے اندر جو کتبہ تاریخ سن تعمیر کندہ ہے اسکی عبارت یہ ہے

وزیر مملکت بکھی خاں مشد
ورا توفیق صبر بیکراں مشد
کہ جائے طاعت دیں پر دریاں مشد
"فحل ذکر برت"، تاریخ این مشد

بعہد شاہ عالم والی ہند
امیرالدولہ اورا چو ثابست
در آنجا مسجد عالی بنا کرد
خیال سال تاریخش نمودم

یہ مسجد نواب آصف الدولہ کے عہد حکومت میں تعمیر ہوئی ہے جیسا کہ
قطبہ تاریخ تعمیر مسجد کے لفظ "محل ذکر رب" سے سن ۱۲۰۰ ہجری نکلتا ہے۔

مقبرہ امیر الدولہ حیدر بیگ خاں

رازِ درون پر وہ نرندان مست پُرس

ایں حال نیست صوفی عالی مقام را

اس مسجد سے لمحہ دیکھن جانب اہلک پختہ چہار دیواری سے گھرا ہوا وہ
قدیم احاطہ سوز ہے جو کبھی اس مسجد ہی کا حصہ تھا اب یہ احاطہ ہیراگیوں کے قبضہ
میں ہے۔ اس کے ایک بڑے رقبہ کو کھیت میں تبدیل کر دیا گیا ہے اور چھوٹے
رقبہ پر پھولوں کا باغیچہ لگا ہوا ہے اس احاطہ میں پورب جانب ایک مقبرہ ہے
جس کے متعلق محمد ہاشم انصاری صاحب اور دوسرے لوگوں نے بتلایا کہ
کہ یہ مقبرہ امیر الدولہ حیدر بیگ خاں کا ہے جنہوں نے سامنے والی مسجد
(مسجد امیر الدولہ حیدر بیگ خاں) بنوائی تھی۔

مولوی عبد الغفار نے اپنی کتاب میں امیر الدولہ حیدر بیگ خاں کا ذکر کیا
اور بزرگ الدین کے ساتھ بڑے مبہم انداز میں کیا ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے
کہ حیدر بیگ خاں کی بارعب شخصیت کو انہوں نے ولایت کے درجہ میں پہنچا
سے کیوں گریز فرمایا ہے۔ مسجد مذکور کے ذکر کے ساتھ اتنا ہی لکھنے پر اکتفا کیا
کہ۔۔۔ مسجد کے سامنے ایک وسیع باغ ہے جس کے اندر مقبرہ کے نور بیگ خاں

بہادر رائے بھائی اچیر بیگ خاں - مؤلف کا ہے

جیدر بیگ خاں ایک ارذل خاندان کا فرد تھا۔ اس کا باپ فتح آباد کابل کے گننام اور بے ادب فلیوانوں میں سے تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے تمام اعزاء چاہے وہ ہندوستان میں پیدا ہوئے ہوں چاہے فتح آباد کابل میں پیدا ہوئے ہوں سب کے سب بالکل بدتمیز، بے مروت اور شقی القلب تھے اور ان سے ایسے کام سرزد ہوتے تھے جن سے جانوروں کو بھی شرم آتی تھی۔

میرزا ابوطالب اصفہانی نے لکھا ہے کہ جیدر بیگ خاں تمیزدار، عقائد اور نازک مزاج ہونے کے ساتھ خود غرض بے مروت اور دریا پھیلانے میں مشہور ہے۔ بدسلوکی، بے وفائی اور بے حیالی و کمینگی اس کی فطری عادات ہیں جس شخص نے بھی اس کے ساتھ نیکی اور بھلائی کیا اس کے بدلے میں ہمیشہ اس نے برائی کی۔

نواب شجاع الدولہ نے جیدر بیگ خاں کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس کی تفصیل تاریخ اودھ، مؤلف حکیم نجم الغنی رامپوری کے صفحات کی زینت ہیں لیکن اس نے اپنی نیابت کے زمانہ ہی سے نواب موصوف کی جانشینوں کے خیر خواہی کے بہانہ سے یہ ارادہ رکھنا تھا کہ ان کا نام نشان تک باقی نہ رہے یہ رعایا کو تباہ کرنے اور ملک کی بربادی کے لئے ہمیشہ کو شان مہتا تھا۔ نواب وزیر (شجاع الدولہ) — مؤلف — کے خیر خواہ کارکنوں اور شرفاء میں سے ہر ایک کو اسی جگہ اور عہدہ سے ہٹا کر گننام اور

کینہ فطرت وار ذل لوگوں کو مقرر کرتا تھا۔ اس نے نواب مرحوم کے رشتہ داروں کو نوکروں سے بھی زیادہ تکلیفیں پہنچائیں چنانچہ جو شہزادے لکھنؤ میں رہتے تھے ان تمام کے لئے ایک ایک ہزار روپے ماہوار تنخواہ مقرر تھی لیکن جیدریگ خاں انکو تنخواہ دینے میں ہمیشہ وعدہ خلائی کرتا تھا۔ اس نے کبھی وقت مقررہ پر محض اس وجہ سے انکو تنخواہ نہیں دیا کہ یہ لوگ فاؤ کریں اور فرض لبس کر لیں و سوا ہوں۔ محل کی جو عورتیں فیض آباد میں رہتی تھیں انھیں بھی اتنی دیر میں تنخواہیں دیتا تھا کہ وہ فاقے سے تنگ آ جاتی تھیں اور بعض وقت وہ بھوک کے غلبہ سے اس قدر مجبور ہو جاتی تھیں کہ انکی سود و سولہ بیا حرم سرا سے باہر نکل کر بازار سے غلہ اور ضروریات زندگی کی چیزیں لوٹ کر محل میں لے جاتی تھیں۔

صاحب تاریخ آصفی کے مطابق نواب شجاع الدولہ کے عہد حکومت میں الماس خاں اور جیدریگ خاں تمام حکام میں انباز رکھتے تھے مرضی خاں جیدریگ خاں کے پسندیدہ لوگوں میں تھا۔ اس نے (جیدریگ خاں نے) اظہار دوستی اور ملازمت پر تقرر کے بہانے بہت سے لوگوں کو تباہ و برباد کر ڈالا (صفحہ ۹۵) اس کے برے کاموں کے نتیجے میں جو یادگار لعنت لکھنؤ میں باقی رہ گئی ہے وہ یہ ہے کہ اکثر مزدوروں اور فقیروں نے اس کی جھوٹی بخشش دیکھ کر مانگنے کا طریقہ اختیار کر لیا (صفحہ ۹۶)

تفصیح الغافلین میں مرقوم ہے کہ جن زمانہ میں گورنر دارن ہسٹنگز
 کا لکھنؤ میں قیام تھا۔ اسی زمانہ میں لکھنؤ میں قحط کی ایسی زبردست مصیبت آئی
 کہ سیکڑوں برس سے اس ملک کے لوگوں نے نہ سنی تھی۔ ہزاروں غریب
 آدمی روزانہ بھوک سے مرتے تھے۔ اطراف میں لاشوں کے ڈھیر لگے ہوئے
 تھے۔ اور ہر طرف فضا میں بدبو پھیلی رہتی تھی۔ اس قحط میں حیدر بیگ خاں
 دارن ہسٹنگز کی طرف سے ایک ہزار روپیہ روزانہ غریبوں میں تقسیم کرنے
 پر مقرر ہوا تھا۔ اس کے تمام ملازمین اور پلٹن کے کیدان بھی اسی
 کی طرح خود غرض، نفس پرست اور شقی القلب تھے جو آدھے سے زیادہ
 روپیہ خود رکھ لیتے تھے۔ قحط کی مصیبت سے پریشاں حال اور بھوک سے
 بیتاب جو کم عمر اور خوبصورت عورتیں روپیہ لینے اس کے ملازمین اور کیدانوں
 کے پاس آجاتی تھیں۔ انھیں وہ لوگ زبردستی حیدر بیگ کی محل سرا میں پہنچا
 دیتے تھے۔ اس طرح اس کی محل سرا میں بہت سی حسین و جمیل اور کم عمر عورتیں
 زبردستی پہنچا دی گئی تھیں۔ اور جب اس کی (حیدر بیگ خاں کی) موت ہوئی
 تو اس نے اپنے پسماندگاں میں بہت سی عورتوں کے علاوہ بہت سے لڑکے
 لڑکیاں چھوڑیں۔ ان اولادوں میں زیادہ تر اولادیں قحط کی ماری ہوئی عورتوں
 کی تھیں جو حیدر بیگ خاں کی محل سرا میں زبردستی پہنچا دی گئی تھیں۔ ان تمام
 اولادوں میں اکبر علی خاں اور حسین علی خاں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ینکوہ
 بیوی کے بیٹے تھے حسین علی خاں تو برے کاموں اور بد اعمالی میں مشہور زمانہ

تھے لیکن اکبر علی خاں باوقار، کم گو اور اچھے اطوار کے تھے اور نیک
لوگوں میں تھے۔^{۱۱۱}

حیدر بیگ خاں کے متعلق تاریخ السادت میں مذکور ہے
”الفصلہ در وقت نیابت مخاطب سرفراز الدولہ: ناظم الملک
مرزا حسن رضا خاں بہادر شد۔ حیدر بیگ خاں کہ بحسب ظاہر نائب اور
بود، بخطاب امیر الدولہ انتظام الملک کلہ گوشہ باسماں بود۔“

حیدر بیگ خاں نہایت فضول خرچ آدمی تھا۔ ٹیٹ رائے نے اس
کے مرنے کے بعد اس کے خاصہ طعام کے اخراجات پچاس لاکھ روپے
سالانہ ظاہر کئے ہیں (تاریخ آصفی صفحہ ۶۲) اس نے اپنے فطری کمینہ بن اور
وعدہ خلافوں سے مرزا ابوطالب صفہانی جیسی باصلاحیت اور باوقار
مذہبی شخصیت کو اس حد تک تنگ کیا کہ لکھنؤ میں ان کا رہنا دشوار ہو گیا
اور مجبوراً ترک وطن کر کے کلکتہ جانا پڑا تھا۔ (ایضاً صفحہ ۱۰۳)

لکھنؤ کے قیام کے زمانہ میں حیدر بیگ خاں نے قحط زدہ کم سن اور
خوبصورت عورتوں کو اپنے محل سرا میں جمع کر لیا تھا۔ اور انھیں اوڑھنا بچھونا
بنار کھا تھا۔ سارا وقت زنان خانے میں چڑی چڑے کی چیلوں میں گزارتا
تھا۔ اس سبب اس کی قوت حیوانی کو نقصان پہنچا تھا۔ چونکہ اس کی جینی حرم
جنوں کی حد تک بڑھی ہوئی تھی اسلئے اپنی قوت حیوانی کی کمزوری کی بحالی کیلئے

اس نے حکیم شفاؑ صاحب کا علاج شروع کیا حکیم صاحب
 موصوف کا حکم تھا کہ گھاس کے ایک تنکا کو دو درہنی کے عطر، میں ڈبو کر
 پان میں لگا کر ہر روز دو وقت کھائے۔ امیرالدولہ حیدر بیگ خاں نے
 اس علاج سے کافی فائدہ دیکھ کر بغیر حکیم صاحب موصوف سے مشورہ کئے
 اور مطلع کئے ہوئے کثرت سے درہنی کے عطر کا استعمال کیا، درہنی
 کے عطر کی گرمی اور لطافت نے اس کی اصلی رطوبتوں کو جو پہلے ختم
 ہو رہی تھیں خشک کر دیا۔ اور حرارت غریبہ وجودی سے پہلے اعضاء
 پر غالب آجاتی تھی، پیدا کر دی۔ حکیموں نے بہت باتھ پیرا ہے لیکن
 کوئی فائدہ نہ ہوا اور وہ اپنے اعمال کی سزا گاہ میں پہنچ گیا (ایضاً صفحہ ۱۱۱)
 اسکی تاریخ وفات درج ذیل قلم تاریخ سے ظاہر ہے جو ای زمانہ میں کیا ثاویر کیا
 آں کو بغرض تخم بد، مردم کاشت
 خسرواں دو کون حاصل میں بود
 از بیج نیافت بہرہ و جلد گذشت
 تاریخ وفات، فرداں بگاشت
 ۱۲۰۶ ہجری ۱۲ + ۹۲ + ۱۲۹ + ۷۶ + ۱۰ + ۹۱۰

امیرالدولہ حیدر بیگ خاں نے اپنے بڑے بھائی نور بیگ خاں
 موت کے سترہ سال بعد انتقال کیا^{۱۶۴} اس مقبرہ میں حیدر بیگ خاں
 کی وہ شکستہ حال قبر اب تک موجود ہے جسکے نیچے امیرالدولہ انتظام الملک حیدر بیگ
 خاں بہادر کیساتھ حقیقی انصاف کا معاملہ درپیش ہوگا
 جس امیرالدولہ انتظام الملک حیدر بیگ خاں کو مرنے کے بعد بڑے

۱۶۴۔ حیدر بیگ خاں کے بڑے بھائی نور بیگ خاں کی موت ۱۱۸۹ مطابق ۱۷۷۵ء میں ہونے پر یہ
 تفصیل گذشتہ اوراق میں "مذکورہ بنام مقبرہ" کے تحت درج ہے جو اف

کرت و فرار اور امیرانہ شان و شوکت کے ساتھ سپرد خاک کیا گیا تھا اور جس کی دنیوی جاہ جلال سے آراستہ و پیراستہ شخصیت کو نمایاں کرنے کے لئے اچھے وارثان اور اعزاء نے قبر پر ایک عالیشان مقبرہ تعمیر کرایا کہ ایک طویل زمانہ تک لوگ امیرالدولہ انتظام الملک حیدر شاہ کی پرکار شخصیت کو فراموشی کی غلطی و تاریک غار میں دفن نہ کر سکیں۔ لیکن قدرت کے تازیانہ کو کیا کیا جائے کہ پونے دو سو برس سے کم کے عرصہ میں اندر ہی قدرت نے موہمی تغیرات کے ہاتھوں اس مقبرہ اور صاحب مقبرہ کی قبر کو تباہ و برباد کر کے ہر دیدہ بینا کے لئے ایک مقام عبرت بنا دیا ہے۔

موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے
اس ستم گر کا ستم انصاف کی تصویر ہے

مزار مقبرہ شاہ ابراہیم صاحب

اب مسجد امیرالدولہ حیدر پور سے چند قدم انرجانب آگے چلے تو بائیں ہاتھ پر یعنی انرجانب بلندی پر شاہ ابراہیم صاحب کا نہایت شاندار مقبرہ نظر آئے گا۔ اس مقبرہ کی جدید تعمیر اسی صدی کے نصف کے بعد کے سالوں میں ہوئی ہے۔ اب یہ مقبرہ نہایت خوشنما اور جاذب نظر ہو گیا ہے۔ اس جگہ کا ماحول بھی اب کافی پرسکون اور فرحت بخش معلوم ہوتا ہے۔ نا

شاہ ابراہیم صاحب کی پیدائش شہر بنارس میں شہنشاہ شاہجہاں
کے عہد میں ہوئی تھی۔ اس کے دوسرے برادران دربار شاہی میں منصب
مناسب پر ملازم تھے۔^{۱۶۵}

آپ کے متعلق یہاں عام و خاص میں مشہور ہے کہ آپ صاحب کرامت
اور صاحب تصرفات بزرگ ہیں۔ ہندو اور مسلمان سب ہی آپ کے
آستانہ پر حاضری دیتے ہیں اور بہت ہی ادب و احترام سے حاضر ہوتے
ہیں۔ مؤلف نے تقریباً ایک گھنٹہ کے قیام کے دوران کئی لوگوں کو فاتحہ
خوانی اور نذر و نیاز چڑھانے کے لئے آتے ہوئے دیکھا ہے آستانہ
پر موجود لوگوں نے مؤلف کو بتلایا کہ حجرات کے دن فاتحہ خوانی اور نذر و نیاز
چڑھانے کے لئے زیادہ لوگ آتے ہیں

اجودھیا شہر کے ہندو اور مسلمان متفقہ طور پر آپ کی بہت سی کرامات
بیان کرتے ہیں اور بعض لوگ تو اپنی عقیدت کے اظہار میں اس قدر غلو سے کام
لیتے ہیں کہ آپ کی ذات گرامی ایک مافوق الفطرت ہستی محسوس ہونے لگتی ہے
اکثر لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ الکا ذاتی تجربہ ہے کہ اگر کوئی شخص چالیس
دنوں تک بلا ناغہ آپ کے آستانے پر حاضری دے اور اپنی جائز حاجت پیش کرتا
رہے تو اللہ تعالیٰ آپ کی توجہ کی برکت سے اللہ تعالیٰ حاجتمند کی حاجت پوری
کر دیتا ہے۔

حضرت شاہ ابراہیم صاحب نے محمد شاہ بادشاہ دہلی کے زمانے میں ۱۱۱۵ ہجری (مطابق ۱۷۰۳ء) میں انتقال فرمایا۔ آپ کے مقبرہ پر جو تاریخ وفات لکھی ہوئی ہے اس کا قطعہ تاریخ یہ ہے۔

ذات مبارک شاہ کو مہدی زماں بود! شرف خطاب اودہم از نام اہل منطق
چو خورشتم ز ہاتف تاریخ از وفاتش! گفتابہ بشارت عاشری بوصل معشوق
۱۱۱۵ھ ۱۷۰۳ء ۱۷۰۴ء ۱۷۰۵ھ

ایک دوسری تاریخ وفات یہ بھی ہے
هُوَ الْخَالِقُ دُرِّيَا مِ فَيْضِ

۲۲۵ + ۸۹۰ ۱۱۱۵ ہجری

حضرت شاہ ابراہیم صاحب کا عرس ہر سال ماہ رجب کی ۲۶/۲۷ تاریخوں کو عوام کے چنہ سے ہوتا ہے۔ جس میں نزدیک و دور کے مرد و عورت ہندو مسلمان بلا تفریق مذہب دلت شریک ہوتے ہیں۔ اچھڑھیا شہر کے مندروں کے اکثر مہنت و بیراگی بھی آپ کے فیض جاریہ کے بعد زیادہ رطب اللسان ہیں اور عرس میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ مراسم عرس شام سے شروع ہوتے ہیں۔ تین دنوں تک پروگرام چلتا رہتا ہے۔ عرس کے آخری دن یعنی ۲۷ رجب کی رات میں فوالی اور تقاریب کا بھی پروگرام ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم صاحب حضرت خواجہ بکھی صاحب کے خلیفہ مجاز تھے۔ اور سلسلہ قادریہ حشمتیہ میں آپ کو خرقہ خلافت ملا تھا اور اپنے مرشد حضرت خواجہ بکھی صاحب کے حکم و اجازت سے آپ نے شہر اودھ میں

۱۴۶ء میں قیام اختیار فرمایا تھا۔ آپ کے خاص مریدوں میں فدائی
خان صوبیدار بھی تھے جن کا ذکر گذشتہ اوراق میں مسجد سورگ دواڑی کے
تحت آچکا ہے۔

مزار شاہ علی اکبر چشتی مودودی

یہ مشکل ہے کسی پر کس طرح ایمان لے آئیں : : : تعلق ترک کس سے ہو بالآخر کس کو پناہیں
کوئی بھی راستہ اپنے سے جب طے نہ کر پائیں : : : خداوند ایہ تیرے سادہ دل بند گدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطان بھی عیاری
مقبرہ شاہ ابراہیم صاحب کے کچھم جانب محلہ شاہ مدار ہے۔ زمانہ
ماضی میں اسی شاہ مدار محلہ میں علی اکبر چشتی مودودی صاحب کا دولتکدہ ،
خانقاہ اور مسجد تھی بیسویں صدی کی ابتدائی دودہائیوں کے بعد کے سالوں
میں ان کے وارثان جو لکھنؤ میں رہتے تھے اجودھیا اگر مکان و عیزہ کو رکھو
کر فروخت کر ڈالا : : : اب شاہ صاحب کے دولتکدہ اور خانقاہ کی جگہ
کھیت کی شکل میں تبدیل ہو چکی ہے۔

نواب آصف الدولہ کے عہد حکومت میں شاہ اکبر علی چشتی مودودی
کا شمار مشائخ کبار میں ہوتا تھا۔ جب کبھی نواب آصف الدولہ مرحوم لکھنؤ
سے فیض آباد تشریف لاتے اور قیام کرتے تو شاہ علی اکبر چشتی مودودی سے

ملاقات کے لئے اجودھیا تشریف لائے۔^{۱۶۸} ہزاروں لوگ آپ سے
بہت سنے اور معتقدین کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ آج بھی کچھ لوگ اپنے دلوں
میں احترام و عقیدت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ — ہم کسی کی منصوم عقیدت اور
روایتی احترام کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتے لیکن حقائق کو دانستہ
طور پر مخ کرنا بھی ہمارے بس کا نہیں ہے۔

شاہ علی اکبر چشتی مودودی کا تعلق اس دور کے علمائے حق سے تھا۔ یا
وہ اس عہد کی علماء سوء کی جماعت کے ایک فرد تھے۔ ۹۱ اس پر ہم کوئی
تبصرہ کرنا نہیں چاہتے اور نہ ہم اس کی ضرورت سمجھتے۔ اس وقت شاہ صاحب
اپنی قبر میں ہیں، یقیناً ان کے ساتھ انصاف کا معاملہ ہو رہا ہوگا۔

مولوی نذاحسین مرحوم^{۱۶۹} کے بموجب شاہ علی اکبر چشتی مودودی کی دنیوی
جاہ جلال سے آراستہ و پیراستہ، پر وقار و معزز شخصیت، دھوپ کی شدت اور
سایہ کی فرحت بخش طبیعت خاصیت کے اخراجات و منفعت سے آشنا ہونے کی وجہ
سے نواب آصف الدولہ اور ان کے نائب و معتمد سرفراز الدولہ نواب حسن رضا
خاں کو ہمیشہ خوش رکھنے اور ان کے مزید قرب و اعتماد کے حصول کیلئے ہمیشہ کوشاں
و سرگرداں رہتے تھے۔

نواب آصف الدولہ کے زمانہ کا یہ کاغذ نامہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے

کہ ہوا و لعب میں مشغول رہنے کے ساتھ مذہب تشیع کی اشاعت میں انھوں نے
 دل سے کوشش کی۔ ان کے نائب سرفراز والدہ نواب مرزا حسن رضا خاں بھی
 مذہبی آدمی تھے۔ وہ بھی اسی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۸۰ء
 مطابق ۱۱۹ ہجری میں شاہ علی اکبر چشتی مودودی کے مشورہ اور ملا محمد علی فیض آبادی
 کی تحریک سے اودھ کے سنی خاندانوں کو مذہب تشیع اختیار کرنے کی ہم چلائی
 گئی ہزاروں سنی خاندان شیعہ ہوئے اور انکو اپنی حیثیت کے مطابق انکو جاگیریں
 دی گئیں جو بدقسمت سنی خاندان اپنی ضد پر قائم رہے انکی جاگیریں جو شاہان مغلیہ
 جلی آرہی تھیں ضبط کر لی گئیں۔^{۱۱}

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے والد محترم نزرہتہ الخواطر دگل رعنا کے مؤلف
 اور سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ مولینا حکیم عبدالحی صاحب کے بیان کے مطابق
 شاہ علی اکبر چشتی مودودی اور ملا محمد علی فیض آبادی کے مشورہ اور تحریک سے سرفراز
 والدہ نواب حسن رضا خاں نے لکھنؤ میں جمہ و جماعت قائم کر کے سب سے پہلے مولوی
 سید ولد علی نصیر آبادی کی اقتداء میں ۱۳ رجب ۱۲۸۲ھ کو نماز ادا کیا یہی وہ پہلا
 دن تھا جب وسط ہند میں شیعوں نے اپنا جمہ و جماعت علیحدہ کر لیا۔^{۱۲}

۱۱۔ القصہ حسن رضا خاں بہادر سوائے سیر و تسکیر

در رکاب جناب عالی و صوم و صلوة با بیچ چیز سرکار نہداشت و بالی جمہ و جماعت در اثناء
 اعماد السعادات صفحہ ۱۳۷ و فٹ نوٹ ۸۹۔ ۱۰۱ گل رعنا صفحات ۱۵۳، ۱۵۴ نیز لکھنؤ
 کا دبستان شاعری از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ایم۔ اے۔ بی۔ ایچ۔ ڈی۔ صفحہ ۲۶
 ۱۲۔ گل رعنا صفحہ ۱۵۴

تاریخ کے اوراق پر کوئی تفصیل ایسی نہیں ملتی جس سے یہ معلوم ہو سکتا
 کہ اودھ کے سنیوں کے خلاف شاہ صاحب کے اس رویہ کے پس پشت کون
 جذبہ کار فرما تھا؟ ان کے بعض متعین کا کہنا ہے کہ بظاہر سنیوں کے خلاف مشورہ
 دیکر شاہ صاحب نواب وقت کی خوشنودی حاصل کرنے میں کامیاب رہے
 لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھیں اپنے عظیم نیک مقصد میں پوری پوری کامیابی ہوئی
 یعنی اس طرح نواب وزیر کا قرب اور خوشنودی حاصل کر لینے کے بعد وہ جس
 قدر اودھ کے سنیوں کی جاگیریں اور جائیدادیں بچا سکتے تھے بلا ضرر اور شر
 بچا لیا۔ یہ شاہ صاحب موصوف کی فرست اور دوزنی اور دوراندیشی کا ثمرہ
 ہے کہ اودھ میں بہت سے سنیوں کی جائیدادیں اور جاگیریں ضبط ہونے سے
 محفوظ رہیں

دوسرے زیادہ لوگ ازل انکار صاحب کی رائے سے قطعی اتفاق نہیں کرتے
 وہ اسے ذہنی دیوالیہ پن کی تاویل بتلاتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ شاہ اکبر علی حشر مودودی ایک صحیح العقیدہ سنی خاندان
 میں پیدا ہوئے اسی ماحول میں تحصیل علم کیا پروان چڑھے اور وقت کے مشائخ
 کبار میں شمار کئے گئے۔ ان کے اجداد کے نام بھی شاہان مغلیہ کی عطا کی ہوئی جاگیر
 تھی جو دراشنا آپولی تھی جس کے تحفظ اور بقا کیلئے شاہ صاحب موصوف
 کی خود غرضی، نفس پرستی اور ردِ اپوش اخلاقی پستی اور ایمانی کمزوریوں نے اودھ
 کے سنیوں کو داؤ پر لگا دیا۔

کو رائہ عقیدت کا یہ نفرت آفریں خاصہ ہے جو ہر معتقد میں اس کے جذبہ عقیدت کی کمی زیادتی کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ ہر خوش عقیدہ شخص، اپنی مرکز عقیدت شخصیت کی کسی کھلی یا فاش لغزش کو لغزش یا خطا تسلیم کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے اور اپنے ذہنی ہیجان و کرب کی نام نہاد تسکین کے لئے لا حاصل تاویلات سے مداوا کرنا چاہتا ہے۔

شاہ علی اکبر چشتی مودودی کا مزار ایک مولسری کے درخت کے نیچے چوڑے پر واقع ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ جگہ شاہ صاحب موصوف کے زمانہ حیات میں انکی خانقاہ کی نشنگاہ تھی۔^{۱۲} شاہ صاحب کے کارہائے نمایاں پر اس سے زیادہ ہم کچھ اور کہنا نہیں چاہتے۔

ہر چند زباں کھل نہ سکی انکے ستم پر
انصاف بھی کہہ دیں اسے ہم ہم سے نہ ہوگا

پیر کشانی کا مزار جس جگہ پر شاہ علی اکبر چشتی مودودی کا مزار ہے اسی قبرستان میں ایک بلند مقام پر ایک شگستہ چار دیواری کے اندر ایک بہت ہی پرانی اور بوسیدہ مزار ہے جو تقریباً دو گز لمبی ہے جو عوام میں پیر کشانی کی قبر کے نام سے مشہور ہے

مولوی عبد الغفار نے لکھا ہے کہ عوام میں مشہور ہے کہ آپ حضرت سید سالار مسعود خاں دی (رحمۃ اللہ علیہ) کے استاد تھے۔^{۱۳} مولوی عبد الکریم صاحب

الضاری مرحوم نے لکھا ہے کہ زمانہ قدیم سے یہ دستور چلا آ رہا ہے کہ ہر شخص میں
سید سالار مسعود غازی کے میلہ میں جلتے ہوئے دفالی پیر کشائی کی مزار پر عاضی
دیگر ہی آگے کی طرف بڑھتے ہیں۔

مولوی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ پیر کشائی کے مزار کے سر ہانے ایک
سیاہ پتھر لگا ہوا ہے جس پر کوئی عبارت کندہ ہے لیکن ایک طویل زمانہ تک یہ
مزار لوگوں کی عدم توجہی کا شکار رہنے کی وجہ سے اس قدر غیر واضح ہو چکا ہے کہ پڑھا
نہیں جاتا۔

اب پیر کشائی کے مزار کے سر ہانے کوئی پتھر نہیں ہے اور نہ آپکا ذکر کسی کتاب
میں مؤلف کی نگاہ سے گزرا ہے جو باتیں عوام میں آپ کے متعلق مشہور ہیں وہ قابل
اعتبار نہیں ہیں بسنی ستائی ہیں :

چاہ صحت | محلہ شاہ دار اور کوٹلیا گھاٹ کے درمیان ایک نہایت قدیم
کنواں ہے جو موجودہ محلہ عالم گنج کٹرہ میں واقع ہے جس کے
مستقل تاریخ پارینہ مدینہ الاولیاء میں لکھا ہے کہ اس کنواں کو حضرت نصیر اللہ
چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بنوایا تھا۔ یہ کنواں صحت کنواں کے نام
سے مشہور تھا جو مریض صدق دل سے اس کنواں کا پانی پیتا تھا اللہ تعالیٰ

ہا۔ سید سالار مسعود غازی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و واقعات کی جسطہ سچی کتابیں مؤلف کی نگاہ سے گزری
ان میں پیر کشائی کے نام کے کسی شخص کا آپکا استاد ہونا نہیں لکھا ہے۔ آئینہ مسودی کے صفحہ ۳ پر لکھا ہے
کہ سید براہیم بارہ ہزار کی لے سید سالار مسعود غازی کا بسم اللہ شروع کرایا تھا مگر یہ تفصیل علم کیلے
آئینہ مسودی میں بائیں نادرش ہے۔ مؤلف

شفا عطا فرماتا تھا۔ آپکی برکت سے اب تک یہ تاثیر باقی ہے کہ جو بیمار صدق دل سے اس کنوئیں کا پانی پیتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے صحت کلی عطا فرماتا ہے۔

فی الوقت اس کنوئیں کا پانی کھاری ہے اور نزدیکی کھیتوں کی سبنجائی کے کام میں آتا ہے۔ مؤلف نے جب اس کنوئیں کی صحت افزا تاثیر کے متعلق لوگوں سے دریافت کیا تو لوگوں نے لاعلمی ظاہر کیا ممکن ہے کہ زمانہ ماضی میں اس کنوئیں کا پانی شیریں رہا ہو۔ اور اس وقت اس میں صحت افزا تاثیر رہی ہو۔ فی الوقت تو یہ کنواں ایک خام راستہ اچھڑی کے کنارے واقع ہے اور گھاس پھوس پڑنے کی وجہ سے پانی کی بوجھ خراب ہو گئی ہے۔ موجودہ حالت میں اس کنوئیں کے پانی کی صحت افزا تاثیر کا تصور بھی محال ہے۔

خانقاہ و مزار شاہ فتح اللہ

محلہ شاہ مدار کے دھن جانب محلہ چراغ دہلی ہے جو اس وقت عالم گنج کٹرہ میں تاج ہے جو حضرت نصیر الدین چراغ دہلی رحمۃ اللہ علیہ کے نام پر آباد ہوا تھا مولوی عبدالکریم انصاری مرحوم نے لکھا ہے کہ شاہ فتح اللہ صاحب مرحوم علوم ظاہری و باطنی سے آراستہ پیراستہ اور بالکمال بزرگ تھے۔ حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کی اجازت سے آپ کے مکان خاص میں سکونت اختیار فرمائی تھی۔

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہی مکان آپ کی نشستگاہ اور خانقاہ تھا لیکن اکثر لوگ اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ انکا کہنا ہے کہ شاہ فتح اللہ صاحب کی خانقاہ مکان مسکونہ سے علیحدہ تھی جو پاس تھی اس وقت آپ کا مزار ایک پختہ چہار دیواری کے اندر موجود ہے اور بہتر حالت میں ہے۔

مرمت خانقاہ (فتح اللہ صاحب)

گم گشتہ حالات ابودھیاب میں مرقوم ہے کہ اس خانقاہ کی پہلی مرمت واجد علی ناظم نے کرایا تھا چند سالوں بعد جب دیواریں بارش سے شکستہ ہو کر گر پڑیں تو فیض آباد کے ایک مشہور تاجر شیخ رمضان علی مرحوم نے جنہوں نے بڑی بوا صاحبہ رحمۃ اللہ علیہا کے آستنا کی مرمت کرایا تھا۔ اس خانقاہ کی از سر نو مرمت کروایا تھا۔

اب سے تقریباً بیسٹھ سال قبل یعنی ۱۳۳۵ھ میں خواجہ برکات اللہ صاحب جو ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے اور فیض آباد میں محکمہ آبکاری میں انسپکٹر تھے۔

خانقاہ مذکور معمارانہ از سر نو درست کرایا تھا۔ شاہ فتح اللہ صاحب کے اودھ میں آنے اور خانقاہ وغیرہ کا مفصل حال اخبار الاخبار میں تحریر ہے۔ آپ بدایوں کے رہنے والے تھے حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الہی نے آپ کو بچپن ہی سے ... خواجہ صاحب کے اکثر قری اجاب کا کہنا ہے کہ خواجہ صاحب نے اپنی اوپری آمدنی سے اسطرٹ کے اور بہت سے کام کئے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ مؤلف

حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے سپرد فرمایا تھا۔ چنانچہ آپ اپنے استاد حضرت
چراغ دہلی کی تعلیم و تربیت اور فیض صحبت سے منہج عالم اور صاحب فیض و
کمال بزرگ ہوئے۔ ہزاروں گم کردہ راہ لوگ آپ کی توجہ اور فیض سے
راہ راست پر آئے اور کامیاب و کامران ہوئے۔ **مزار شاہ قاسم**

حضرت شاہ فتح اللہ صاحب کے مزار کے احاطہ کے پورب جانب حضرت
شاہ قاسم صاحب کی قبر بتلائی جاتی ہے مولف گم گشتہ حالات اجودھیانے
روایت کیا ہے کہ انھیں معتبر بزرگوں کی زبان معلوم ہوا ہے کہ شاہ محمد قاسم
صاحب شاہ فتح اللہ صاحب کے فرزند تھے اور اپنے والد کے پائینتی مدفون
ہوئے

اس جگہ کئی قبریں ہیں ان میں شاہ محمد قاسم صاحب کی قبر کوئی ہے بہت
کو اس کا علم نہ ہو سکا اور نہ کسی اور ذرائع سے نشاندہی ہو سکی۔

درگاہ حضرت مخدوم بندگی نظام | حضرت شاہ فتح اللہ صاحب کی
خانقاہ کے پورب جانب ایک بلند

چوترہ پر کچھ مزارات ہیں جو حضرت مخدوم بندگی نظام کی درگاہ کے نام سے اب
سے ساٹھ ستر برس پہلے تک کافی مشہور تھی ۱۲-۱۹۱۲ء تک اس جگہ ایک وسیع

خانقاہ یا مدرسہ کی پختہ چار دیواری اور ایک قناتی مسجد کی چار دیواری
موجود تھی لیکن اب نہ انھیں قناتی مسجد کی چار دیواری کا نام و نشان باقی رہ

گیا ہے یا خانقاہ مدرسہ کا آثار !

اس وقت حضرت مخدوم بندگی نظام کا مزار ایک اعظمی کے اندر واقع ہے جس کے سرانے پر نیم کا ایک درخت سایہ کئے ہوئے ہے۔ اعظمی کے باہر بھی کئی پختہ قبریں ہیں جن کے متعلق کسی شخص کو کوئی علم نہیں ہے کہ یہ قبریں کن اصحاب کی ہیں حضرت مخدوم بندگی نظام کا ذکر مولف کو کسی کتاب میں نہیں ملا اور نہ یہ بات ہی معلوم ہو سکی کہ آپ کا زمانہ کیا تھا؟ دیگر خاندانی حالات، سلسلہ اور اجداد صیالیں آنے کے بعد تبلیغ دین وغیرہ کی مساعی کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

مولوی غلام الغفار صاحب نے لکھا ہے کہ ضلع سلطانپور کے کنوئی موضع کے شیخ زادے خود کو حضرت مخدوم بندگی نظام کی اولاد بتاتے ہیں لیکن اس بات پر یقینی طور پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

مزار شاہ درویش

حضرت شاہ محمد قاسم صاحب کے مزار کے پیچھے شاہ درویش یادرویش صاحب کا مزار ہے۔ آپ کے متعلق یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ آپ شاہ محمد قاسم صاحب کے فرزند ارجمند تھے۔ آپ کا تعلق سلسلہ قادریہ سے تھا۔ آپ شاہ بدھن صاحب بہرائچی کے خلیفہ مجاز تھے۔ ایک روایت لوگ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ مولانا عبدالرحمن لکھنوی مرحوم جو شجرہ ۱۵۰۰ نے غلیفوں کو دیا کرتے تھے، اس میں ”شاہ درویش قاسم اودھنی لکھا ہوا تھا۔“

۱۷۸۔ آپ حافظ محمد اسماعیل صاحب کے ورثہ اعلیٰ میں جنکا ذکر مسجد ٹاٹ شاہ کے بیان میں کیا جا چکا ہے

۱۷۹۔ آپ مولانا عبدالقدوس صاحب کے خلیفہ تھے۔

مزار چپ شاہ و شاہ علاء الدین

تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیاء میں تحریر ہے کہ یہ درگاہ پانچ سو سال سے مشہور پٹی آرہی ہے۔ تمام بزرگ اس درگاہ کا احترام کرتے تھے۔ لوگ بتلاتے ہیں کہ اس درگاہ میں کسی صاحبِ مال چپ شاہ نامی بزرگ کا مزار تھا۔ متذکرہ بالا کتاب میں لکھا ہے کہ یہ درگاہ زیارت گاہِ خلقِ خدا ہے۔ لیکن مولف کو چپ شاہ کے مزار کا نشان تک نہ مل سکا۔ یہاں تک کہ محمد ہاشم انصاری صاحب بھی کوئی نہمائی علاوہ اس کے نہ کر سکے کہ لوگ یہاں کسی بزرگ یا راست چپ شاہ کا مزار بتلاتے رہے ہیں۔

چپ شاہ کے مزار کی طرح، اس سے متصل قبرستان جو اب کھیت بن چکا ہے، مولف کو مرزا مظہر جان جاناں دہلوی کے خلیفہ حضرت علاؤ الدین صاحب کی قبر کی بھی لوگ نشاندہی نہ کر سکے اور اس تحقیق میں محمد ہاشم صاحب کی ہوششیں بھی ناکام رہیں۔

خانقاہ شاہ مظفر صاحب

خانقاہ شاہ فتح اللہ صاحب دکنی گوشہ کی طرف شاہ مظفر صاحب کی خانقاہ تھی۔ کہتے ہیں کہ آپ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر (جس اللہ علیہ) کے عہد کے بزرگ تھے۔ جس جگہ آپ کی خانقاہ تھی، اس سے متصل حضرات اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ کی تعمیر کی ہوئی مسجد اب تک موجود ہے۔ یہ مسجد اجودھیا کی ان چند خوش قسمت

مساجد میں سے ایک ہے جو نمازیوں سے آباد ہے اور جس میں پانچوں وقت پابندی کے ساتھ نماز باجماعت ہوتی ہے۔ محلہ کوٹھی گھاٹ دور اہاں کنواں کے نمازی مسلمان خصوصاً اور اس محلہ کے اطراف کے مسلمان، اس مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے آتے ہیں۔ آج کل اس مسجد میں اخلاق احمد صاحب امامت کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

مولوی عبدالکریم انصاری مرحوم نے لکھا ہے کہ حضرت اورنگ زیب عالمگیر (رحمۃ اللہ علیہ) کے زمانہ بحکومت میں دہلی کے شاہی خزانہ سے چار سو اسی روپیہ سالانہ برائے مصارف خانقاہ و مسجد مقرر تھا، جو نوابین اودھ کے آخری زمانہ حکومت تک لکھنؤ کے شاہی خزانہ سے برابر ملتا رہا۔^{۱۸۰} معتبر لوگ بتلاتے ہیں کہ کہنی سرکار بہادر نے بھی کچھ دنوں تک قدرے کمی کے ساتھ مصارف خانقاہ و مسجد کے لئے دیا لیکن جب انگریزی سرکار کا اودھ پر مکمل کنٹرول ہو گیا تو مصارف کی یہ رقم بند کر دی گئی۔ انقلابات زمانہ کے بیداد ہاتھوں نے اس خانقاہ کا نشان تک مٹا ڈالا ہے۔

مزار شاہ عبدالحق

شاہ عبدالحق مرحوم شامیہ مرحوم کی دختر اولاد میں سے تھے۔^{۱۸۱} تیرہویں

۱۸۰۔ تاریخ اجداد (مولف منشی چمن لال صاحب صدر قانون گو گوٹہ) کے صفحہ ۶۱ پر لکھا ہے کہ چار پانچ سو روپیہ سالانہ ملتا تھا۔ مؤلف۔

۱۸۱۔ گزشتہ حالات اجداد (مولف منشی چمن لال صاحب صدر قانون گو گوٹہ) کے صفحہ ۲۸۔

صدی ہجری میں آپ کا شمار اودھ کے مشائخ کبار میں ہوتا تھا۔ شاہ مظفر صاحب کی نسبت سے لوگ آپ کا کافی احترام کرتے تھے۔ آپ نے ۵ مئی ۱۸۵۸ء (مطابق ۲۲ رمضان المبارک ۱۲۷۵ھ) بروز پنجشنبہ انتقال فرمایا اور شاہ مظفر صاحب کی خانقاہ میں دفن ہوئے۔ آپ کا مزار اب تک موجود ہے اور بہتر حالت میں ہے۔

مزار شاہ جمال گوجری

شاہ مظفر کی خانقاہ سے اب مسجد کے پاس آئیے۔ اس جگہ پر آپ کو محلہ غام گنج کٹرہ جانے والی سڑک ملے گی۔ یہاں سے تھوڑی دور پچم جانب چلئے یہاں داہنے ہاتھ پر آپ کو ایک راستہ نظر آئے گا۔ اس راستہ پر تھوڑی دور سامنے کی طرف چل کر بائیں ہاتھ کو مڑ جائیے۔ یہ راستہ بالکل جنگل جیسا معلوم پڑتا ہے۔ آگے چلنے کے بعد کھیتوں کے درمیان آپ کو حضرت شاہ جمال گوجری کی درگاہ نظر آئے گی۔ ممکن ہے کہ زمانہ ماضی بعید میں اس جگہ کوئی شاندار عمارت یا خانقاہ رہی ہو، لیکن اب صرف ایک چہار دیواری کے اندر حضرت جمال شاہ گوجری کا مزار موجود ہے۔

سید محمد کرمانی نے اپنی کتاب "سیر الاولیاء" (صفحہ ۱۹۰) میں، جو حضرت نظام الدین اولیا محبوب الہی (رحمۃ اللہ علیہ) کے حالات پر سب سے پہلی اور پرانی تصنیف ہے، لکھا ہے کہ — وہاں (اجودھیا میں) بعض بزرگوں کے مقبرے ہیں جن میں سے ایک شیخ جمال گوجری (المتوفی ۸۵۸ھ مطابق ۱۴۵۴ء) ہے۔

تاریخ پارینہ مدینہ الاولیاء میں لکھا ہے کہ حضرت شاہ جمال گوجری کا مفصل ذکر اخبار الاخبار، مرآۃ الاسرار اور ملفوظات حضرت مخدوم عبدالحق ردوئیؒ میں موجود ہے۔ اپنے ملفوظات میں حضرت مخدوم احمد عبدالحقؒ نے لکھا ہے کہ "میں نے بھکڑ سے پنڈوانک سفر کیا ہے اور مجھے صرف ایک ہی مسلمان بچہ ملا ہے۔" (یعنی شاہ جمال گوجری)۔

کہتے ہیں کہ جس مقام پر اس وقت شاہ جمال گوجری صاحب کی قبر بنی ہوئی ہے، اسی جگہ پر حضرت مخدوم احمد عبدالحق ردوئیؒ نے چھ ماہ تک ایک قبر میں جگہ کشی کیا تھا۔

اخبار الاخبار میں یہ دلچسپ واقعہ بھی درج ہے کہ قیام شہر اودھ (اجودھا) کے زمانہ میں ایک کتیا نے حضرت مخدوم صاحب کے مسکن میں نیچے دیئے۔ حضرت مخدوم نے اس کتیا کے بچوں کی پیدائش پر شہر والوں کی دعوت کی، جس میں روسا شہر تک کو طلب فرمایا۔ لیکن حضرت شاہ جمال گوجری کو اس دعوت میں مدعو نہیں کیا۔

مشہور ہے کہ دوسرے دن علی الصباح حضرت سید جمال گوجری، حضرت مخدوم احمد عبدالحق ردوئیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ کل کی دعوت میں شاید آپ اس عاجز کو بھول گئے۔ حضرت مخدوم قدس سرہ نے جواب دیا کہ یہ تو کتوں کی مہمانی تھی۔ دنیا کے کتوں کو طلب کیا تھا۔ تو تو مسلمان بچہ ہے۔ تجھے اس دعوت سے کیا واسطہ۔

لفظ گوجری کے لقب کے متعلق مرآۃ الاسرار میں تحریر ہے کہ ایک دن سید سنی

عاشقان کے گھر میں فاقہ تھا، حضرت شاہ جمال صاحب کو تصرفات باطنی سے معلوم ہو گیا کہ حضرت موسیٰ عاشقان کے یہاں آج کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ چنانچہ آپ کو شیر برنج پکوا کر، ایک مٹی کے برتن میں رکھ کر اور اپنے سر پر نہ لے کر حضرت موسیٰ عاشقان کے پاس گئے۔ حضرت موسیٰ عاشقان نے آپ کو اس حالت میں دیکھ کر فرمایا "بابا مثل گوجراں آوردی" اسی دن سے آپ کا لقب "گوجری" پڑ گیا۔

اب اس جگہ سے آپ پھر داسنے ہاتھ (یعنی پورب طرف) کو مڑیے اور سڑک پر آجائیے۔ سامنے ہی آپ کو "مائیوں کا پنچاسی مندر" ملے گا۔ یہاں سے تھوڑی دور پورب کی طرف اور چلئے تو آپ کو "راجہ رام کوٹ" نامی مشہور محلہ ملے گا۔^{۱۸۲} زمانہ ماضی میں، اس کوٹ میں چار برج تھے۔ مغربی برج کے

۱۸۲۔ زمانہ ماضی میں محلہ راجہ رام کوٹ کا نام اکبر پور تھا۔ کہتے ہیں کہ شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر نے یہاں ہی اس کا نام اپنے نام پر اکبر پور رکھا تھا۔ تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیاء کے بموجب اس کوٹ کے اندر کی آراضی کو شہنشاہ اکبر نے مشائخ کبار کی قبرستان کے لئے عطا فرمایا تھا۔ مولوی عبدالکریم انصاری مرحوم کی تحریر کے بموجب اکثر شاہی فرامین میں یہ عبارت تحریر ہے کہ اس قدر آراضی بیکہ کے لئے دی گئی چنانچہ اب سے ستر اسی برس پہلے تک اس کوٹ کے اندر کئی قبرستان موجود تھے، جن میں ہزاروں قبریں موجود تھیں اور ابھی حالت میں تھیں۔ (تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیاء صفحہ ۴۸)

کے متعلق روایت ہے کہ اس حصہ میں راقم چند رچی پیدا ہوئے تھے۔ اور اسی میں ان کا باورچی خانہ (رسوئی گھر) تھا جسے شہنشاہ محمد ظہیر الدین بابر نے منہدم کروا کر ایک مالیشان مسجد تعمیر کروایا جو نہ صرف بلاد ہند بلکہ بیرون ہند میں بھی "بابری مسجد" کے نام سے مشہور ہے۔ بابری مسجد کے منبر پر جو کتبہ تاریخ کندہ ہے اس کی عبارت یہ ہے:-

بابری مسجد

بنالیت با کاخ گرد و ملاقی	بفرمودہ شاہ بابر کہ عدشش
امیر سعادت نشان میر باقی	بنا کردایں محبط قدسیاں را
عیان شد کہ "محکم" بود خیر باقی	"بود خیر باقی" چو سال بنائش
۱۱۳۴ھ	۹۳۵

۶۹۳۵

اودھ کی تاریخ میں جامع مسجد بابری یا بابری مسجد اور ہنومان گڑھی سے

خلق کچھ ایسی تلخ اور شیریں یادیں وابستہ ہیں جنکی تیرگی کے بھانک سائے اور اجالوں کے روشن بیوے ہمیشہ ذہن انسانی کو دعوت غور و فکر دیتے رہیں گے اب وہی اجالے اور اندھیرے ان مقامات کی تقدیس و عظمت کے مقدّم ہیں۔ ہم نے دانستہ طور پر اس سلسلہ کے ذکر کے ساتھ ان حالات و واقعات کو تحریر کرنا مناسب نہیں سمجھا کہ جس "رہبرانہ" تسلسل کے ساتھ اس کتاب کو ترتیب دیا گیا ہے۔ حالات و واقعات کا اندراج رہبرانہ تسلسل میں نہ اندازی پیدا کرنے کا باعث ہوتا اور قاری اپنے کو بھٹکتا ہوا محسوس کرتے۔ اس لئے کتاب کے آخری صفحات پر وہ واقعات بالتفصیل درج کر دینے

گئے ہیں۔ ————— مؤلف۔
تفصیلات متعلقہ صفحہ ۲۷۳
 آئیے اب کچھ آگے کی طرف چلیں۔

زمانہ ماضی میں بابری مسجد کے پورب جانب قاضی عبدالحفیظ صاحب کے قبرستان کی آراضی تھی، جو بعد کے زمانہ میں قاضی صاحب کے اخلاف نے قبرستان کو تباہی کی کاشت کرنے والے کاشتکاروں کو کرایہ پر دے دیا تھا۔ ان کرایہ دار کاشتکاروں نے تمام قبروں کو کھود کر ہموار کھیت بنا ڈالا اور قبروں کی اینٹوں کو فروخت کر کے نقد روپیہ کر لیا۔

جب قبرستان کی تمام زمین کھیت کی شکل میں ہموار ہو گئی تو قاضی صاحب کے وارثان نے اس زمین کو کافی منگے داموں پر بیراگیوں کے ہاتھ فروخت کر ڈالا مولوی عبدالغفار صاحب نے لکھا ہے کہ بابری مسجد سے "رنگ محل" تک جو آراضی بلندی پر واقع ہے، اس پر جس قدر بھی "استھان" اور عمارتیں بنی ہوئی ہیں وہ سب ان کے سامنے ہی تعمیر ہوئی ہیں۔ "لوگ بتلاتے ہیں کہ پہلے ان "استھانوں" کے پیچھے کچھ پختہ اور مضبوط قبریں باقی تھیں لیکن فی الوقت کسی قبرستان کا نشان ان جگہوں پر باقی نہیں رہ گیا ہے۔

مزار پیر نصیر الدین

بابری مسجد کی پشت پر، یعنی پچھم جانب زمانہ دراز سے ایک قبر پیر نصیر الدین کے نام سے مشہور چلی آ رہی ہے۔ زمانہ ماضی میں لوگ اس قبر پر فاتحہ خوانی اور نذر و نیاز چڑھانے کے لئے برابر آتے رہتے تھے۔ اُس وقت اس قبر کے آس پاس کافی صدقہ ریتی تھی۔ لیکن اب یہ جگہ بالکل ویران ہے۔ مولف کو کسی شخص کے ذریعہ پیر نصیر الدین صاحب کے مزار کی نشاندہی نہ ہو سکی۔ نہ آپ کے متعلق کوئی معلومات ہی حاصل ہو سکی کہ آپ کون تھے؟ آپ کا زمانہ کیا تھا؟ کس سلسلہ سے وابستہ تھے؟ وغیرہ وغیرہ۔

پیر نصیر الدین صاحب کے حالات تاریکی میں ہیں۔ محمد ہاشم انصاری نے مولف کو بتلایا کہ انہوں نے اپنے بچپن میں لوگوں سے سنا تھا کہ پیر نصیر الدین صاحب شہنشاہ جہانگیر کے زمانہ میں شہر اودھ کے مشائخ کبار میں سے تھے۔

مزار بزرگ نصیر الدین

میر فتح علی کے قبرستان کے احاطہ کے متصل ایک ریٹھا کے درخت کے نیچے باند و پختہ چوترہ پر کسی صاحب طریقت بزرگ نصیر الدین کی قبر تھی، لیکن نہ میر فتح علی کی قبرستان باقی ہے، نہ بزرگ نصیر الدین صاحب کی احاطہ سے متصل قبر اور نہ ریٹھا کا وہ درخت ہی باقی ہے جس کے نیچے بزرگ نصیر الدین کی قبر تھی۔ مولوی عبد الغفار صاحب نے لکھا ہے کہ اکثر لوگوں نے آپ کی قبر کے

پاس مانتے کیا ہے اور بہت محفوظ ہوتے ہیں۔^{۱۸۵} اس کے علاوہ آپ کے متعلق کوئی معلومات حاصل نہ ہو سکی۔

زار قاضی قدوی

بابری مسجد کے سامنے، یعنی پورب جانب، میدان میں ایک پختہ چوتراہ قاضی قدوی کا مزار ہے۔^{۱۸۶} زمانہ ماضی میں قاضی قدوی صاحب کے مزار کے متعلق چاروں طرف قبریں ہونے کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔ لیکن اب قبرستان کھیت میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اور تمام قبریں تلف ہو چکی ہیں۔

زمانہ سابق میں، اس جگہ ایک تھالی۔ بدلتی جس کے صحن میں قاضی قدوی صاحب کا مزار تھا۔ اب اس مسجد کی دیواریں منہدم ہو چکی ہیں۔ صحن مسجد ایک چوتراہ کی شکل میں باقی رہ گیا ہے جس پر قاضی قدوی صاحب کا مزار اب تک باقی ہے۔

صاحب تاریخ گم گشتہ حالات اجودھیا نے لکھا ہے کہ تقریباً نو سو برس کا عرصہ گزرا ہے کہ قاضی قدوی صاحب بطور حاکم شہر اودھ (اجودھیا) میں تشریف لائے تھے۔^{۱۸۷} آپ کے نام سے زمانہ سابق میں ایک محلہ دریائے گھاگرا کے کنارے

۱۸۵۔ صفحہ ۴۰

۱۸۶۔ قاضی قدوی صاحب کا مزار چونکہ بابری مسجد کے سامنے ہے اور اس جگہ پر پورس

کا پرہیز رہتا ہے۔ مسلمانوں کا اس جگہ پر جانا قانوناً ممنوع تو نہیں ہے، لیکن آٹا اور ساہو دانت کے پیش نظر، مسلمان اس جگہ پر امتیاز نہیں جاتے۔

آباد تھا اور اسی محلہ میں آپ کی قبر تھی۔^{۱۸۸}

کہتے ہیں کہ تقریباً دو سو سال کا زمانہ ہوتا ہے کہ آپ کے نام کا محلہ دریائے گھاگھر کے کٹاؤ میں آگیا تھا۔ اچودھیا کے اکثر ضعیف العمر لوگوں کی زبانی سنی ہوئی ایک روایت بھی متذکرہ بالا کتاب میں تحریر ہے۔ وہ اس طرح ہے کہ دریائے گھاگھر میں طغیانی آنے سے قبل قاضی قدوسی نے ایک بزرگ کو خواب میں خبردار کیا کہ ہماری نعش یہاں سے دوسری جگہ منتقل کر دو۔ لوگوں کا بیان ہے کہ جب نعش کو منتقل کرنے کے لئے قبر کو کھولا گیا تو وہ بالکل صحیح حالت میں تھی اور اس میں سے ایک عجیب قدرتی خوشبو آرہی تھی۔^{۱۸۹} نعش کو قبر سے نکال کر

۱۔ معتبر کتب تاریخ میں کسی قاضی قدوسی نامی شخص کا شہر اودھ (اچودھیا) میں بطور حاکم یا قاضی شہر انا ثابت نہیں ہے۔ نیز متذکرہ بالا حوالہ میں تقریباً نو سو سال پہلے کا واقعہ بتایا گیا ہے جو فرٹ میر یا محمد شاہ بادشاہ کا زمانہ تھا۔ اس زمانہ میں شہر اودھ (اچودھیا) میں مسلمانوں کی تھوڑی بہت آبادی تھی تو ضرور، لیکن اس شہر کی حیثیت "اسلامی اسٹیٹ" جیسی تو تھی نہیں جس میں قاضی شہر رہتا تھا جو مسلمانوں کے منازعہ معاملات کو اسلامی قوانین کے مطابق فیصلہ کرتا تھا۔ پتہ نہیں مولف کتاب نے بلا تحقیق و مسند کیونکر لکھ دیا کہ آپ بطور حاکم یا قاضی شہر، اچودھیا میں تشریف لائے تھے؟ مولف کو چاہئے تھا کہ وہ تحقیق کے ساتھ یہ تحریر فرماتے کہ فلاں بادشاہ کے وقت میں فلاں جگہ سے آئے تھے اور فلاں عہدہ پر کام کرتے تھے۔ — مولف۔

دوبارہ اس جگہ دفن کی گئی جہاں پر کہ اس وقت ہے۔

متذکرہ بالا کتاب کے صفحہ ۱۲۱ پر یہ بھی تحریر ہے کہ قاضی قدوسی صاحب کی اولاد میں لکھنؤ، بارہ بنکی اور فیض آباد کے اضلاع و قریات میں آباد ہیں۔ یہ تمام سچے نژادے ہیں اور اپنے نام کے بعد "قدوسی" لکھتے ہیں۔

قاضی قدوسی صاحب کے متعلق کوئی مستند تفصیل یا معلومات موافق کو نہ حاصل ہو سکیں۔ البتہ قاضی صاحب کی تاریخی شخصیت کی حیثیت مبہم ہو جانے کی وجہ سے، ان سے منسوب اور متعلق دیگر باتیں مشکوک سمجھنے میں کسی کو روکا نہیں جاسکتا۔

مزار بیٹا شاہ

راجہ رام کوٹ قلعہ کا دوسرا برج دکھن جانب تھا۔ اس برج کے متعلق ہندوؤں میں یہ روایت مشہور ہے کہ شری رام چندر جی کے زمانہ حکومت میں اس برج میں ان کا شاہی خزانہ رہتا تھا اور شاید اسی شاہی خزانے کی مناسبت سے اہل ہنود اسے کھیر ٹیلہ کہتے ہیں۔ اس ٹیلہ پر کسی ہٹی شاہ نامی بزرگ کا مزار تھا۔ تاریخ پارینہ مدینۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ ہٹی شاہ، بزرگ موصوف کا اصل نام نہیں تھا، بلکہ عرف ہے۔ جسکی وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ تقریباً نو سو سال کا زمانہ گزرا ہے کہ جب اودھ پر ایک ہندو راجہ حکومت کرتا تھا۔ جس کا دار السلطنت اجودھیا ہی تھا۔ اس راجہ کے زمانہ حکومت میں ایک

کامل بزرگ ۱۰ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ اجودھیا تشریف لائے۔ ۱۹ اور اسی
 برج پر قیام کیا۔ راجہ کے آدمیوں نے مزاحمت کی اور درویش کو تکلیفیں پہنچائیں
 لیکن درویش اسی برج پر قیام کرنے کے لئے بضد رہا۔ آخر کار راجہ کے آدمیوں
 اور درویش واسکے ہمراہیوں میں لڑائی ہوئی جس میں درویش سمیت اس کے
 تمام ہمراہی شہید ہوئے اور ٹیلہ پر ہی مندی (ہٹی) درویش اور ان کے
 ہمراہیوں کا مزار بنا۔ اور یہ جگہ مزار ہٹی شاہ کے نام سے عوام میں مشہور ہو گئی
 آج ہٹی شاہ کے مزار کا کہیں نام و نشان باقی نہیں رہا ہے۔ صرف
 ایک شکستہ دیوار باقی ہے۔ اس دیوار کے پیچھے، نشیب میں خود درویشوں
 اور جھٹاریوں کا جنگل ہے۔ اس جگہ پر بھی پولس کا پہرہ لگا ہوا ہے۔

آپ کے متعلق بھی بہت سی بے سرو پا روایات لوگوں میں مشہور ہیں
 آپ کے متعلق بھی اب کوئی شخص کچھ نہیں جانتا کہ آپ کون تھے؟ کن وجوہات
 کی بنا پر وہ اس ٹیلہ پر قیام کے لئے بضد تھے؟ اور کیا واقعی ان سینہ بسینہ
 چلی آنے والی دہائیوں میں کچھ صداقت بھی ہے؟ آپ کس راجہ کے در حکومت
 میں اجودھیا شہ میں تشریف لائے تھے؟

مزار یقین شاہ

قلعہ راجہ رام چند رکوٹ کے تیسرے برج کو سگریو ٹیلہ کہتے ہیں۔ اب
 سے تقریباً ستر اسی برس پہلے تک، اس ٹیلہ پر بہت سی قبروں کے نشان

مٹے تھے۔ اس برج کے نیچے، پورب جانب یقین شاہ نام کا قبرستان تھا۔
جواب کھیت میں تبدیل ہو چکا ہے۔

گم گشت حالات اجودھیا میں لکھا ہے کہ جب مولوی عبدالکریم انصاری
مرحوم اپنی یادداشتوں سے، اپنی کتاب مدینۃ الاولیاء مرتب کر رہے تھے،
اس وقت اس جگہ پر ایک قبر باقی تھی جس پر کتبہ لگا ہوا تھا۔^{۱۹۱} آپ کے حالات
وغیرہ سے بھی لوگ لاعلم ہیں۔

راجہ رام چندر کوٹ قلعہ کلچو تھا برج، جو پورب کی طرف تھا، اب وہ
ہنومان گڑھی کے نام سے مشہور ہے۔ اس پر ہنومان جی کا مشہور مندر ہے
ہنومان گڑھی بنا ہوا ہے۔ ہندوؤں کا کہنا ہے کہ راجہ رام چندر جی کے زمانہ
حکومت میں، ان کی فوج کے کمانڈر شری ہنومان جی، قلعہ کے اسی برج میں
رہتے تھے اور یہی برج قلعہ کا پھاٹک یا صدر دروازہ تھا۔^{۱۹۲} شہنشاہ اورنگ
زیب عالمگیر (رحمۃ اللہ علیہ) کے عہد حکومت میں، اس ٹیلہ پر زمانہ ماضیہ کی
بنی ہوئی ایک مسجد تھی جو ایک زمانہ بعد شکست ہو کر گر پڑی تھی۔ ۱۸۹۲ء تک
اس مسجد کی پتھری دیوار باقی تھی، جس پر سنگ موسیٰ کا ایک پتھر لگا ہوا تھا اور جس پر لفظ
اللہ کھدا ہوا تھا۔

مولوی عبدالکریم انصاری مرحوم نے لکھا ہے کہ زمانہ ماضی میں یہ ٹیلہ بھی
قبرستان تھا اور پاتی شاہ، جو ایک آزاد منش درویش تھے، ان کے چیلوں کا اس

۱۹۱۔ کتبہ کی عبارت کیا تھی؟ اس کے متعلق مذکورہ کتاب کے صفحہ ۴۲ پر کچھ نہیں لکھا ہے مولف

۱۹۲۔ تاریخ اجودھیا مولفہ منشی لچھی نرائن صدر قنونو، گونڈہ، صفحہ ۷۱

پر قبضہ تھا۔ نواب شجاع الدولہ مرحوم کے ابتدائی عہد حکومت تک اس ٹیلہ پر پانی شاہ کے پیلوں کا قبضہ برقرار تھا۔

راجہ بہت بہادر، انوپ گیر گوشائیں، جو نواب شجاع الدولہ کے ملازم ناٹوں کے افسر اور نواب موصوف کے منظور نظم مصاحبین خاص سے تھے۔ نواب صاحب کے مسند وزارت پر بیٹھنے کے چند ہی دنوں کے بعد انوپ گیر نے اپنے ساتھی ناٹوں کے ذریعہ ایک نمایاں کام انجام دیا تھا جس سے نواب وزیر بہت زیادہ "محظوظ" ہوئے تھے۔ ۱۹۳

شاہ محمد یار کا قبرستان

زمانہ ماضی میں خواجہ بٹہ شاہ کے ٹیلہ کو جسے اہل بنود کھیر ٹیلہ کہتے ہیں، نیچے ایک مسجد اور شاہ محمد یار صاحب کا وسیع قبرستان تھا۔ اس قبرستان میں سی قبروں کے علاوہ شاہ محمد یار اور ان کے فرزند شہادت علی وغیرہ کی بھی قبریں تھیں۔ شاہ محمد یار، نواب شجاع الدولہ کے عہد حکومت میں تھے۔ نواب موصوف کی سرکار سے سولہ بیگمہ کی آرائشی قبرستان کی غرض سے شاہ صاحب کو عطا تھی۔ ۱۹۴

اب شاہ محمد یار صاحب کا قبرستان ختم ہو چکا ہے۔ اور کسی ایک قبر کا

نشان بھی باقی نہیں رہا ہے۔ اب اس قبرستان کی آراخی پر امرود، آموں اور بٹیل کے درختوں کا باغ لگا ہوا ہے۔

قبرستان سبحان

خواجہ ٹٹی شاہ کے ٹیلہ کے نیچے جس مسجد کا ذکر اوپر، شاہ محمد یار کے قبرستان کے ذکر میں آچکا ہے، اسی مسجد کے پیچھے زمانہ مانسی میں کسی سبحان شاہ نامی بزرگ کی قبر تھی۔ کہتے ہیں کہ آپ اہل جذب میں سے تھے۔ آپ کا ذکر کسی کتاب میں نہیں ملتا، البتہ سننے، سنانے والی روایات کا خزانہ اب تک موجود ہے۔

یہ جگہ اب کمیت اور پھلوں کے باغ میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اب شاہ سبحان کی قبر کا کہیں کوئی پتہ و نشان باقی نہیں رہ گیا ہے۔ آپ کے حالات بھی موشی کے اندھیروں میں گم ہو چکے ہیں۔

اب ہم خواجہ ٹٹی شاہ کے ٹیلہ کے نیچے سے گزرنے والی سڑک سے واجودھیاریلوے اسٹیشن کو جاتی ہے اور جس کے ارد گرد امرود کے باغ و رکھیت ہیں، اس راستے پر چلتے ہیں۔ تھوڑی دور اس راستے پر چلنے کے بعد سبحان کا اناط نامی محلہ میں آتے ہیں جو بششٹ کنڈ نامی مشہور علاقہ کے اندر واقع ہے۔ یہاں اگر گول بھونامندہ کے پاس آکر رک جائیے۔ سامنے بائیں ہاتھ پر یعنی دھن جانب کو ایک کچا راستہ گیا ہے جو آگے جا کر فیض آباد واجودھیاریلوے کے سامنے ختم ہو جاتا ہے۔

مزار سید السلطان حضرت موسیٰ عاشقان

اس کے راستہ پر تھوڑی دور دھن جانب چلنے۔ یعنی تقریباً سوا سو میٹر دھن کی طرف چلنے کے بعد ۱۰ داہنے ہاتھ پر ایک ایسی قطعہ آرائشی نظر آتی ہے جس پر چکوڑ، بیبیا نامی خود رو جھاڑیاں لگی ہوئی ہیں۔ نام راستہ سے تقریباً بیس پچیس قدم کے فاصلہ پر ایک قدرے اونچے چوڑے برآمدہ چند دوسری قبروں کے ساتھ سید السلطان حضرت موسیٰ عاشقان صاحب کا مزار ہے۔

مزار کے پاس کافی گندگی ہے اور کوڑا کباہ کا انبار لگا ہوا ہے۔ ہر دیکھنے والے کو پہلی ہی نظر میں معلوم ہو جاتا ہے کہ اب یہاں شاید ہی کبھی کوئی شخص فاتحہ خوانی یا زیارت کے لئے آتا ہے کیونکہ اگرچہ یہ افراد کی آمد و رفت اس جگہ ہوتی تو یقیناً ارتکب پہنچنے کا چند قدم کا راستہ ضرور کسی قدر صاف ہوتا۔

کہتے ہیں کہ سید السلطان حضرت موسیٰ عاشقان صاحب شاہان شریف کے دور حکومت میں شاہ اودھ (جو دھیا) میں تشریف لائے تھے۔ اس وقت اس شہر کی ولایت حضرت شاہ جلال کے سپرد تھی جنہیں اکثر لوگ سید بڈھی بھی کہتے تھے۔ چنانچہ سید السلطان حضرت موسیٰ عاشقان صاحب کو حضرت شاہ جلال عرف سید بڈھی کی اجازت سے ہی یہاں قیام فرمایا تھا۔ مراد الامراء وغیرہ میں آپ کا ذکر موجود ہے۔^{۱۹۵}

حضرت موسیٰ عاشقان نے کس سن میں انتقال فرمایا؟ اس کا یہاں کسی کو کوئی علم نہیں ہے البتہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کا انتقال ۸ صفر کو ہوا تھا۔ اسی بنا پر زمانہ ماضی میں لوگ ہر سال آپ کا ۸ صفر کی آٹھویں تاریخ کو کرتے تھے لیکن ادھر گزشتہ بیس پچیس سالوں سے عرس بند ہو چکا ہے۔

اب ہم مزار سید السلطان حضرت موسیٰ عاشقان سے سامنے دھن کی طرف چل کر فیض آباد، جو دھیار وڈ پر آجاتے ہیں اور اسی جنرل سڑک سے فیض آباد شہر کی طرف چل کر موجودہ ٹیڑھی بازار کے چوراہا پر آتے ہیں۔

مزار عثمان شہید

ٹیڑھی بازار کے چوراہے سے اتر جانب محلہ کٹہ کو جانے والی سڑک پر تقریباً دو سو میٹر چلنے کے بعد بائیں ہاتھ یعنی پچیم جانب ایک احاطہ کے اندر کسی عثمان شہید نامی شخص کا مزار ہے جو کھلے آسمان کے نیچے ہے۔ اس مزار کو دیکھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لوگ اس مزار کی دیکھ بھال میں دلچسپی لیتے ہیں کیونکہ مزار کی حالت اور اس کے ارد گرد کی جگہ کی حالت بہت اچھی اور صفائی وغیرہ کافی ہے۔

محمد عثمان شہید کے مزار کے احاطہ سے متصل محمد عارف صاحب کا مکان ہے۔ تاریخ پاریہ مدنیۃ الاولیاء کے حاشیہ نگار نے نہ جانے آپ کا ذکر کیوں بھونٹ کر الفاظ میں کرتے ہوئے شہید موصوف کو نور بانوں کی اولاد میں سے ہونا بتلاتے ہیں۔^{۱۹۶}

محمد عثمان صاحب نے کس زمانہ میں جام شہادت نوش فرمایا؟ اور کس جہاد میں ایکس کے ساتھ جہاد میں شریک ہونے تھے، ان تمام باتوں کی کوئی معلومات نہ ہو سکی۔

اب پھر واپس ٹیڑھی بازار کے چوراہہ پر آئیے۔ یہاں سے تھوڑی دور اور آگے اتر کی طرف چلے تو دواہنے ہاتھ پر قضیانہ نامی محلہ ملے گا۔ یہ محلہ شاہ محمد یار کے قبرستان اور خواجہ ہٹی شاہ کے مزار کے دھن جانب پڑتا ہے

مزار حضرت جلال شاہ

محلہ قضیانہ میں قاضی لطیف اللہ انصاری کی مسجد کے دروازہ کے سامنے، زمانہ سابق میں کچھ ایسے آثار و باقیات کے نشانات ملتے تھے جنکی بنا پر مولوی عبدالکریم انصاری مرحوم نے لکھا ہے کہ اس جگہ پر کوئی وسیع و عریض خانقاہ۔ ہی ہوگی لیکن اب اس جگہ پر مکانات بنے ہوئے ہیں اور کوئی ایسے آثار باقی نہیں ہیں جنکی بنیادوں پر آج اس جگہ پر کسی خانقاہ یا مدرسہ ہونے کا گمان کیا جاسکے۔

شاہ جلال صاحب کے مزار کا نشان تک اب مٹ چکا ہے۔ اب اس جگہ پر لوگوں کے مکانات بنے ہوئے ہیں۔

قاضی لطف اللہ انصاری کے متعلق مولوی عبدالکریم انصاری مرحوم نے لکھا ہے کہ آپ حضرات اورنگ زیب (رحمۃ اللہ علیہ) کے زمانہ میں شہر اودھ میں تشریف لائے تھے اور صدر الصدور کے عہدہ پر تھے۔ حضرت سید السلطان

موسى عاشقان صاحب آپ ہی کی اجازت سے شہر اودھ میں قیام فرمایا تھا
 لوگ آپ کو سید بڑھی یا سید بڑھے کے نام سے بھی پکارتے تھے۔
 حضرت شاہ جلال صاحب کا ذکر مولف کو کسی کتاب میں نہیں مل سکا۔ اور
 باوجود تحقیق نہ تو آپ کا سلسلہ معلوم ہو سکا اور نہ وطن اور نہ شہر اودھ (اجودھا)
 میں آمد وغیرہ کے متعلق ہی کچھ معلوم ہو سکا۔ صاحب تاریخ پارینہ مدنیۃ الاولیاء نے
 لکھا ہے کہ حضرت شاہ جلال اودھی، حضرت محبوب الہی، نظام الدین اولیاء،
 (رحمۃ اللہ علیہ) کے خلیفہ تھے اور آپ کو لوگ "سید بڑھی" کہتے تھے۔^{۱۹}

مقبرہ شاہ اولیس صاحب

اسی محلہ قضاہ میں شرک کے یورب جانب شاہ اولیس نامی کسی بزرگ
 کا مقبرہ ہے۔ یہ مقبرہ اجودھیا فیض آباد روڈ پر، فیض آباد سے اجودھیا آنے والی
 شرک پر باتیں ہاتھ پر فرزند علی صاحب کے مکان کے پچھم۔ شرک سے تقریباً
 پندرہ بیس میٹر اندر، پچھم جانب ایک اعاطہ کے اندر واقع ہے۔ شاہ اولیس
 صاحب کا یہ مقبرہ بہت اچھی حالت میں ہے۔ اسکی صفائی وغیرہ دیکھنے سے
 معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس کی دیکھ بھال میں دلچسپی لیتے ہیں۔ فی الوقت اس
 اعاطہ میں اتر جانب چند کمرے اور دالان بنادیئے گئے ہیں جن میں بچوں کا
 ایک "اسلامیہ مکتب" چل رہا ہے جس کا خرچ شاید اسی محلہ کے لوگ برداشت کرتے
 ہیں اور کچھ امداد زکوٰۃ، فطرہ وچرم قربانی سے بھی ہو جاتی ہے۔

شاہ ادیس صاحب سے منسوب بہت سی کرامات لوگ بیان کرتے ہیں
آپ کے متعلق بھی کوئی تفصیل معلومات نہ حاصل ہو سکی، اور نہ آپ کا سلسلہ
وغیرہ ہی معلوم ہو سکا۔ مولوی عسب اللہ کریم انصاری مرحوم نے بھی آپ کے متعلق صرف
اتنا ہی تحریر فرمایا ہے کہ شاہ ادیس صاحب کا شمار اودھ کے مشائخ کبار میں
ہوتا تھا۔ آپ نے شادی نہیں کیا تھا۔

مولوی صاحب مرحوم نے آپ کے بارے میں بالتفصیل و بالتصریح
کچھ نہیں لکھا ہے۔ صرف اتنا ہی لکھنا کافی نہیں تھا کہ آپ کا شمار اودھ کے
مشائخ کبار میں ہوتا تھا۔ کم از کم زمانہ یا عہد حکومت ہی آپ نے لکھ دیا ہوتا تو
ممکن ہے کہ آپ کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں کچھ آسانی ہوتی۔

مزار عاشق شاہ

اسی محلہ قضاہ میں سواروں کے امام باڑہ کے چبوترہ کے نیچے کسی عاشق شاہ
نامی شخص کا مزار ہے۔ جو آج بھی اچھی حالت میں ہے۔ مولف کم گشتہ حالات اجودھا
نے لکھا ہے کہ انہوں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ شاہ صاحب ذی استعداد
فاضل تھے اور اہل طریقت میں سے تھے اور لوگوں کو درس دیا کرتے تھے۔
آپ کے انتقال کی تاریخ کا مصرع یہ ہے:

آستانہ امام شد جایش

۵۱۷ + ۸۲ + ۳۰۴ + ۳۱۴

۱۲۱۷ھ

مصر تا تاریخ سے آپ کا سن وفات ۱۲۱۲ھ برآمد ہوتا ہے، جو نواب آصف الدولہ کا عہد حکومت ہے۔ ممکن ہے کہ آپ نواب آصف الدولہ کے عہد حکومت میں کسی جگہ سے شہر اودھ میں تشریف لاتے ہوں اور یہیں پر انتقال فرمایا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کی شخصیت دنیوی حیثیت سے بااثر ہی ہو اور مرنے کے بعد ایک عالی شان مقبرہ، دستور کے مطابق تعمیر کرایا گیا ہو۔ اور بعد کے آنے والے زمانہ میں دنیوی حیثیت بدل کر دینی حیثیت ہو گئی ہو (واللہ اعلم بالصواب)

بہر حال آپ کا ذکر نہ تو نوابین اودھ کے تعلق سے کسی کتاب میں مولف کی نگاہ سے گذرا اور نہ اجودھیا کے مشائخ کی کسی دستیاب کتاب میں ملا۔ اور نہ ہی کسی مستند روایت ہی سے آپ کے حالات اور سلسلہ وغیرہ پر کوئی روشنی پڑتی ہے۔

مزار سید عالم صاحب محد قضاۃ سے متصل ایک آبادی ہے جو کسی زمانہ میں 'مرئی ٹور' کہلاتی تھی^{۱۹۵} اس زمانہ میں اس محلہ میں درگاہ حضرت شیخ علیہ السلام کے خادمان کے خاندان رہتے تھے۔ ان خادمان کی رہائش کی نسبت سے کچھ لوگ اس محلہ کو 'مجاور ٹور' بھی کہنے لگے تھے۔

اس مرئی ٹور میں سید عالم صاحب کے مزار کا ذکر گم گشتہ حالات اجودھیا کے مولف نے کیا ہے لیکن مولف کتاب لہذا کو یہ مزار باوجود تلاش کے نہ مل سکا اور نہ سید عالم صاحب کے متعلق کوئی معلومات ہی حاصل ہو سکی۔

مزار شہید نور الدین

محلہ قصبیانہ کے اتر جانب دریائے گھاگھر کے کنارے پر چکرتیرتھ نامی محلہ ہے۔ اب سے تقریباً دیرھ۔ دو سو برس پہلے یہاں ایک بلند ٹیلہ تھا جس پر کسی نور الدین شہید صاحب کا مزار تھا۔ مولوی عبدالکریم انصاری اور علی مرحوم نے لکھا ہے کہ زمانہ ماضی میں لوگ اس ٹیلہ کو نور الدین شہید کا ٹیلہ کہتے تھے۔ ایک زمانہ میں دریائے گھاگھر اس ٹیلہ کے نیچے آگیا تھا جس سے بہت سی قبریں برباد ہو گئی تھیں۔ انکی انٹیں اور چونہ وغیرہ سب کچھ دریا میں بہ گیا۔ موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس جگہ کے آثار و باقیات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹیلہ پر کوئی عمارت یا مقبرہ رہا ہوگا کیونکہ اس جگہ پر جو کچھ وغیرہ جس ڈھنگ یا طور سے پڑے ہیں، اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان سے ٹیلہ پر جانے کا زینہ بنا رہا ہوگا۔

گزشتہ حالات اجمودھیا کے مولف نے لکھا ہے کہ انھوں نے بچشم خود ایک فرمان حضرت شاہ جہاں بادشاہ کا دیکھا ہے جو دھنوتری گوشائیں کی اولادوں کے پاس تھا۔ اس فرمان میں تیس بیگہ زمین گوشائیں کو آباد ہونے کیلئے دی گئی تھی۔ فرمان مذکور میں آبادی کیلئے دی گئی اس زمین کی شمالی حد میں "ٹیلہ نور الدین شہید" لکھا ہوا تھا۔
مولوی عبدالکریم انصاری مرحوم نے مشہد نور الدین صاحب کا ایک واقعہ اس طرح

۱۱ (ج بھی کچھ لوگ اس محلہ کو "بھاری ٹور" کہتے ہیں کیونکہ اس محلہ میں درگاہ حضرت

فیث علیہ السلام کے خاندان کے لوگ آباد ہیں۔ مولف

لکھا ہے کہ کسی زمانہ میں برسات کی وجہ سے آپ کی قبر کھل گئی تھی، اُس وقت لوگوں نے دیکھا
 کہ آپ کا سارا عضو صحیح و سلامت تھا۔ حتیٰ کہ دانت اپنی جگہ قائم تھے۔ لوگوں نے شکر
 سے قبر کو بند کر دیا۔
 آپ کے متعلق بھی کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

تفصیل بسلسلہ صفحہ ۲۵۶

متعلقہ بابری مسجد

پاک اس اہلے گستاں کی نہ ہو کیونکہ زمیں ؟

خانقاہ عظمت اسلام ہے یہ سرزمین

اگر مشہر اودھ (اجودھیا) کے ذکر میں جامع مسجد بابری اور ہنومان گڑھی کا تذکرہ
نظر انداز کر دیا جائے تو اس شہر کی عظمت و تقدس اور اس کی تاریخ ساز حیثیت و اہمیت کا وہ
گوشہ جس کی ضو نشانیاں اس شہر کی تابندگی و پائندگی کا سبب رہی ہیں، یادوں کے دبیز
کبرے میں چھپ جائیگا۔

امتداد زمانہ کے تاریخ ساز نشیب و فراز نے اتفاقات و حادثات اور حالات و
واقعات کے ناموں پر جس تمدن کی بنیاد ڈالی تھی، اس نے نہ صرف تاریخ کو کچھ 'اجنبی موڑ'
ہی دیتے بلکہ ایک ایسے تمدن کو جنم دیا جو قدیم آبائی مروجہ روایات کے خلاف ہونے کے باوجود
معاشرہ میں اسرار و خواص کے طبقہ کے لئے باعث افتخار رہا ہے۔

بابری مسجد اور ہنومان گڑھی کی عظمت و تقدس، عقائد کے بموجب مسلم سہی،
لیکن انہیں محض تاریخی مقامات سمجھنا، ان کی تاریخ ساز حیثیت و اہمیت کا مفہوم اڑانا ہے۔
انہوں نے تاریخ میں کچھ نئے ابواب کا اضافہ کیا ہے۔ معاشرہ پر کچھ اپنے اثرات چھوڑے
ہیں ہماری تہذیب و تمدن پر ان کے کچھ اہم نقوش ترسم ہیں۔ انہوں نے ہماری صدیوں

نی سپات تاریخ کو ایک شناسا رخ بھی دیا ہے۔

ان عمارت کا چپہ چپہ ہمارے کردار کی بندی و پستی اور ہماری ناماقتب اندیشی و کوتاہ بینی کے آغاز و انجام کے مضمرات کا پر تو ہے۔ یہ ہماری غیرت و حیت کی قربان گاہ ہے۔ بھوٹی داد و دہش کی روایات کے کھوکھلے انصاف کا نمونہ بھی۔ یہ ہمارے اسلاف کی رت و ناموسی کی مدفن بھی ہیں اور انکی بے بسی و بے ادراکی کا شاہکار بھی۔ یہ ہماری وسیع الشرب و رواداری اور مذاہب کے احترام و آزادی کی زندہ جاوید حقیقت ہیں یہ ہماری وسیع قلبی اور باغ انظری کی لازوال مثالیں ہیں۔

یہ عمارت ہمارے اعمال و کردار اور ہمارے خلوص و پشاک کی ایسی کسوٹی میں جن پر ہمارے جذبہ نفرت و تعصب، محبت و نفرت اور بیگانگت و یگانگت کو باسانی پرکھا اور جانچا جاسکتا ہے۔ ان عمارت کی تعمیر قومی یک جہتی کے مضبوط گارے ہوئی تھی یہ اس ہندوستان کلچر کا لازوال شاہکار میں جس کی آبپاری شہر اور دیہ میں ہوئی تھی اور جو اودھ میں اس طرح پھولا پھلا کہ اب تک ہندوستان کو اس پر فخر و تازہ ہے۔

آئیے۔ آج اس مفخر ہندوستانی کلچر کے شمار و قیات کی سیر کریں جو حادثات زمانہ اور اس کے نشیب و فراز سے تنگ آکر موت سے زندگی کی بھیک مانگ رہا ہے۔

ہے تو گورستان، مگر یہ خاک گردوں پایہ ہے
آہ! اک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے

قلعہ راجہ رام کوٹ کے ذکر میں ہم گزشتہ اوراق میں لکھ چکے ہیں کہ اس کوٹ میں چار برج تھے۔ مغربی برج کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ اس میں رام چند رتی کی پائش ہوئی تھی اور بعد میں یہی جگہ سیتا جی کا باورچی خانہ بنی جس میں سیتا جی کھانا بنایا کرتی تھیں مشرقی برج میں رام چند رتی کی فوج کے کمانڈر منوآن جی رہائش گاہ تھی۔ جنوبی برج کے متعلق مشہور ہے کہ اس میں شاہی خزانہ رہتا تھا۔ البتہ شمالی برج کے متعلق کوئی روایت نہیں ملتی۔

کہا جاتا ہے کہ شہنشاہ ہند، محمد ظہیر الدین بابر نے مغربی برج کو منہدم کر دیا ایک عالی شان مسجد تعمیر کروایا جو نہ صرف ہند بلکہ بیرون ہند میں بھی جات مسجداں باری یا باری مسجد کے نام سے مشہور ہے۔

باری مسجد کے منبر پر جو کتبہ تاریخ کندہ ہے، اسکی عبارت یہ ہے

بفرمودہ شاہ بابر کہ عیش و عشرت بنایت پاک کا رخ مگردوں ملاق

بنا کردایں محیط قدسیاں را امیر سعادت نشاں میر باقی

بود خیر باقی چو سال بنائش عیاں شد کہ حکم بود خیر باقی

۹۲۵ھ

۱۱۳۶ھ

۹۲۵ھ

سبب تعمیر جامع مسجد باری گم گشتہ حالات وجود صیام میں مولوی سید عبد الغفار نے لکھا ہے کہ بابر اپنے بچپن کے ایام میں خفیہ

طور پر اور فقیرانہ لباس اکابر سے ہندوستان آیا تھا۔ اس زمانہ میں ہندوستان پر سلطان سکندر لودی حکمران تھا۔ اور شہر اودھ (اودھیا) اس وقت ایک صدر مقام تھا۔ بابر نے شہر اودھ میں آکر شاہ جلال اور حضرت موسیٰ عاشقان کی خدمت میں حاضر ہو کر ہندوستان پر فتح یاب ہونے کیلئے باطنی امداد طلب کیا تھا۔ تاکہ ان بزرگوں کی دعا سے ہندوستان کی حکومت اُسے حاصل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ان بزرگوں کی دعا کو شرف قبولیت بخشا۔ ہندوستان فتح کر لینے کے بعد بابر نے بطور یادگار فتح شہر اودھ (اودھیا) میں ایک عالیشان مسجد میرانی کی نگرانی میں تعمیر کروایا، جو اب تک اپنی شاہانہ عظمت اور شان و شوکت کے ساتھ موجود ہے۔ اور بابر کی مسجد کے نام سے ہمارے ہندوہیوں ہند میں مشہور ہے ایک دوسری روایت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ بابر بادشاہ چوہاندانی زمانہ شباب میں کابل سے فقروں کے بھیس میں شہر اودھ میں آیا تھا۔ یہ زمانہ سلطان سکندر لودی کا تھا۔ شہر اودھ میں آنے کے بعد بابر بادشاہ نے حضرت شاہ جلال اور حضرت موسیٰ عاشقان قدس سرہ العزیز کی خدمت میں حاضر ہو کر باطنی امداد طلب کیا تھا کہ ہندوستان کی سلطنت اس کے ہاتھ آجائے ۲۲

مولوی سید عبدالغفار نے لکھا ہے کہ ان بزرگوں نے بادشاہ کو کہا کہ ہماری دعا

۲۷۶ صفحہ ۲۰

۲۰۲۔ شہنشاہ محمد ظہیر الدین بابر کا ایام شہزادگی میں کابل سے بھیس بدل کر شہر اودھ میں آنے نہ تو تذکرہ باری میں ملتا ہے نہ مغلبدن میگم مرحوم کے چالیوں نامہ میں اور نہ کسی مستند و غیر مستند تاریخی کتاب میں کوئی اشارہ ملتا ہے۔ یہ روایت محض "زیب داستان" کیلئے مولوی عبدالغفار نے اپنے علمی تجرک کارنامہ سے واقف غلام پر اُڑھ ڈالنے کے لئے گڑھ دیا ہے۔ حقائق سے اس کا کوئی دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ مولف

کی قبولیت اس نیت پر ہے کہ اگر تم مندرجہ ذیل استخوان ڈر سولی گھر بیٹا پر سجدہ تعمیر کرنے کا وعدہ کرو تو ہم تمہارے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا کریں۔ پھر نے صدق دل سے نیت کیا اور وعدہ کیا کہ اگر ہندوستان کی حکومت اس کے ہاتھ آجائے گی تو وہ متذکرہ بالا مقام پر مسجد تعمیر کرائے گا۔ چنانچہ دونوں بزرگوں اور حاضرین نے دعا کیلئے ہاتھ اٹھایا۔ کچھ دیر یا بران بزرگوں کی خدمت میں رہا، پھر واپس کابل چلا گیا۔ ۲۰۴

کچھ دنوں بعد بابر بادشاہ نے جدید آلات حرب سے آراستہ دبیرانہ، تھوڑی سی نسل فوجائے ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ اور پانی پت کے مشہور میدان میں سلطان سکندر لودی اور بابر بادشاہ کی فوجوں میں زبردست جنگ ہوئی، جس کی تفصیل تہذیب نامہ تاریخ کی کتابوں میں لکھی ہوئی ہے۔ اس جنگ میں سلطان سکندر لودی کو شکست فاش ہوئی اور بابر ہندوستان کی سلطنت پر قابض ہو گیا۔

۲۰۵۔ مولانا ابوالفضل کا من گزشتہ فقرہ ہے کہ ہندوستان ازل سے جس سے اپنے شاہ جلال اور حضرت موسیٰ عاشقان کا ایک کرمست اور محبوب اور گاہ خداوندی ثابت کرے کی بے سود کوشش کیا ہے۔ مولانا صاحب شاید یہ بھول گئے کہ کوئی بھی بزرگ دین شریعت مطہرہ کی ادنیٰ سی خلاف ورزی کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ پھر حضرت شاہ جلال اور حضرت موسیٰ عاشقان جیسے بزرگوں میں یہ جرأت کہاں سے اٹھ کر اٹھو گئے ایک پرانے دستکدہ کو سمار کرنے کا وعدہ کیا اور اسلام تو پرانے بتوں کو دیران و مسلمان کرنے سے منع کرتا ہے اور یہ حضرات جہیں بزرگ دین کہا جاتا ہے سمار کرنے کی شرع واجب کرتے ہیں۔

کسی بزرگ دین یا ولی اللہ کی طرف یہ حسب کرنا کہ وہ پرانے بتکدوں کو دیران و سمار کرنے کیلئے بعد تھے قطعی غلط اور بے بنیاد الزام ہے۔ ان عظیم المرتبہ بزرگوں پر سید عبد الغفار نے تھوڑی جہت لگا کر عام جذبات مسلمانوں میں اپنی استغیرویت بڑھانے کی مکر وہ کوشش کیا ہے اور ہندو مسلم منافرت کا ایسا بیج بویا ہے جس کا پودا شاہد ایک زمانہ دراز تک خشک نہ ہو سکے گا۔ مولانا

۲۰۶۔ گزشتہ حالات اور دھیا صفحہ ۲۰۵

اس فتحِ عظیم کے موقع پر پوربی زبان میں کسی شاعر نے فتحِ اتر کی تاریخ ایک چوڑی
میں اس طرح بیان کیا ہے :

نوسے اور پھٹا تھیا پان پت بھارت دیا
بارگاہِ رجب بار شکر دار بابر جیت . براہم مار

نوٹ :- باری مسجد ۱۹۴۹ء میں ضابطہ فوجداری کی دفعہ
۱۴۵ کے تحت قرق ہو گئی۔ ۲۱، ۲۲ دسمبر ۱۹۴۹ء
کی درمیانی شب میں ڈیوٹی پر موجود پولیس پارٹی
کی موجودگی (کسی طرح شہر پسندوں کے ذریعہ بت
رکھ دیا گیا ہے۔ اور دن رات پولیس پارٹی کا پہرہ
لگا ہوا ہے۔

(ہفت روزہ نئی دنیا، دہلی شہر، ۱۲ جولائی ۱۹۴۹ء)

لام چند رجبی کے قلعہ 'رام کوٹ' کے مشرقی برج کے متعلق جو قلعہ کا صدر
دروازہ تھا یہ روایت مشہور ہے کہ اس میں راتم چند رجبی کی افواج کے کمانڈر ہنومان رجبی
رہتے تھے۔ اس برج پر زمانہ ماضی کی ایک مسجد عتی جس کی پچھی دیوار ۱۸۹۴ء تک
باقی تھی۔ نواب شجاع الدولہ کے عہد حکومت میں اس جگہ ایک کوٹھری بنا کر، آثار کے

طور پر، میں ہنومان جی کی مورقی رکھی گئی۔ جو آنے والے بعد کے زمانہ میں تبدریخ
مراحل طے کرتے ہوئے، آج ایک عظیم الشان مندر کی شکل میں، ہنومان گڑھی کے
نام سے ساری دنیا میں مشہور ہے۔ روزانہ ہزاروں عقیدت میں یہاں آکر درشن کرتے
ہیں اور خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

ہنومان گڑھی کی تعمیر کا حال راجہ بہت بہادر انوپ گہر اور اس کے بھائی
امراؤ گہر، جو لازم ناگوں کے افسر تھے،

انہوں نے نواب شجاع الدولہ کے لئے جو کتابائے نمایاں، انجام دیئے تھے، اس سے
نواب وزیر ان لوگوں کے بہت زیادہ ممنون احسان تھے۔ اور ہمیشہ ان کی دلجوئی اور
خاطر کو مقدم سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان دونوں بھائیوں کی سفارش سے گوشائیوں نے
مشرقی برج پر ایک کوٹھری کی جگہ حاصل کیا۔ جب کوٹھری کی جگہ مل گئی تو ایک کوٹھری اور
بناکر اس میں ہنومان جی کی مورقی رکھ دیا۔

۱۰۶۔ تاریخ ابودھیادھنوی، اپنی منشی پٹنن، صدر قانون گو صاحب اور دور کی کوڑی
لاٹ میں، انہوں نے لکھا ہے کہ نواب صفدر جنگ کے دور حکومت میں ابھی رام نام کا ایک مہند و نقر
اس جگہ پر رہتا تھا۔ اتفاقاً نواب موصوف سخت بیمار ہوئے تو ابھیے رام سے رجوع کیا۔ اس نے دعا کیا
اسکی دعا کی برکت سے نواب ابوالمنصور صفدر جنگ کو صحت ہوئی اور وہ بہت خوش ہوتے۔ چنانچہ
ابھیے رام نے ہنومان جی کے مندر بنانے کی صفدر جنگ سے اجازت مانگی اور ہنومان جی کا مندر
بنوایا۔ جو اس وقت "ہنومان گڑھی" کے نام سے مشہور ہے۔ کاش منشی جی یہ نوا در پیر واقعہ
تحریر کرنے سے پہلے ادوہ کی کسی تاریخ کی کتاب کو ایک نگاہ دیکھ لیتے۔ موصوف

ایک عرصہ تک اس کو ٹھری نامہ مند پر اجودھیا کے گوشائوں کا قبضہ رہا۔
اس کے بعد اس کو ٹھری پر ناگوں نے قبضہ کر لیا۔

صاحبِ گزشتہ حالات اجودھیا نے لکھا ہے کہ اس کو ٹھری یا مندر پر قبضہ کرنے کے لئے ناگوں اور گوشائوں میں زبردست جنگ ہوئی تھی جس میں بہت سے نام لگے اور گوسائیں کام آئے تھے۔ اس جنگ میں گوشائیں کو شکست ہوئی اور نام لگے اس مندر پر قابض ہو گئے۔

اس مندر پر قبضہ کرنے کے بعد ناگوں نے رفتہ رفتہ عمارتیں جو ان شروع کیا، موی عبدلکریم، نصاریٰ مرحوم نے اپنی یادداشتوں کے سہارے لکھا ہے کہ جہاں تک انھیں یاد پڑتا ہے، پہلے اس ٹیلہ پر اتر کیڑت دو برج بنائے گئے تھے۔ اس کے کچھ دنوں کے بعد دھن جانب بھی دو برج بنائے گئے تھے۔ جب چاروں برج بن کر تیار ہو گئے تو پھر تھوڑے عرصہ کے بعد ان چاروں برجوں کو ملا کر ایک بڑا احاطہ کھینچ دیا گیا۔

زمانہ قدیم میں یہ ٹیلہ سگر پوٹیلہ، ہومان ٹیلہ، کھیر ٹیلہ اور کوہیر ٹیلہ کے نام سے مشہور تھے۔ لیکن برج اور احاطہ بن جانے کے بعد اس کا نام ہومان گڑھی پڑ گیا۔ اس زمانہ میں بھی اس ٹیلہ پر بنی ہوئی زمانہ قدیم کی اس پرانی مسجد کی بچھی دیوار باقی تھی جس کے طاق میں سنگ موسیٰ پر لفظ اللہ لکھا ہوا تھا۔ کچھ دنوں بعد نہ صرف اس طاق کے سیاہ پتھر ہی کو ناپید کر دیا گیا بلکہ مسجد کی باقی ماندہ دیوار کو اندر کر کے اس کے

ساتھ ہی ایک اور دیوار چسپاں کر کے بنا دی گئی تھی۔

مسجد مذکورہ کی متذکرہ دیوار سے پچھم کی طرف چند قدم کے فاصلہ پر عثمانی کا وہ مندر تھا جس کی زمین راجہ ہمت بہادر، انوپ گپتا اور امرت گپتا کی شفا ریش سے نوب تہا الدولہ نے گوثاٹیوں کو عطا فرمایا تھا۔ اس مسجد کی باہریاں کیلئے درجہ کے آخری تاجدار نواب واجد علی شاہ ہار شاہ کے عہد حکومت میں غلام حسین شاہ نے نشان محمدی کھڑ کیا تھا اور مرکز جہاد ہوا تھا۔

جو لوگ انسانی فطرت کے رمزناں ہیں، اس حقیقت سے نا آشنا نہیں ہیں کہ بنائوں کی ذہنی و اخلاقی اصلاح کے سلسلہ میں ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے جب قلب و روح کو خطاب کرنے سے پہلے جسم و جان کو خطاب کرنا پڑتا ہے۔

اجتماعی زندگی میں جتنے عوامل (FACTORS) انسان کے اخلاق و تمدن پر اثر دیتے ہیں، ان میں سب سے زیادہ قوی اور موثر عامل حکومت ہے۔ حکومت کا نظام اگر غلط ہو، اور اس کی بائیں ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہوں جو حاکمانہ طاقت کو اصلاح اور خدمت الناس کے بجائے افساد اور خدمت نفس کیلئے استعمال کرتے ہوں تو ایسی حالت میں کسی نیکی کا سرسبز ہونا، کسی اصلاحی کوشش کا بار آور ہونا، اور کسی قسم کے اخلاقی محاسن کا پھلنا پھوٹنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ حکومت طبعاً بدی و شرارت کی سرپرست ہوتی ہے اور نہ صرف خود بدکار ہوتی ہے بلکہ اس کی قوت تمام اخلاقی مقاصد کی تباہی کرتی ہے۔

عملی اخلاق، جمل کا مقصد تمدن کا صحیح نظام قائم کرنا ہے۔ کیسے لازم ہو جاتا ہے کہ جب اٹھالیس حکومت کی شرارت و بد باطنی اس حد سے گزر چکی ہو کہ اسے دغظ و تعلق سے راہِ راست پر لایا جاسکے اور جب اس کو دوسروں پر دست درازی کرنے سے دوسروں کے حقوق غصب کرنے سے دوسروں کی عزت و شرافت پر حملے کرنے سے اور دوسروں کی اخلاقی و روحانی اور مادی زندگی پر تاخت کرنے سے باز رکھنے کی کوئی صورت جنگ کے سوا باقی ہی نہ رہے، تو پھر ہرچے بھی خواہ انسانیت کا اولین فرض ہو جاتا ہے کہ اس کے خلاف تلوار اٹھاتے۔ انھیں ناگزیر حالات کے تحت غلام حسین شاہ اور مولوی امیر علی صاحبان نے واجد علی شاہ بادشاہ کے عہدِ حکومت میں منظم حدودِ جہاد کا علم بلند کیا۔ جس میں سیکڑوں مسلمانوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔

جو لوگ اسلام میں شہادت کے عظیم کردار سے واقف ہیں وہ اس بات کو آسانی سے سمجھتے ہیں کہ وہ جذبہ جس کے تحت انسان موت کو گلے لگانے کیلئے تیار ہو جاتا ہے، قاتل کے ارادوں سے کہیں زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔

واجد علی شاہ کے زمانہ کا پہلا محرکہ جہاد واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے عہدِ حکومت میں پہلا محرکہ جہاد غلام حسین شاہ سے ہوا تھا۔ اس کی تفصیل مولوی عبدالکریم انصاری مرحوم نے تاریخِ پارینہ مدنیۃ الاولیاء میں ان الفاظ میں تحریر کیا ہے :-

— چنانچہ اس مسجد کے واسطے غلام حسین شاہ نے واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے زمانہ میں 'نشانِ محمدی' کھڑا کیا۔ پہلے پہل

مولوی محمد صالح صاحب و حافظ لقمان صاحب سندھی کہ نہایت
 ذی استعداد اور اہل تقویٰ سے تھے مع قاضی نور الدین صاحب
 جوار جو پور و فقیر شاہ دریا بادی و عہد نقاد و طالب علم، و عاقبت مدار بخش
 و بزرگ بخش ساکنان سونا تھ و غیرہ، علاقہ اعظم گڑھ و رستم علی خاں
 و احمد علی خاں برادران عینی خاں خلف حسین علی خاں سالدار
 مشہور و کھنی ساکنان محلہ حیدر آباد، بکھتو، ۱ شوال ۱۲۷۱ ہجری
 (مطابق ۲ جولائی ۱۸۵۵ء بروز درشنبہ — مولف) مع سترہ اشخاص
 کے اودھ میں بھیجے گئے۔ چنانچہ یہ لوگ اس مسجد آری میں جس کا
 ذکر اوپر ہو چکا ہے، ٹھہرے۔ کیفیت اس حال کی حقیقت الشہدار
 میں من و من مندرج ہے۔ اس کے بعد خود غلام حسین شاہ رستم علی
 خاں صاحب موصوف کے ساتھ ان لوگوں کو مسجد میں بٹھلا کر
 درویش مذکور کے پاس لگے اور ۱۱ ذیقعدہ ۱۲۷۱ ہجری (مطابق
 ۲۶ جولائی ۱۸۵۵ء — مولف) یوم پنجشنبہ کو مسجد موصوف میں مع
 اپنے ہراسیوں کے پیچھے اور بارہویں تاریخ (۲۷ جولائی ۱۸۵۵ء)
 بروز جمعہ بہاد خاں صاحب جو اپنے صاحبزادوں کے ساتھ نصیر آباد
 میں وہاں کے مولوی صاحبان کے پاس اسی مہم کی شرکت کیلئے
 گئے تھے، واپس آگئے اور غلام حسین شاہ کے خربک ہوئے
 تقریباً بارہ طالب علم و غیرہ بستی کے علاقہ سے جمعہ کے دن مسجد
 میں داخل ہوئے۔ تیرہویں تاریخ ذیقعدہ (مطابق ۲۸ جولائی ۱۸۵۵ء)

کو پیچر کے دن جب حکام کی طرف سے بہت قتل و قتل ہو چکی تو
 دوپہر سے جنگ شروع ہو گئی۔ اور اسی درمیان بارش ہونے
 پر جنگ سونف ہو گئی۔ حکام کی طرف سے شام کو گارہ مسجد کے
 دروازہ پر پہنچا اور اس نے طرفین کو جنگ کرنے سے ممانعت
 کی اس وقت نقطہ چھ آدمیوں نے تارسم علی خاں اور شیخ اگلو
 نور بان باشندہ مقبرہ جنگ کے ساتھ انکی قوم کے دس بارہ آدمی اور
 شریک تھے، شربت شہادت چکھا جن کو بندوق کی گولی وغیرہ
 کا صدمہ پہنچا تھا۔ اس کے بعد شام کو نماز مغرب کے قریب شہر
 کے باشندے جو شریک تھے، ممانعت جنگ کا حکم پا کر اپنے
 مکان کو چلے گئے۔ صرف مسلمان اور شیخ اگلو اور حسین علی خاں
 صاحب وغیرہ جو بہار علیش کے ملازمین سے تھے مسجد کے اندر
 باقی رہے۔

یہ ایک بی راہیوں نے دیہاتیوں کی مدد سے جنگ کو تعلق داروں
 نے بھیجا تھا، یورش کر کے مسجد کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔
 اس جماعت میں سے نقطہ غلام حسین شاہ تھے جو مسجد کی دیوار
 کو دکر باہر نکل گئے۔ اس کے بعد جن لوگوں کا نام اوپر درج ہے
 انھوں نے جنگ کی اور صدمہ ہوا شخاص کو تیغ کر کے شربت
 شہادت پایا۔ علی الصباح کو توال وغیرہ اور اہل شہر حاضر ہوئے
 اور مسجد کے دروازہ پر گنغ شہدار کے مع مولوی محمد صالح کی

نفس کے مدفون کیا۔ مرت رستم علی خاں اور احمد علی خاں صاحب
کی دو قبریں احاطہ سے علمدہ بنائی گئیں۔ جلد انتہر اشخاص شہید
ہوئے۔^{۲۰۹} ان اشخاص میں شہر اودھ کے شجاعتان میں سے مرزا
افضل بیگ اور شیخ اتواری صاحب شہر اودھ کے بھی تھے جنھوں نے
معرکہ کے وقت لکھنؤ لے کر مسلمانوں کی طرف سے شرکت کی اور
شریت شہادت پائی۔^{۲۱۰}

منشی رام سہائے تنائے جو شاہی ملازمت سے وابستہ تھے، اپنی کتاب "افضل اتواری" ^{۲۱۱}
میں غلام حسین شاہ کے جہاد کی تفصیل اس طرح قلمبند کی ہے:-

غلام حسین نامی فقیہ جو ایک مدت سے مثل دیگر فقہار
بظلم عنایت۔ بہتان ہنومان گڑھی واقعہ اودھیا جی، سودھال
تھا، منحوت ہوا۔ اور فتنہ انگیزی شروع کیا۔ یہ امر ظاہر کیا کہ اس

۸-۳۔ موری فدا حسین نے "حوال و واقعات" میں یہ تعداد ایک سو پچیس ایک سو ستر

کے درمیان لکھا ہے۔ — مولف

۲۰۹۔ منشی رام سہائے تنائے اپنی کتاب "افضل اتواری" میں لکھا ہے کہ اس ہنگامہ میں

غلام حسین شاہ کے ایک سو تیس ہزار ہی قتل ہوئے تھے۔ اور موری بزم الغنی خاں نے تاریخ
اودھ جلد ہجرات میں یہ تعداد دو سو انتہر بتلایا ہے۔ — مولف

۷۱۰ صفحات ۲۵۲۲

۱۱۱۔ منشی رام سہائے تنائے منشی پورن چند ذرہ بکھنوی دا بن منشی لالہ ایشوری پرشار

سید شترگ^{۱۲} گنہور میں ایک مسجد اسلام بعد سلطان عالمگیر شاہ دہلی
تعمیر ہوئی تھی۔ ہندوؤں نے حکومت راجہ درشن سنگھ ناظم میں منہدم

شعاعی ابن منشی، دوسرے راجہ مطلع کھنوی، مالک مطلع منانی، رئیس آبائی ساکن محلہ نوبتہ کے
بڑے رز کے تھے، منجھلے بھائی منشی لارما تا پرشار نیساں، متوفی ۱۱۹۰ھ، اور چھوٹے بھائی منشی
لار دور کا پر خاد اتقی متوفی ۱۱۹۰ھ ستمبر ۱۱۹۰ھ۔ تذکرہ محاصرہ از مالک رقم صفحہ ۱۰۰، محمد
نوبتہ کے سکینہ کا بیٹھوں کے اس خانوادے میں جیسے ریاست اور علم دونوں جمع تھے،
۱۱۹۰ھ میں پیدا ہوئے اور دو شاعری کے ارتقا میں ہندو شاعر کا حصہ۔ مصنفہ گنپت سہا
شریواستو با صفحہ ۹، ۱۴۔ ۱۵ سال کی عمر میں، اٹھ سار کشن پیاری سے شادی ہوئی۔ سوہ سال
کی عمر میں، انسپکٹر سر رشتہ تعلیم اور دھ کے دفتر میں کلرک ہوئے، اسی دفتر سے "غنی دہ انگریز
بھگتی" کی جس نے اور دھ کی تاریخ کو "انگریز پسند" بنادیا۔

منشی رام سہاے تنہا ایک زور نویس شاعر، شاعر اور صحافی تھے۔ ۱۱۹۰ھ میں جبکہ ان کی عمر
صرف تینتیس سال تھی، بیانی شاعری اور شری تخلیق کر چکے تھے (اعلام افکار ص ۱۱)۔ ۱۱۹۰ھ
کے غدر کے بعد ان کے وسائل تباہی کے شکار ہو گئے تھے پوری کتبہ کا جو حصہ منشی تنہا کی کمائی پر آڑا تھا
(انتخاب کلام تنہا مصنفہ ڈاکٹر گوری سہا ۵) اسلئے اہل فہم اور اہل اقتدار کی طرف مھکنے اور وابستہ ہو نیکیا
مجبور ہو گئے تھے۔ ان کی نگاہ میں علمی روایت سے زیادہ ریاست آہاں کی اہمیت اور وقعت تھی۔

اپنے محکمہ میں ترقی کر کے ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدہ تک پہنچے تھے۔ ۱۱۹۰ھ میں
ضلع انار میں تعینات تھے، اور وہیں سے ۱۱۹۱ھ میں پنشن لیا۔ اور ۱۱۹۲ھ میں اٹھتر
سال کی عمر میں اس دایرہ فانی سے منہ موڑا۔ — مواف

کی۔ سر فواہدات ہوتا چاہیے۔ قریب دو ہزار کس مجتمع ہوئے۔ فقرا
 ہونے لگے۔ داسے حنفیہ کے ٹھاکران راجکار کو مقیم کر دیا گیا۔
 غرضیکہ سیر درہم زقعدہ ۱۱۰۰ھ باجمیت موجودہ وقتِ شلم گزہی پر
 حملہ آور ہوئے اور نوبت جنگ و جدال پہنچی۔ کچھ دیر تو بدوست
 شجاعت و شہور و فغان ملیح آباد سے مقابلہ و مجاہدہ رہا جب اب شمشیر
 کے گھاٹ اور تر کر قتل ہوئے اور ہائی ماندگان نے مسجد جنم استھان
 میں پناہ لی۔ ایک پہر کال نوبت زد و ضرب رہی۔ فریقین سے جانیں
 گئیں۔ غلام حسین فرار ہوا۔ اور ایک صدوسی تن ہمار بیان غلام حسین
 مقتول ہوئے ۲۱۳

اور دھ سے تعلق اور دھ کی شہور تاریخی کتاب "تاریخ اور دھ" میں حکیم مولوی
 محمد نجم الغنی خاں رام پوریؒ نے غلام حسین شاہ کے معرکہ جہاد کو ان الفاظ میں
 ۲۱۳۔۔۔ افضل و تاریخ مد طبع ترائی۔ لکھنؤ باسن اشاعت ۱۸۷۹ء

۲۱۴۔۔۔ نام نجم الغنی خاں۔ تاریخی نام محمد نجم الغنیؒ ہے۔ ۱۰ ربیع الاول ۱۲۷۶ ہجری (مطابق
 ۸ اکتوبر ۱۸۵۹ء بروز جمعہ) مولف کو شہر رام پور دیوبند کے محلہ مدرسہ کہنے میں پیدا ہوئے
 والد کا نام مولوی عبدالغنی تھا۔ سلسلہ نسب حاجی محمد سعید خاں محدث شاہ سے ملتا ہے۔ جو حضرت
 شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کے شاگرد تھے۔

۱۸۸۹ء میں مدرسہ عالیہ رام پور کے درجہ اعلیٰ کے امتحان کا مایاب ہوئے۔ حکیم محمد عظیم
 خاں سے طب کا علم حاصل کیا۔ ۱۹۲۳ء تک مختلف جگہوں پر لازم رہے۔ آخری عمر میں عیسائی
 اکتوبر ۱۹۳۱ء کو رمضان المبارک کے ہفتہ کے عید پر فاسد ہوئے۔ اور چند ماہ بعد یکم جولائی

اگلے زمانہ میں اجودھیا کی بلندی پر جس کا نام ہنود نے ہونا لگوا رکھا ہے۔ ایک مسجد شاہانِ ماضیہ کی بنائی ہوئی تھی۔ ایک مسلمان فقیر اسکی جاہ و بکشی کرتا تھا۔ اور اس مسجد کے پہلو میں ایک چوترا تھا۔ اس پر عشرہ محرم میں تعزیہ رکھتا تھا۔ بعد ایک مدت ایک ہندو فقیر بھی اہلی کے درخت کے نیچے جھنڈی گاڑ کر رہا۔ ایک چھوٹی سی کوٹھری بنائی اس میں بت رکھ کر ہنوتان کا مقام قرار دیا۔ برہان الملک کے عہد میں بعض ہندوؤں نے مسجد کو جو اس بلندی پر اسکو گرا دیا فوج سرکار سپہی، ان کو سزا دیکر، تہخانے کو توڑ کر، بدستور مسجد بنادی ایک عرصہ گزرنے کے بعد بیراگیوں نے پھر تہخانہ بنایا۔ مسجد کے کچھ

۱۹۲۳ء مطابق ۲۵ صفر ۱۳۵۱ ہجری قمری بروز جمعرات انتقال کیا۔ موصوف

نوٹ:- مولوی غم الغنی صاحب کے انتقال کے بعد ناظم کتب خانہ کی حیثیت سے امتیاز علی عرشی مرحوم کا تقرر ہوا تھا۔

۲۱۵۔ تاریخ اور جلد چہارم صفحات ۹۰ لغاتہ ۹۸ مرتبہ مولانا حکیم محمد غم الغنی صاحب امپوری سال طباعت اپریل ۱۹۱۳ء مطبوعہ مای مطبع مطبع العلوم برلن آلمانیہ ایس۔ ایس۔ علی پور پرائیمر نے چھاپا اور شائع کیا

معرض مذکور ہے۔ جب علاقہ پچم رائٹ وغیرہ کی حکومت راجہ روشن سنگھ
 کے حوالہ ہوئی، اور اس علاقہ کے بندوڑوں کی قوت زیادہ ہو گئی۔ اور
 مسجد کو گرا کر مکان گردھی میں ملا دیا۔ اور مسجد واقع رام گھاٹ دریا
 کو خراب کر کے اور اسکی صحن میں اپنے مسکن بنائے۔ اور مسجد کے اندر
 کوڑا ڈالے مسلمانوں کی سیکڑوں قبریں توڑ کر انیٹوں اور پتھروں
 سے بڑی شان و شوکت کے بتخانے بنائے۔ یہاں تک کہ مسجدیں
 پست اور بتخانے بلند ہو گئے۔ غلام حسین شاہ حرات حیت اسلامی
 سے کئی شخص ہمراہ لیکر بنوان گردھی میں مسجد بنانے کیلئے روانہ
 تک پہنچا مرزا علی علی منعم پچم رائٹ سربراہ ہوا۔ وہیں سے اسے
 پھیر دیا اور اس کے دو چار ہمراہیوں کو جو فیض آباد سے پہنچے تھے
 نائب کوتوال اور کپتان انگرنڈر آرٹھرک رنے باہر نکال دیا جب یہ
 ماجرا پرچہ اخبار کے ذریعہ بادشاہ کے حضور میں پہنچا، انعام علیاں
 ناظم اور مرزا منعم بیگ کوتوال کے نام مسجد کی تحقیقات کا حکم ہوا
 پھر غلام حسین شاہ لکھنؤ سے کچھ لوگ اپنے ساتھ لیکر وہاں
 پہنچا اور جامع مسجد میں جو سبتا کی رسولی میں ہے، مقیم ہوا۔ اور
 کسی کے کہنے سے وہاں سے نہ نکلا اور اس کے پاس جماعت
 کرم تھی اور کچھ سامان بھی نہ تھا۔ مگر کمرہ بیت ہیراگیوں کے ہاتھ
 سے نکالنے کی باندھی۔ کپتان آر صاحب اور مرزا منعم بیگ
 کوتوال اور مرزا علی علی نے مسلمانوں کو اسکی شرکت سے روکا

پیرگیوں کی مدد کو راجہ ان سنگھ اور گرد و پیش کے زمیندار جوق در
جوق پہنچ گئے یہاں تک کہ وہی بارہ ہزار بندوخت ہو گئے اور دریا
کا گھاٹ بند کر دیا۔

غلام حسین کے پاس سوائے چند غریبوں کے اور کوئی نہ تھا۔ جو
کے دن ۱۲ ذیقعدہ ۱۲۰۰ ہجری (مطابق ۱۰ جون ۱۸۵۵ء) — مولف
کو تقریباً دو سو مسلمان نماز کے واسطے مسجد میں جمع ہوئے۔ پیرگی
ان کا مجمع سکر جوہ کر کے اور کئے سر پر پہنچے۔ غلام حسین کے ہمراہیوں
نے نکلنے کا اہتمام کیا۔ کوتوال کے سپاہی اور آرمی کے سوار
جو رفع شر پر متعین تھے درمیان میں آئے اور فساد کرنے سے روکا
آرمی صاحب بھی جوہ کی خبر سکر دیاں پہنچے۔ رفع شر کر دیا۔ لیکن اس
جنگار کی وجہ سے مسلمان جوہ کی نماز نہ ادا کر سکے۔ دوسرے دن شنبہ
کو جہان پوری صاحب کپتان آرمی صاحب کی شرکت کے واسطے
لکھنؤ سے پہنچے۔ اور جہاد کو آکر دیکھا۔ اس میں دروازہ تھا۔ با
یہاں کا دروازہ لگانا مناسب ہے جس سے حفاظت ہو جائے
اور غلام حسین کے ہمراہیوں میں سے ایک شخص کو سمجھانے کیلئے
بلا دیا۔ اس عرصے میں غلام حسین کے ساتھیوں میں سے دو تہیں
آدی ولد بیگم پورہ میں ماکر کوڑا کی جوڑی اور ٹھانائے رہ رہیں جو ماکر
کے ہنود نے ان کو گولیوں سے زخمی کر دیا۔ مسلمانوں نے کوڑا
چھوڑ کر بندوں پر حملہ کر کے پسا کر دیا۔ اس عرصہ میں مینہ برسنے لگا

ایک گھڑی تک ہنگامہ فساد موتوں رہا۔ اس وقت ایک کثیر یا غلام حسین کے ہراسیوں کے لئے جو درودن سے بھوکے تھے، کھانا لایا۔ کپتان آرمہ صاحب اور جان ہری نے اپنے سپاہیوں کو مسلمانوں کے پاس بھیج کر کہلایا کہ کریں کھول کر بہت اطمینان سے جامع مسجد میں بیٹھو۔ باہر نہ نکلو۔ کوئی تم سے فساد نہ کر سکے گا۔ وہ کریں کھول کر کھانا کھانے لگے۔ اب مرزا علی علی اور دونوں انگریز اور مرزا ثار حسین مع اپنی سپاہ اور توپ کے وہاں سے بٹ کر دور ایک کھرنی کے تلے کھڑے ہوئے۔ ایک گھڑی نہ گزری تھی کہ ہزاروں بیراگی نعرہ مارتے ہوئے آئے اور مسجد کو گھیر لیا حب علیؑ فقیر کے کوٹھے سے چڑھ کر غلام حسین کے ہراسیوں پر گویا نساں شروع کر دیں۔ اور مسجد میں آکر دو سو انتہر، آدمیوں کو ذبح کیا۔ اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اور مسجد میں ہو بہنے لگا۔ اکثر مسلمانوں کے گلوں میں قرآن شریف، حائل تھے۔ انکو پسے پسے کر کے پاؤں سے روندنا اور جلایا۔ اور جو جنگہ سرکاری حکم سے جامع مسجد کے چبوترے پر تیار ہوا تھا توڑ ڈالا۔ اور مسجد کی دیوار کو جزائروں سے چھلنی کر دیا ۲۱۶۔ مقتولین کی لاشیں بے گور و کفن پڑی رہ گئیں۔

۲۱۶۔ جزائر و لاتی ہندو کو کہتے تھے کیونکہ وہ جزائر انگلستان سے آتی تھیں۔ تفصیل کے لئے

دیکھئے "سفر نامہ آئندہ نام فلعی" مطبوعہ ہندوستانی پریس۔ رامپور دیو۔ پلا

دو سو سے دن مرزا شاہ حسین نے در مسجد پر ایک بڑا غار کھدوا کر
گل در گل دفن کرا دیا۔ دفن کے بعد بیراگی مسجد میں جوتیاں پہنے
آئے جو ہم آہوں — مولف، کیا سنگھ بجایا۔ بہت بے ادبیاں
کیں۔ اوس کے قریب شہداء سید سالار میں سے خواجہ بیٹھے
کی قبر تھی، اوس سے توڑ ڈالا۔ بیراگیوں کی جمعیت زیادہ نہ تھی
لیکن راجہ مان سنگھ اور پانڈے راجہ کشن دت رام کے سیکڑوں
ہندو نوکر اور گرد و پیش کے ہندو زمیندار مدد کو پہنچے تھے۔ اس
لئے دس۔ بارہ ہزار کی کثرت ہو گئی تھی۔ یہاں تک نوبت پہنچی
کہ بیگم پورہ کے رہنے والوں پر جو غلام حسین کے دشمن دار
تھے۔ بیراگیوں اور گوبار کے لوگوں نے جا کر حملہ کیا۔ ان
بیچاروں نے جس طرح ہوسکا حفظ ناموس کیا۔ آخر کار مجبور
ہو کر گھروں میں اسباب چھوڑ کر فیض آباد چلے گئے۔

مرزا رجب علی بیگ سرور^{۲۱۷} جو شاہانِ اودھ کے پرانے نمک خوار اور لازم

۲۱۷۔ رجب علی نام۔ سرور تخلص۔ مرزا اصغر بیگ کے بڑے تھے۔ غالباً ۱۲۰۲ ہجری (مطابق
۱۷۸۷ء) میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۲۳ء مطابق ۱۲۴۰ ہجری میں ترک وطن کر کے کانپور چلے گئے
نمبر آدنی حیدر بادشاہ اودھ کے عہد حکومت میں لکھنؤ واپس آئے۔ محمد علی شاہ بادشاہ اودھ
کے زمانہ میں دربار میں ملازمت ملی۔ جان عالم واجد علی شاہ بادشاہ کی معزولی کے بعد بہار
بنارس کی دعوت پر بنارس گئے اور بعد ازاں ۱۸۵۰ء پھر بنارس سے لکھنؤ چلے آئے۔

تھے انھوں نے غلام حسین شاہ کے جہاز کا واقعہ اپنے مخصوص انداز نگارش میں اس طرح تحریر فرمایا ہے:

اور یہ کہ وہ سیتا کی رسولی مرقد ہے۔ وہاں عہد دوست
 بابر بادشاہ میں مسجد رفیع شان ہمسر آسمان بنائی۔ یا بری تھی۔ اس زمانہ
 میں ہنود کو کہاں مجال ہسری تھی۔ سن نو سو تیس میں بادشاہ سید
 میر عاشقان بنی تھی۔ اس کی تاریخ 'بودخیر باقی' تھی۔ اور راجہ راجا
 میں مسجد ذاتی خاں صوبہ دار نے بنائی تھی۔ اسلام کی بنیاد جمائی
 تھی۔ اور اس سے متصل ایک ٹیلہ تھا۔ راجہ رام چند نے وہ مقام
 بنان (ہنومان) — مولف نے اپنے رفیق کو بصلہ فتح لکھا دیا تھا
 اب اس کا نام "ہنومان گڑھی" ہے۔ وہاں اورنگ زیب عالمگیر
 بادشاہ نے ایک مسجد تعمیر کی تھی۔ جب نواب شجاع الدولہ بہادر
 بکسر کو گئے اور وٹائی میں شکست ہوئی۔ انتظام ملک میں فتنہ
 پڑے تو چند فقیر آیت وہاں آ رہے۔ چوترا بنایا۔ پھر ڈال کے

کچھ دنوں بعد بشوری پر شاد نرائن سنگھ مہاراجہ بنارس نے پھر نکویا کیا اور ۱۸۵۹ء جون ۸ء
 کو بنارس گئے۔ آخر عمر میں انھوں نے بالکل معذور ہو گئے تھے۔ ۱۸۶۹ء مطابق ۱۳۸۶ء بنارس
 میں انتقال ہوا۔ وہ مہاراجہ بنارس کے راجہ بنائے گئے۔ مولف نے مسعود صفوۃ فیضانہ وقت صفوۃ
 ۲۱۸ء جات مسجد باندھا ۱۸۵۹ء میں میر باقی کی زیر نگرانی تعمیر ہوئی یا کہ جس جیسے کہ قلعہ تلہ
 کے قلعہ بودخیر باقی سے ظاہر ہے۔ غالباً یہ ثابت کی غلطی ہے۔ شاید ۱۸۳۳ء کے بجائے ۱۸۲۲ء کے رہا گیا ہو۔

ہنومان کی صورت رکھ کے پوجتے گئے۔ یہ چند ہیراگیوں نے
 وہاں دخل کیا اڑتیتوں کو نکال دیا۔ اس کی کیفیت تاریخ کتب میں
 کہی ہے۔ اور صحیفہ بیادہ شاری میں تو مفصل بقید سن و تاریخ تحریر
 ہوئی ہے۔ جس کا دل چاہے دیکھ لے۔ جب عدوہ پھر راتھ کا ناظم
 درشن سنگھ برہن ہوا۔ اس ٹیلہ پر احاطہ بنا کے "ہنومان گروہی" نام
 رکھا۔ وزراء سلطنت کی غفلت سے انتظام بگڑا۔ کارہ پڑا۔ ان
 جات سے ہر طرح کا فتنہ پیدا ہوا۔ بدواہکاروں کی امانت سے
 ہیراگیوں نے ہنومان گروہی کی مسجد کانتانیشا کے بنخانے بنایا
 پھر باری مسجد میں جہاں سیتا کی رتوں تھیں۔ نہرکت کی۔ عدلیہ
 پوجا ہونے لگی۔ منتظم چاندی کے جوئے کھا کے سرنگوں ہوتے
 کسی نے خبر لی۔ پہلے تو شیخ علی خری کا قول سرفٹ ہوا تھا:

میں کرامت تیرا، مراے شیخ

کہ چوں خراب شود منا، خدا گرد

پھر انقلاب فلک سے ایسا زمانہ ہوا کہ مسجد توار کے بنخانہ ہوا۔
 یہاں غفلت کا پردہ ایسا آنکھوں پر پڑا کہ کسی کو نہ سوجھا۔ انرض
 بارہ سو اکتہتر ہجری عہد دولت و احد علی شاہ میں شاہ غلام حسین نام
 نیر نے نواب کو عرضی دی۔ توہین اسلام کی اطلاع کی۔ یہاں کسی
 نے نہ سنا۔ آخر شاہ صاحب نے فیض آباد کا عزم کیا۔ وہاں منعم
 بیگ کو تو ال واصل علی چلک دار کو قصہ سنایا، مگر انکو مخالف پایا۔

اس اثنار میں چند مسلمان شاہ صاحب کے شریک ہوئے اور اودھ
 میں پہنچے۔ مان سنگھ اور اطراف کے ہندو انہوہ کثیرے کے بیروں
 کی حمایت کو موجود ہوئے۔ گو سلطنت اسلامی تھی، مگر مسلمانوں
 کی کسی نے نہ سنی۔ نہ مدد دی۔ نہ اعانت کی۔ عامل کے باعث
 سب رستے محدود ہوئے۔ نہ وزیر نے اس صدارت پر کان لگایا
 نہ بادشاہ کو انجام کا دھیان آیا۔ آخر ماہ ذیقعدہ ۱۲۷۱ ہجری جمادی
 (مطابق ۲ جولائی ۱۸۵۵ء) — مولف کو اتل خاں کے احاطہ
 واسے مسلمان شاہ غلام حسین کے شریک ہوئے۔ اس طرف دس
 بارہ ہزار بیرونیوں کے مددگار با ساز و مہتیار جمع ہو گئے۔ علی علی
 نے مسلمانوں سے کہا۔ یہاں فوج سلطانی کم ہے۔ تم لوگ تھوڑے
 ہو۔ ہندوؤں کا مجمع بہت ہے۔ ایسا نہ ہو بھگوت سے بنو۔ شام تک
 اگر صاحب کی بیٹن آتی ہے۔ اس طرف بھی کثرت ہو جاتی ہے۔ اس
 وقت مال کرو۔ صبح ہونے دو۔ دوسرے روز جب یہ لوگ جمع ہوئے
 تو پھر ثیا حید پیش کیا کہ آ صاحب کو بادشاہ کے حکم کا انتظار ہے تھوڑا
 توقف درکار ہے۔ ان کو تو باتوں میں الجھا رکھا۔ ہندوؤں نے اودھ
 میں مسلمانوں کا محلہ گھیر لیا لیکن دلاوروں نے منہ نہ پھیرا۔ تھوڑے چلنے لگی
 تھوڑا تھوڑے لگی یہاں تو یہ ہنگامہ تھا۔ اس دار و گیر میں کئی ہزار ہندو
 مسجد پر جھکا۔ وہاں شاہ غلام حسین اور ان کے ساتھی مال سے
 بیخبر کھانا پکانے میں مشغول تھے۔ جب یہ لوگ سر پر پہنچے تو وہ

لوگ بھی آمادہ کارزار ہوئے۔ رستم علیاں کہ بے شک ستم دور
 تھا۔ اور اس کا بھائی احمد علی خاں کہ وہ بھی جرأت یکتائے زمان تھا
 نکل کے بڑی بہادری و استقلال سے رہے۔ باوجود کثرتِ مشرکوں
 کے قدم اوکھڑ گئے۔ بھاگ کے رنگ محل میں پناہ گزین ہوئے
 جب مسلمان وہاں پہنچے تو وہ نامرد وہاں سے بھی بھاگ نکلے۔
 بہادروں نے ان کا تعاقب کیا بہتوں کو جہنم میں بے نیادیا۔ آخر بھگوت
 مکانوں کی چھتوں پر چڑ کے بندوقین سر کرنے لگے۔ مسلمان جو
 کھلے میدان میں تھے مرنے لگے۔ کچھ تو جان سے گئے باقی سجد
 میں پہنچے۔ مگر چار شخص مثل غلام کے آگے چڑھے۔ چاروں
 طرف سے گولی برتی تھی اس پر ان کے ہاتھ سے نقش پر نقش
 گرنی تھی۔ ان میں گولی کھا کے تین آدمیوں نے کھڑ شہادت
 پڑھ کے بہشت بری کی راہ لی۔ رستم علیاں نے ہنومان گڑھی کے
 زینہ پر چڑھ کے اذان کہی۔ روح نے فرود میں بری کا راستہ لیا
 بیرائیوں نے مسجد کا محاصرہ کیا اور دیوار توڑ کے ایک کم شتر
 آدمیوں کو شہید کر دیا۔ اسیں کچھ رٹ کے صغیر اور جوان پیر
 تھے جو مثل گوسفند ذبح کئے گئے۔ اور اٹھارہ کلام اللہ نازیوں
 کے لے کے کچھ جلاتے اور کچھ پارہ پارہ کر کے ہوا میں ڈالتے
 عامل و کوتوال بد اعمال نے آنکھوں سے دیکھا۔ شہیدوں کا اسباب
 لٹا۔ کافروں نے نعشوں کو پامال کیا۔ شاہ غلام حسین اور ایک درزی

اس گروہ سے زندہ بچے۔ خدا جانے کس طرح ہندوؤں کے
غول سے نکل گئے۔ ہندوؤں نے اپنے کشتے جلاتے کچھ
دریا میں بہاتے۔ مسلمانوں کو دفن کرنے کوئی صاحب نہ آئے
آٹھ پہر بعد کو تو ال بد اعمال نے مسجد کے قریب گڑھا کھدوا
کے گنج شہیداں کیا۔ ان بے مروت سامانوں کا یہ حال کیا۔
اور اپنی روسایا ہی مٹانے کو اخبار نویس سے پرچہ لکھوایا کہ
ہندو بے تصور تھے۔ مسلمان گڑھی موٹنے کو گئے۔ انھیں
کے فتور تھے۔ اب لکھو کا حال سنئے اور کافروں
کا سردہئے :

ہر چند بادشاہ کے مزاج میں عیش و عشرت لعب و غفلت
کا سامان سب تھا۔ اس پر خبر سن کے دیانت الدولہ کو پیراگیوں
کے قلع قمع کا حکم دیا۔ دیوان صاحب نے نواب کو سمجھایا کہ
کل علاقہ ہندوؤں کا ہے۔ اگر بوہ ہو جاتے گا۔ کچھ بن آئے گا۔
اور بعض کہتے ہیں کہ کچھ چاٹ دی اس جانب سے طبیعت
اچاٹ دی۔ دیانت الدولہ کا جانا موقوف ہوا۔ نواب نے مرزا
آغا علیخان ناظم کو اس کام پر مامور کیا۔ انھوں نے فیض آباد پہنچ کے
تحقیقات شروع کی یعنی ہنومان گڑھی میں مسجد تھی یا نہ تھی۔ حق
عجیب چیز ہے۔ بہر کیف تحریر و تقریر سے مسجد کا وہاں ہونا ثابت
ہوا۔ بعض مخالفوں نے بھی اقرار کیا۔ موری صاحب داروغہ

عدالت فیض آباد اور سید علی پیش نماز نجف آباد نے درن کلام کے چلے وزیر
کے پاس بھیجے اس نے چھپا رکھے۔ دوسری بار مجتہد اعظم کی خدمت
میں روانہ کئے۔ نہیں معلوم وہ کیا ہوئے!۱۹

صورت آئینہ سب کچھ دیکھ، اور خاموش رہ
شورشیں اروزہ میں محو سرور و دوشس رہ۔

واجد علی شاہ کے زمانہ کا دوسرا مرکز جہاد غلام حسین شاہ کے مرکز جہاد
کے تقریباً سوا دو بیسے بعد

مولوی سید امیر علی صاحب نے دوبارہ علم جہاد بند کیا۔ ہزاروں مسلمان شوق شہادت
میں سرشار ہو کر شریک مجاہدین ہوئے۔ لیکن علامات وقت کی تقدیر اب اور مسند
شخصیتوں کی منافقانہ نظرت کی شیطنت اور ارکان سلطنت کی خود غرضی و نفس پرستی
نے عذاب آخرت سے بے پرواہ ہو کر صرف چند بد مذہب پیش دنیا کی خاطر جان عالم حضرت
واجد علی شاہ بادشاہ اودھ پر حضرت حقانی اور وجہ جہاد و منشا مجاہدین پر مشیدہ رکھا
بلکہ مولوی سید امیر علی صاحب کے خلاف ہر وقت بھر کاتے رہتے اور بدظن کرتے
رہتے تھے۔

مولوی سید امیر علی صاحب کے اعلان جہاد کے اسباب و علل کی تفصیلات
مولانا حکیم مولوی محمد نجم الغنی فائز صاحب رام پوری نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف
"تاریخ اودھ" جلد چہارم صفحات ۹۰ لغایت ۹۸ پر زیر سرخی "ابو دھیا میں ہونا گڑھی

۲۱۹۔ نساہرت، مصنف مرزا حب علی بیگ مروری مرتبہ ذکی کا کوروی صفحات ۱۲۱ لغایت
مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ، بی اشاعت، ۱۹۶۱ء ناشر مرکز ادب اودھ، ۱۳۰۰ء شاہ باغ لکھنؤ۔

کی مسجد کے جھگڑے میں کئی سو مسلمانوں کا ہیراگیوں کے ہاتھ سے مقتول ہونا۔
 آخر کار اس جماعت کا لکھنؤ کی فوج کے ہاتھ سے مارا جانا۔ اس معاملہ میں علی نقی خاں
 اور دوسرے حکام ہندوؤں سے رشوت لیکر آخر تک ان کے طرفدار رہے۔ ان الفاظ
 میں بیان کیا ہے:

ہیراگیوں کو اس قدر قوت ہو گئی کہ کسی مسلمان کو ہنومان گڑھی
 سے گزرنے نہیں دیتے تھے۔ جب ہنومان گڑھی کے ہندوؤں
 کا فساد بہت بڑھ گیا اور مسلمانوں کو یہ ثابت ہو گیا کہ انکی رعایت
 بطح زہر ارکان سلطنت کرتے ہیں تو بندگی میاں کے پوتے موہی
 سید مسیح علی ساکن امیٹھی نے جوش حرارت اسلام کی وجہ سے
 چاہا کہ توہین اسلام کا دفعہ کریں۔ پہلے سندھ میں اہل اسلام نے
 مولویوں کی تحریک سے اجماع کر کے جہاد پر کمر باندھ دیا۔ بعض
 آدمیوں نے منع کیا کہ یہ بات اچھی نہیں۔ حاکم وقت اور انگریزوں
 سے آخر کو مقابلہ پیدا ہو جائے گا۔ پھر کچھ بن نہ پڑیگی۔ اور توہین
 اسلام سب کے واسطے ہو جائیگی۔ غرض ایک نے مانا۔ مولوی
 صاحب کے سر پر اہل آگئی تھی۔ جب علی نقی خاں کو اس بات
 کی خبر ہوئی تو بادشاہ سے عرض کیا کہ قد دی بہت چاہتا ہے کہ
 یہ فساد کسی طرح بند ہو جائے۔ مگر خانہ زار سلطنت یعنی خواجہ سرا

غفلت میں بانی مہمانی اس فساد کے ہوتے ہیں۔ میر حیدر جو بشیر الدولہ
کا منشی اور متوسل ہے اس کا ایک عزیز مولوی امیر علی چاہتا ہے
کہ اس اتش فتنہ کو خوب بھسور کاٹے۔ اور غفلت میں میری بنیادی
وزار سائی ظاہر ہو۔ بشیر الدولہ جب اس سے واقف ہوتے تو انھوں نے
اپنے سر سے ازام اوتارنے کیلئے منشی کے ذریعہ مولوی صاحب
کو ہوا بھیجا۔ اور انجدر علی شاہ کے امار باڑہ میں اوتار رہا۔ جب تک
رہے، ضیافت کی۔ اور اپنے ساتھ اعلیٰ نقی خاں کے پاس
سے گئے۔ وزیر اعظم نے سب طرح سے مولوی امیر علی کو سمجھایا
اور چاہا کہ خلعت دیکر رخصت دیں۔ لیکن مولوی صاحب نے
خلعت نہ لیا۔ اور جہاد سے ہاتھ نہ اٹھایا۔ بلکہ بہت بے لطف
گفتگو کی۔ جس سے وزیر کے دل کو ملال ہوا۔ وزیر نے
آل اندیشی کی راہ سے اونکو قید کر لینا چاہتا کہ فساد کو طول نہ ہو
میر حیدر نے بشیر الدولہ سے کہا کہ یہ صورت ہوئی تو پہلے میں
اپنا گلا کاٹ کر مر جاؤں گا۔ آخرش اسی شب کو مولوی صاحب
کو ان کے مکان پر چنپا دیا۔ اور ساتھ سلامتی کے وہ نکل گئے۔

مولوی صاحب نے جو کی ناز پڑھی۔ تقریباً ایک سو ستر
آدی مجاہدین سے لیکر روانہ ہوئے۔ راہ میں ایک فقیر آزاد
نے مولوی صاحب سے کہا کہ ہرگز نہ جا آ جائے مولوی صاحب
غیبی سے کچھ متنبہ نہ ہوئے۔ جب سلطنت میں یہ خبر پہنچی تو علی نقی خاں

نے میرے صدر علی کارندہ اہتمام الدولہ حیدر حسن خاں اور تہوڑ علی
 خاں کو فوج اور توپ خانہ دے کر انتظام کیلئے روانہ کیا۔
 انھوں نے پہنچ کر پہلے مجاہدین کو بنری سمجھایا۔ اوسکے بعد
 سختی سے کہا۔ شیخ علی حسین اور تہوڑ علی خاں موکرہ کے افتتاح
 تک سوال و جواب کیلئے رہے۔ اور کوئی دقیقہ فہمائش کا باقی
 نہ چھوڑا۔ آخر کار عشرہ محرم قریب آجانے کی وجہ سے یہ عہد و
 میثاق قرار پایا کہ ایک مہینہ کی میعاد میں اگر گڑھی میں مسجد نہ بن
 جائے تو پھر مجاہدین کو اختیار ہے۔ تہوڑ علی خاں نے اپنے
 جوش ایمانی سے ازراہ سپہ گری یہ کہا کہ اوس وقت مہم بھی
 آپ کے شریک جہاد ہونگے۔ ۲۳ ذیقعد ۱۲۵۱ھ سے ۲۴ محرم
 ۱۲۵۲ھ (مطابق ۸ اگست ۱۸۵۵ء لغاتہ، ستمبر ۱۸۵۵ء)۔
 مولف ایک وعدہ موکرہ ہوا۔ مولوی صاحب اس مدت معینہ
 تک سہالی، علاقہ نواب علی خاں میں رہے۔ اور ہر روز سو من
 جنس غلہ اور تھوڑا خرچ ضرور ملتا رہا۔ اس عرصہ میں جب یہ خبر
 دور دور کے شہروں میں پہنچی تو جہاد کا نام سن کر سیکڑوں مسلمان
 شریک مجاہدین ہوئے۔ تقریباً دو ہزار کی جمیعت ہو گئی۔ رامپور
 اور پٹی بھیت کے پٹھان پہلے جمع ہوئے۔ اور کئی سو پٹھان
 ولایتی قندھاری کو ہی درشتی لباس سپاہ سے آئے۔ علیحدہ
 سب سے اترے۔ چند روز میں رنگ بیزنگ دیکھ کر اونٹ

پھر گئے بعد اوسکے یہ حال رہا کہ مجاہدین لشکر سے ایکٹ دن
 پچاس گئے دوسرے دن پچاس اور آگئے۔ اس مدت میں
 یہ غلغلہ سارے ہندوستان میں پھیل گیا۔ مسلمان موافق عقیدہ
 خاص کے اپنی جگہ مستعد و آمادہ ہوا۔ اور بعض رئیس انگریز کے
 خوف سے بدل قمنی اور بظاہر مسترد و ظائف ہو کر ساکت و
 خاموش رہ گئے۔

ایک دن جنرل اوٹرم صاحب بادشاہ کے پاس آئے اور
 بیان کیا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان
 فساد عظیم برپا ہوا چاہتا ہے۔ مبارکشت و خون کی نوبت پہنچے
 ہزاروں آدمیوں کا ناتی خون ہو جائے۔ ارکان سلطنت پر اس
 کا تدارک اور انتظام واجب ہے۔ مولوی امیر علی ہانی مہانی
 ایسے شر و فساد کا ہوا ہے۔ اسے قرار واقعی سزا دینا چاہیے۔
 اسے لکھنؤ سے کیوں جانے دیا۔ قید کر لینا مناسب تھا۔
 علی نقی خاں نے کہا۔ میں نے امانت مہنت کو بلوایا ہے۔
 ریزٹنٹ نے کہا کہ شاید وہ بے ضمانت یہاں نہ آئیں۔ بادشاہ
 بوسے کر اپنے یہ کیا کہا۔ کیا وہ ہماری رعیت نہیں ہیں۔ پھر
 کیا سبب حاضر نہ ہونے کا۔ ریزٹنٹ اس کا جواب بنسری
 دیکر رخصت ہوئے۔ بادشاہی حکم کے بموجب جنومان گڑھی کو
 بعض مہنت رہمان سنگھ اور کپتان ہارو کی ضمانت سے

در دولت پر حاضر ہوئے۔ وزیر نے انہیں اپنا مہمان کیا۔ آخر
 کوہ اندیشوں نے بطمع دینا اپنا کام کیا۔ اور انہیں سلامت
 ریاست سے رخصت کر دیا۔ اور بظاہر اپنے بچاؤ کی باتیں لٹائل
 ذہنی تراشیں۔ اور بادشاہ سے باتفاق ہمزبان ہو کر عرض کیا۔
 اور ریزٹنٹ کے پاس پرچہ پیام مشرور عا پینچا کہ ہنومان گڑھی
 میں مسجد کا ہونا کسی طرح ثابت نہیں ہوتا۔ بعد مدارج تفہیم ہر
 فریق کو عدولی حکمی کی مزادی جائے۔ ریزٹنٹ نے اس
 مضمون کی رپورٹ گورنر جنرل کو کر دی۔ اور پرچہ پیام کا یہ
 جواب بھیجا کہ ابایان سلطنت نے اس بات میں حق و انصاف
 ادا کیا۔ اور مذہب و ملت کی رعایت نہ کی۔ حاکم وقت کو ایسا ہی
 عدل و انصاف چاہیے۔ اس مدت حکومت میں کبھی ایسا امر
 واجب اور مناسب حال، جیسا چاہیے، سرزد نہیں ہوا۔ اس پرچہ پیا
 نے خاتمہ کر دیا۔ غافلوں نے چاہا کہ کسی جعل و فریب سے یہ امر
 لیت و عل میں رہ جائے۔ مگر چارہ علاج خود بند کر دیا تھا۔
 اب مووی صاحب کے دعویٰ کی مدت بھی تمام ہوئی۔ ہنومان گڑھی
 میں مسجد کا ہونا تحقیقات اور اکثر مقامات کے مشاہدے سے
 ثابت ہو چکا تھا۔ اس عہد کے منقضی ہونے کے بعد مووی
 صاحب ایوس ہوئے۔ چارونا چار مستعد مرگ ہو کر وہاں سے
 بالی کو کوچ کر گئے۔ اور پھر وہاں سے دریا آباد گئے اور عید گاہ

کے باغ میں مقام کیا۔ علی نقی خاں کے حکم سے توپ خانہ اور جنگوں
 کی پیش اور رنجیب کپتان بارہو صاحب و حاجی مرزا حسین علی کبدان
 گلاباٹن کی ماتحتی میں روانہ ہوئے۔ اس فوج میں کثرت سے
 مسلمان تھے۔ ریزیدنٹ نے صاف کہہ دیا کہ مولوی صاحب کے فساد
 کو روکا تو سلطنت کی خیر نہیں۔ اور عرفیوں نے اپنے بپاؤ
 کیلئے بادشاہ سے مولوی صاحب کی نسبت بہت سی خدات
 باتیں بنانا کر بیان کیں۔ علی نقی خاں وزیر بھی غائف تھے۔ اور ہندو
 اور اوسکے طرفداروں سے متفق تھے۔ اور اپنی جیب طمع بھر چکے
 پھر کیونکر صاف صاف خدا سے ڈر کر عرض کرتے۔ غرض پندرہ
 دن تک مولوی صاحب دریا آباد میں رہے۔ اس عرصے میں وہ
 مولوی صاحبان جو سنڈیے میں محکم جہاد ہوتے تھے وزیر
 سے متفق ہو کر اوسکے حکم سے مجاہدین کے لشکر میں فہائش کیلئے
 آئے اور چاہا کہ اوسکو اس ارادے سے روکیں اور عید گاہ
 کی مسجد میں بیٹھ کر گول گول باتیں خون حاکم وقت خون جان و برو
 سے بطور وعظ بیان کیں۔ جاہل یہ سکے سب سے پہلے بگڑے
 کہ وہ مولویو، تم سب اہل دنیا ہو۔ کل تم نے ہم کو آمادہ جہاد
 کیا تھا۔ اب حاکم وقت کے سمجھانے سے ہم کو مرتد کرتے ہو
 اب ہمیں فریب نہ دو۔ یہ نصیحت مال دنیا جاہلوں کے ہاتھ سے
 جاتی رہے گی۔ یہ سکر عوام سے ڈر کر چپکے ٹٹ گئے یہ پیشہ

کہ عصر کے وقت مولوی صاحب کے جتنے میں کوچ کا نقارہ ہوا
 سب نے کمر باندھی۔ تبھیارنگات۔ فوج بھی اُڑھتیا رہی۔
 لیکن کسی کی جرات سامنے آنے کی نہ پڑی۔ یہاں تک کہ دریائے
 کا حصار بند کر دیا گیا۔ مولوی صاحب نے اپنے مجاہدین کے رعب
 سے پھانک کھول دیا۔ وہاں سے قصبہ کے کنارے پر ڈاک بنکر
 کے مقابل مولوی صاحب نے قیام کیا۔ سات دن تک وہیں
 رہے۔ جب فوج شاہی نے سبب حرکت دریافت کیا، کہتا
 مقام بول میں پانی کی قلت اور عفونت کی کثرت تھی۔ اس جہت مقام اتنی اختیار کیا۔

جب مولوی صاحب عید گاہ میں تھے۔ نماز جمعہ میں شاہی
 فوج کے ہزاروں مسلمان کیا سپاہی کیا سردار اُن کے پیچھے نماز
 پڑھتے تھے۔ جب نماز پڑھ کر اپنے لشکر میں جاتے تھے قتل
 پر کمر باندھتے تھے۔ جب سلطنت میں یہ خبر پہنچی تو حکم آیا کہ ابے
 دانہ اور رسد مجاہدین پر بند کر دو کہ اُن پر عافیت تنگ ہو جائے
 مولوی صاحب نے اتمام حجت کی غرض سے ایک عرضداشت
 نظم میں بادشاہ کو بھیجی کہ رسول مقبول نے دو نفیس چیزیں
 اپنی امت میں چھوڑی ہیں۔ ایک عزتِ طاہرہ، دوسرے کلام اللہ
 عزت پر وہ حال گنڈا، جو چاہا کیا۔ کلام اللہ باقی رہا تھا، کفار
 کے ہاتھ سے خانہِ خدا میں اس کی یہ صورت گزری۔ تعجب ہے کہ ایسے

بعدِ مدت میں اسکا انتقام نہ ہو سکے۔ اس بندہ مسکین نے حسبہ اللہ کر باندھی
 ہوا دسکی پاؤں میں ستن ایسی عقوبت کا ہوا مگر حیف ہر کار کا یہ دوسنے اپر تلخ
 عرضداشت بادشاہ کے ملاحظہ میں نگذاری۔ اس لئے کہ اپنے بیان
 سے خود جھوٹے ہوئے۔ جب نجا بدین پر بس۔ بند ہو گئی توفیق
 گذرنے لگے۔ اس کڑی پر بہت سے چلے گئے۔ مولوی صاحب
 نے اپنے بھائی شیخ حسین علی کو کہا۔ الحمد للہ کہ تم نے اور تبار
 فوج نے مثل زمان سابق کئی سو برس کے بعد اب ودانہ بند
 کیا ہے۔ حسین علی نے جواب دیا مجھ سے کبھی ایسا نہ ہوگا۔ اسی
 وقت غلہ وغیرہ ضروریات چھکروں پر لدا کر بھجوا دیا اور بہت
 سی برادرانہ دیکھائی کی جب لوگوں کی کثرت پڑھی۔ مولوی صاحب
 گرفتاری کے خوف سے شریک نماز نہ ہوتے تھے۔ اسکا بھی
 دغا بازوں سے کچھ عجب نہ تھا۔ محافظت کیلئے ہمیشہ تین آدمی
 تلواریں کھینچے کھڑے رہتے تھے۔ اور ہر شخص کو پاس نہ
 جانے دیتے تھے سوا شیخ حسین علی کے یا تہور علی خاں جایا
 کرتا تھا۔ ایک دن شیخ حسین علی نے بہت سی منت و سماجت
 کے بعد کمر سے قرول نکال کر مولوی صاحب کو دی اور پاؤں
 پر سر رکھ کر کہا۔ کاش کے اس وقت آپ ہیں جان سے مار
 ڈالتے۔ بہت سی آفتوں سے بچونگا۔ اور اپنی بہن کو راند نہ رکھ
 سکوونگا۔ پھر شیخ حسین علی علی نقی خاں وزیر کے پاس گئے انے

تمام حال عرض کیا۔ ادھوں نے کہا جیسے ہو سکے اس فتنہ و
 فساد کو بند کرنا چاہیے۔ اب خوف تنزل سلطنت ہے اور مسجد
 سبوت کے ساتھ وقت مناسب بن سکتی ہے۔ مولوی صاحب
 ایسے قول کو بے اصل اور بے فسرور غا سمجھے۔ کہا کہ جب ان سے
 ایفاء وعدہ نہ ہو سکا تو ان سے مسجد نہیں بن سکے گی۔ اور نہ
 وقت مناسب ہاتھ آئے گا۔ میر محمد حسن خاں ناظم بہار،
 نواب محسن الدولہ کی طرف سے مولوی صاحب کے پاس سمجھانے
 کو گئے تو مولوی صاحب نے ان سے کہا کہ جب تک سلطنت
 کی طرف سے مسجد کی تعمیر جو میرے ہمراہیوں کے اخراجات
 ضروری کے متکفل رہے۔ کیا مضائقہ میں توقف کروں گا۔ مگر اگر ان
 سلطنت کو بطائف انہیں ماننا منظور تھا۔ ایفاء وعدہ کون
 کرتا۔ وہ اپنی رنجی کرچکے تھے۔ اس عرصے میں بادشاہ اور علی نقی
 خاں کی تحریک سے سلطان العلام نے بھی تحریر کیا۔ اور وہ تحریر
 مولوی صاحب کے پاس پہنچی۔ لیکن اُسے خلاف نفس الامر
 سمجھے۔ اور تحقیق یہ ہے کہ سلطان العلام نے کوئی فتویٰ رکای
 ایار سے بالشرع نہیں لکھا تھا۔ یہ جواب دیا تھا کہ ایک شخص
 نے بے غرض نفعی رفع توہین اسلام پر کمر باندھی ہے اور
 مرنے پر آمادہ ہوا ہے۔ مزاراد کے حق بجانب ہے۔ کیونکہ خلاف
 شریعت عزائم محمدی حاکم وقت کے دباؤ سے لکھوں۔ لیکن

مقام حیرت ہے کہ کھنودار المومنین مشہور ہے۔ اس میں ایک
 شخص مسکین ضعیف و نحیف نے ہمت مردانہ کی ہے۔ مقام عبرت
 ہے۔ علامات فرنگی محل نے بھی اسی طریق سے تحریر کیا۔ بلکہ کہنے
 لگے کہ حاکم وقت کو اپنے شہر میں رہنے دینے کا اختیار ہے
 مگر ہم کبھی اس شخص کے قتل کا قتل کا فتویٰ نہ دیں گے۔ لیکن
 بعض علماء سے اہل سنت جیسے مولوی حسین احمد اور مولوی غلام
 جیلانی وکیل عدالت انگریزی اور مولوی محمد یوسف اور مولوی
 فضل حق خیر آبادی مولف ہدیہ سعدیہ و حاشیہ قاشی مبارک وغیرہ
 اور مولوی سعد اللہ جو زیارت خاد کعبہ سے مشرف ہو کر آئے تھے
 ہا اور قول المانوس فی صفات اقاموس بمیزان الانکار شرح
 معیار الانکار اور شرح فصول اکبری وغیرہ کے مولف ہیں۔ اور
 دوسرے علماء گناہ نے محض بطبع دنیا مولوی امیر علی صاحب
 کے قتل کا فتویٰ عبارت مختلف سے رنگین کر کے دیا۔ اور دلی
 کے بعض علماء نے بھی ایسی برہان و حجت کے ساتھ لکھا کہ
 جب اہل اسلام قلیل ہوں اور کفار کا غلبہ ہو۔ اس وقت خلافت
 حکم اولی الامر یعنی حاکم وقت جسکے اختیار میں ہوں، خواہ انگریز ہوں
 یا مسلمان، جہاد حرام ہے۔ پس جو شخص ایسے امر کا ترکیب ہو وہ
 طاعی و باغی ہے۔

سراج الدین کیدان بھی ریاست کی طرف سے فہمائش کو
 بھیجا گیا۔ اوس کے کہنے سے کچھ لوگ برلی، رامپور، پٹی بھیت
 کے بزدل ہو کر اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اور انہیں بقدر ضرورت
 زادہ دیا گیا۔ اور کچھ افغان ولایتی کو ہی قوسے صفتے ہی اٹھ
 گئے۔ اب مجاہدین متفرق اور پریشان حال چھ سو کے قریب
 تنہا رہ گئے۔ ان پر فائق ہونے لگے۔ موت سب
 کی نظر میں تھی۔ پیاس روپے حسین علی خاں اُنکے کارنے
 چندہ کرا کے کفالت مجاہدین کیلئے دیتے تھے۔ میر عباس
 ہمیشہ زادہ میر گنجان نامی تیراک مجاہدین کے لشکر کا کوتوال
 تھا۔ اوسکی معرفت روپیہ تقسیم ہوتا تھا۔ ۲۶ صفر ۱۲۰۱ جب
 مطابق ۱ نومبر ۱۹۰۵ء روز چہار شنبہ کو مولوی صاحب
 نے نماز باجماعت پڑھی۔ اور محمد پور کو روانہ ہوئے۔ اوس وقت تین سو آدمی
 سے زیادہ ہمراہ نہ تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد کپتان بابر کو کوہ
 خروجنی تو اوس نے چار کمپنیاں اور دو توپیں لیکر تعاقب کیا۔
 اور تین کمپنیاں گلابی پٹن کی حاجی مرزا حسین علی کی ماتحتی میں تیار
 ہوئیں۔ اس عرصے میں مولوی صاحب آٹھ کوس مقام حیات گنج
 میں جا پہنچے۔ دن چھپنے کے قریب تھا۔ شمال کی جانب
 ایک بانٹ میں ٹھہرے۔ متصور یہ تھا کہ فریضہ ظہر کے بعد ۱۲
 درہلی میں جو تین کوس تھا۔ چل کر ٹھہریں گے۔ جتنے نمازی

تھے وہ ایک ایک روڑی کو چلے۔ شاہی فوج سدا رہا ہوئی
گلابی کپنی جوار کے کھیت میں اندہ بارو کی کپنی اور تو میں کھیت
کے سر پر ہیں۔ اتفاقاً کئی تلنگے اپنی قطار سے بڑھ کر راستے پر
کھڑے ہوئے۔ تاکہ مجاہدین کو جو روڑی جاتے تھے منع کریں
کہ پتان بارو نے خود مولوی صاحب کے پاس آکر کہا کہ بادشاہ
دقت اور ریزٹنٹ کے حکم کے خلاف آپ کو آگے جاتا مٹا
نہیں۔ اپنی جماعت کو مت کچھے۔ اور آپ بھی مناسب
ہے کہ اس عزیمت سے باز رہیں۔ ورنہ ہم کو حکم مانفت کا ہے
مولوی صاحب نے پتان کو جھڑک کر کہا۔ کافر سامنے
سے ہٹ جائیں کوئی مجاہد گولی سے مار ڈالے گا۔ پتان اپنی
فوج میں گھوڑا جھکا کے چلا گیا۔ اور حکم دیا کہ آگے بڑھیں تو اداں
خالی توپ داغ نہ لائیں تو فیر کرو۔ تلنگے مجاہدین پر گولیاں
مارنے لگے۔ لیکن مجاہدین سے اتنی آدمی جوار کے کھیت سر
نکل کر دفعۃً توپ پر جا پڑے۔ اور بند کر دی۔ چاروں طرف سر
فوج کے سپاہی گولیاں برسائے تھے۔ مگر مجاہدین دل کھو
توڑے سے خوب لڑے۔ اور اداں کے غول سے صدائے تکبیر
بند تھی۔ گولیوں کا کچھ خیال نہ کرتے تھے۔ جب یہ صورت
ہوئی۔ بارو الگ ہو گیا۔ اور گلابی نے پیچھے سے اکر کر ماری
غرض اُدھ کھڑی میں یہ سب خاک میں لے گئے اور تین توپیں

خالی مغربی جانب سے چلیں جسکی آواز سے بہت مجاہدین فرار ہو گئے۔ اس وقت مولوی صاحب سترہ اٹھارہ آدمیوں کے ساتھ اپنے سجادہ پر مشغول نماز تھے۔ تلنگوں نے دور سے لوگوں کی جمعیت دیکھ کر ایک توپ ماری۔ ام کے درخت ٹکٹ کر بڑا ٹہنا نمازیوں کے سروں پر گرا۔ بعد اس کے تلنگے پورش کر کے گولیاں مارنے لگے۔ دوسری طرف سے گونڈے کا تعلق شیر بہاد اپنی جمعیت کے آٹھ سب کا کام تمام کیا۔ اور مفدرین کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کیا۔ مولوی صاحب اپنے سجادہ پر رو بقیہ کرے باقی نمازی اورنگی لاش کے گرد پڑے تھے۔ ایک تلنگے نے مولوی صاحب کا سر کاٹ لیا۔ بالآخر وہ سر وزیر کے پاس بھجوا دیا۔ جب وہاں سر سیکر پہنچے تو انھوں نے کہا کہ یہاں کیوں لائے۔ چاہتے ہو کہ لکھنؤ میں بھی کوئی بنگامہ برپا ہو۔ دو تنگے اور شتر سوار سیکر آئے تھے۔ حکم ہوا کہ اس سرکوریڈینٹ کو ملاحظہ کرا کے، موقع قتل پر بجا کر دھڑکے ساتھ طا کر دفن کر دو۔ یہ ڈرے کر اگر واپس بجائیں گے مبادا مجاہدین میں سے کوئی اس کو دیکھ کر چھینے لے اور ہمیں مار ڈالے۔ ریزیدینٹ کو ملاحظہ کرا کے معلوم نہیں کہاں پھینک کر چلے گئے۔ تلنگوں نے مقتولین کے بدن سے لباس بھی اترار لیا۔ اور وہاں سے کوچ کر کے مجددور میں جو تین

۲۲۲۔ نوابان خانے حدیث شہداء میں لکھا ہے کہ موضع کیل کے تعلقہ شیر بہاد نے بربرک جسم پر نور سے جد کیا تھا۔

کوس تھا مقام کیا۔ مقتولین کی لاشیں وہی خاک و خون میں
 غلطاں چھوڑ دیں۔ آخر کار دوسرے دن کو جہزات تھی مسلمان
 زمینداروں نے جو قریب رہتے تھے جمع ہو کر ہر ایک مقتول کی
 لاش اور ٹھکانہ ام کے درخت کے نیچے دفن کیا۔ موری حسنا
 کے پہلو میں اس کے جوان بھتیجے کو دفن کیا جو حالت نماز میں موری
 صاحب کے ہاتھ پر گر پڑا تھا۔ اور دوسرے مقتولین کو ایک گڑھا
 کھود کر دفن کر دیا۔ ایک سو تیسرہ (۱۱۳) آدمی جان سے ماے گئے
 مجروحین کا حساب نہیں۔ مجروحین خوف جان سے آٹھ۔ دس کوس
 تک بھاگے۔ اور شہید ہمارے آدمیوں نے کپتان بارہو کے
 حکم سے اونٹن تعاقب کر کے تمام مجروح مفردین کو تیغ کیا۔
 صرف سیر قیاس کو توں ہزار خرابی بیکرا اپنے گھر پہنچا۔
 جب انتراع سلطنت شروع ہوا۔ ایک شخص نے دیوان محظ
 سے تفادل کیا تو یہ شعر نکلا:-

ویدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را

چنداں اماں نہ دادا کہ شب را سحر کند

اب بکھنویں سرکار کے نمک خوار لازم منشی رام سہاے تنہا کی زبان موری ایل

مما حب (رحمۃ اللہ علیہ) کے جہاد اور واقعہ شہادت کی تفصیلات ملاحظہ فرمائیے جو آپ

سے اپنی کتاب افضل التواریخ میں تحریر فرمایا ہے۔ منشی رام سہاے تنہا نے لکھا ہوا ۲۲۴

آتش فتنہ فرو ہو گئی تھی کہ پھر تند باد غضب مولوی اسیر علی صاحب نے بعد دو ماہ کے اسکو مشتعل کیا۔ انکی خاص چستہ جن کو تمول ذاتی حاصل تھا۔ خفیہ شریک ہوئے۔ مولوی قضا وضع ایٹھی بندگی میں جہاں انکا مسکن تھا۔ فراہمی اسباب جہاد میں مشغول ہوئے یہ خبر بذریعہ اخبار حضرت سلطان عالم ہوئی۔ حکم قضا شیم واسطے حافی واسطے مولوی صاحب کے بنام اہتمام الدولہ بہادر حیدر حسین خاں نافذ ہوا۔ میر محمد علی نائب نے بہ تدبیر مناسب حاضر دولت کیا۔ وزیر تدبیر نے بعد گفتگوئے ضروری، احسن الدولہ کے سپرد کیا۔ احسن الدولہ نے جملہ مراتب نہایت اندکی گوش گزار کر کے رخصت کیا۔ مولوی صاحب چندے تو خاموش رہے۔ پھر عزم اور دھم مہم ہوا۔ جب یہ خبر پھر سلطان عالم تک پہنچی، ز غافل حناں میر محمد علی واسطے نہایتش کے روانہ ہوئے۔ مولوی صاحب نے محدود سے چند سمجھ کر قید کر لیا۔ یہ معاملہ جب ظاہر ہوا۔ میر محمد علی موچکلہ داران باڑی بسواں جہت تمبیر روانہ ہوئے۔ مولوی صاحب نے نظر حفظ گڑھی سترکھ میں قیام فرمایا۔ فوج شاہی نے محصور کر لیا۔ پھر دستور باتدبیر نے میر حسن علی نائب راہہ نواب علیاں تعلقدار محمود آباد کو واسطے نہایتش مولوی صاحب کے بھیجا کہ مولوی صاحب براہ میر موصوف کے مقام محمود آباد میں رونق افروز

ہوئے۔ فوج شاہی واپس آئی۔ کچھ دن گزرے تھے کہ خبر اجتماع
 مجاہدین محمود آباد میں بارہ دگر مشہور ہوئی۔ سلطان عالم ازراہ عدل
 و داد خود بذات خاص متوجہ تحقیقات مقدمہ ہذا ہوئے۔ صاحب
 عدل سنگھ و راجہ نصرت جنگ و راجہ مان سنگھ پیادہ قائم جنگ و
 دستور خان رسالہ درجیت تحقیقات موقع بیکر شاہی عازم اوردھو
 ہوئے اور کئی روز قیام کر کے بعد تحقیقات طبعی بے جرمی فیضان
 بدستخط خود لاپیش کی مسجد پار شہوت کو پیشگی۔ برآرم داس مہنت
 و موہی تراب علی صاحب کئے گئے۔ جناب موہی امیر علی صاحب
 کو ہر چند فہمائش کی گئی۔ کچھ اعتناء ہوا۔ تب بادشاہ وقت نے
 عالمان حنفی و امامیہ سے دوبارہ جہاد کا فتویٰ طلب کیا۔ علمائے
 حنفیہ نے یہ فرمایا کہ جب تک شاہ علیہ عزا نہ کرے و عایا سرخوردہ نصیب
 جہاد نہیں رکھتی اور عالمان امامیہ نے بغیر امام مانعت کلی کی ۷۲۵
 بادشاہ نے موہی سعد اللہ صاحب عالم متوجہ فرنگی محل کو موہبت ۲۲
 و دو کس علمائے منتخب موہی صاحب کے خدمت میں بھیجا۔
 موہی نے کسی سے ملاقات نہ کی۔ موہی سعد اللہ نے وہیں از روئے

۲۲۳۔ راجہ علی بیگ سرور نے مجتہد "مہر موہی سید محمد صاحب ابن غفران مآب موہی سید
 و دار علی صاحب کے فتویٰ کے اصل الفاظ لکھ کر حقائق کو واضح کر دیا ہے کہ غشی رام سہاے تہنا
 کا یہ محض بہتان ہے۔ انہوں نے اپنے آقا کی نمک خوری ادا کرنے کی اس طرح کوشش کیا ہے جیسے
 کہ دوسرا ارکان سلطنت نے کیا تھا۔ مولف

احکام شریعت عز و عطا آغاز کیا۔ اور قریب ایک ہزار مردم کے ہمراہی
 امیر علی سے یہ بیعت مولوی سعد اللہ صاحب منتشر ہو گیا۔ آخر کار
 جب شورشیں زیادہ ہوئی اور مولوی صاحب نے یہ مجمع کثیر ان جماعت
 عظیم اور دھندھنرایا۔ سلطان عالم نے بھورا برید زبردست بہادر
 بارو صاحب کپتان ملازم شاہی کو واسطے تدارک کے متعین کیا۔
 وہ انسر جری حسب فرمان شاہی دواؤ و شتابا شتاب محمود آباد پہنچا۔
 مولوی صاحب سے منگام دزمت مراتب پند و نصائح ادا کئے۔
 صبح ہوئے ہی مولوی صاحب نے کوس عزیمت اور دھندھ بجایا۔ بارو
 صاحب ممانعت کی۔ مولوی صاحب نے جوش غضب سے بندوق
 مہر کی۔ بارو صاحب کو خدا نے بچایا۔ گور اندزان توپ خانہ بارو صاحب
 نے مولوی صاحب سے ساز کیا۔ فوراً مانی مہربانی سے لگے۔ اور
 مولوی صاحب چڑھتے ہوئے مہر گروہ مجاہدین بارو قار قریب لشکر
 پہنچے۔ جب یہ کار سازی فون خاطر بارو صاحب منقش ہوئی فوراً
 راجہ شیر بہادر سنگھ کیا۔ نظامت بہر اپنچ کو اطلاع دی اور توپ بند
 کر کے شمشیر فونخوار میان سے نکال کر حملہ آور ہوئے۔ اس زمرہ
 میں اقوام مثل نداف و نور باغان و طرہ فردش و غیرہ زیادہ تھے۔
 اور مشہور ہے کہ مولوی صاحب اپنے قتل کی تاریخ خود حبات
 میں تصنیف فرمائی تھی۔

سر میدان کفن بردوشش دارم ۲۲۶
دیگر

گفت از دوسے بہت ازلی بہ قتل شد مولوی اسیر علی
العلم عند اللہ۔ پھر تو طریقین سے جنگ شروع ہو گئی۔۔۔
... آخر کار مولوی صاحب مصلحتاً مراٹھا سے کنارہ کیا۔ مردم
بہت متفرق ہو گئے۔ جناب مولوی صاحب اور مصاحب و رفیق
بہتے ہوئے نالہ رحیم نگر متصل شجاع گنج پینچے اور فکرا جماع لشکر کی
کہ مردانہ راجہ کیا رو بارہوئے واقعہ ۲۶ صفر ۱۲۰۶ ہجری روز چار شنبہ
وقت نزول آفتاب اسی نالہ میں اس سب کو شہرت قتل پلایا۔
نفش مبارک تو اسی نالہ میں رہی اور سر شریف بحفاظت تمام روانہ
نکھڑ ہوا کہ حکم بادشاہ وقت قصبہ چنیٹ میں سب غدیہ دفن کرایا
گیا۔۔۔ اس ہنگام میں شش صد بست و پنج ہزار بیان مولوی
صاحب یکمہ چند قناقوم ہنور مقتول دکشتہ ہوئے۔

میرزا رحیب علی بیگ سرور مصنف فہرست عجائب نے اپنی قابل قدر کتاب "نساء بر"
یہ مولوی سیر میر علی (رحمۃ اللہ علیہ) کے جہاد کا پورا واقعہ اس دور کی عام بد حالی و قانونیت
سے حساس اور ہے اور اس کی کوڑی صاف گوئی سے بیان کیا ہے۔ مرقور صاحب شایانِ اودھ
کے پرانے نمک خواہ اور بلازم ہونے کی وجہ سے بادشاہوں کی تعریف و توصیف

۲۲۶۔ مکمل شریعہ ہے:

شہر تاریخ سن قبل از ہجرت : سر میدان کفن بردوش دارم

ہے۔ اس کے صلہ میں کسی کو خلعت عیلا کوئی عہدہ پانے کا امیدوار
 کیا گیا۔ انقصہ جہاں مسلمانوں کا مجمع ہوا۔ عالموں نے سمجھا بچھا
 کے ڈرا دھکا کے پریشان کر دیا۔ مولوی سید ابیر علی صاحب کے
 بارہ سو برس کے بعد اس جرات و ہمت کے ہوئے کہ راہ خدا میں
 جان دینے پر آمادہ ہو گئے۔ خدا اور رسول کا حکم بجالانے میں کسی
 سے ڈرے۔ آخر نواب نے بھارت نشی امیر حیدر و بشیر الدولہ
 خواجہ مراد علی صاحب کو بلایا۔ پچاس۔ ساٹھ جاں بازوں سے
 انھوں نے مشہر میں قدم بچھنسا دیا۔ ابجد علی شاہ کے مقبرہ کی مسجد
 میں اترے۔ شہر کے مسلمان جوق در جوق جانے لگے جس روز
 نواب سے ملاقات ہوئی۔ پہلے مجتہد العصر کا فتویٰ دستخطی نواب کے
 ہاتھ میں دیا۔ انھوں نے عیاری و چرب زبانی سے مسجد تعمیر
 کرنے، مشرکوں سے انتقام لینے کا وعدہ کیا مگر وہ سب بانی تھا۔

فتویٰ مولوی سید محمد مجتہد العصر :-

حاکم وقت را بتا بعت حاکم شرع رفع شر کفار اذ اہل ایمان
 و اسلام و اجرائے حدود بر محاربین مشرکین و قصاص خون مسلمانان
 واجب است۔ واللہ اعلم بالصواب ۱۵

مع ترجمہ :- حاکم وقت پر واجب ہے کہ وہ شریعت کی مطابقت میں اسلام اور اہل ایمان کی طہارت
 سے کفار و مشرکین پر حدود جاری کرے اور مسلمانوں کے خون کا قصاص لینے کا حکم دے۔

مہر مجتہد العصر

نواب نے یہ فتویٰ پڑھ کے جواب دیا کہ مجتہد العصر کی تحریر پر عمل کریں گے۔ مسجد بنوادیں گے اور انتقام بھی لیں گے پھر بہت تملق کی باتیں کیں۔ وہ سب دھوکہ دینے کی تھیں۔ مولوی صاحب نے تمام محبت کیلئے پندرہ روز شہر میں قیام کیا۔ جب وعدہ کا اثر کچھ بھی نہ ظاہر ہوا۔ تو چلنے کا اہتمام کیا۔ نواب دغا شعار نے چاہا نہ جانے دیں۔ بچے سے گرفتار کریں۔ لیکن جولائے مئی انھوں نے بوجہ حسن ایشی پنیادیا۔ اب لکھنؤ کی ناکہ بندی ہوئی لوگوں کا شہر سے نکلنا دشوار ہوا۔ جس نے باہر جانے کا قصد کیا۔ وہ گرفتار ہوا۔ مگر جو مولوی صاحب کے ہمراہ گئے وہ بہت کی راہ گئے۔ انھوں نے ایک رات ایشی میں بسر کی پھر سولی میں سحر کی۔ وہاں سے اپنے پیچھے۔ یہاں بہت آدمی جمع ہو گئے یہ خبر سن کے نواب کو اضطراب ہوا۔ میر صفدر علی فتح جنگ تھوڑا سا لڑا۔ سیر حسین کلکتر، حسین علی کارندہ مقیم الدولہ راجہ نواب علیخان کو بہر نہائش بھیجا۔ انھوں نے دنیا کو دین سے بدل کے کچھ کہا سنا۔ مگر مطلب نہ نکلا۔ رفتہ رفتہ لشکر اسلام شجاع گنج میں داخل ہوا۔ خبر نہ تھی وہی مقام کرب و بلا تھا۔ نواب کے حکم سے فوج شاہی نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ مخالفوں کا کپا ذکر۔

مسلمانوں نے اسلام سے منہ پھیر لیا۔ سرطنت سے بندو قوں کی
 ہڈیاں چلنے لگیں۔ روحیں نفسِ غفیری سے نکل کے منہ بیری
 میں پہنچنے لگیں۔ ضعیف الاعتقاد بزدلے فرار ہوئے۔ ایماندار
 جمیع سیدِ عالی نسب والا حب کے ساتھ جان دینے کو تیار
 ہوئے۔ کہتے ہیں سوہوی صاحب نے جیسے عزمِ انتقام لیا تھا۔
 یہ مصرعِ آتش و درِ زبان رہتا تھا۔

میر سید اں کفن بردوش دارم
 بعد شہادت جب غور کیا تو یہی مادہ تاریخ تھا۔ جس کو منشی
 ظہیر الدین صاحب نے نظم کیا:
 قطعہ تاریخ شہادت امیر المجاہدین سوہوی سید امیر علی صاحب
 علیہ الرحمۃ

تاریخ شہیدان کفن پوشش پڑ چہ حاجت تاسنش من برنگارم
 کہ غور فرمود آں میر شہیداں پڑ میریداں کفن بردوش دارم
 انفرغ ۲۹ صفر ۱۲۴۲ ہجری۔ چہار شنبہ بعد زول امیر المجاہدین
 نے باگڑہ کثیر الایمان نے شربت شہادت پیا۔ حلق بریدہ سے
 دیر تک کلمہ شہادت جاری رہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

یہ نظم تازہ سننے کا ہے۔ مقام مردھننے کا ہے کہ بعد شہادت
 سر آں انسر کا ہے کے شام کو شتر سوار روانہ ہوئے۔ تن ہے سر

میدان میں پڑا رہا۔ انصاف سے جواب دو کہ یہ سانحہ واقعہ کرپلا ہوا
 یا نہ ہوا۔ اِدھر تو بعد زوال مسلمانوں کا خون بے بہا بہا اس کی
 قدرت دیکھتے کتنی جلدی صبح ہو گئی۔ کچھ نہ رہا۔ حساب کیا تو اسی
 تاریخ (یعنی، نومبر ۱۸۵۷ء مطابق ۲۶ صفر ۱۲۷۷ ہجری قمری)۔ مولف
 کو پارلیمنٹ لندن سے ضبطی سلطنت اودھ کا حکم نافذ ہوا منتقم
 حقیقی نے بہت حد خون ناحق کا اقام سلطنت و ملک سے لیا
 بلکہ ہر متنفیس اس کے وبال میں مبتلا ہوا۔ شہر تباہ و برباد ہو گیا کہتے
 میں کہ ضبطی ملک سے گھبرا کے نواب صاحب نے دیوان حائط میں
 فال دیکھی تو یہ شعر نکلا ہے

دیدم کہ خون ناحق پر دانہ شمع را

چندال اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

افسوس بارہ سو برس کے بعد سادات و مسلمانوں کے قتل
 کے وہ داپے ہوئے جو خود بھی طوطی کی طرح گلے کا دم بھرتے
 تھے۔ اسلام کا زبانی اقرار کرتے تھے۔ کلمہ گو یوں نے کیونکر مارا
 ہوگا۔ کس طرح امام علیہ السلام و اہل بیت رسالت و انصار و الامت
 کا مرتن سے اتارا ہوگا۔ پروردگار عالم محبت مٹاتا ہے۔ کوئی ہوشیہ
 نہیں رہ جاتا ہے۔ یہاں آنکھوں سے دیکھ لیا۔ کسی کو محبت اسلامی
 کا لحاظ نہ ہوا۔ یہ سانحہ اوس کا نمونہ تھا۔ اور ایک حساب سے دونا
 تھا۔ یزید پید نے حب سلطنت میں وہ حرکت کی تھی اور واقعی

حضرت امام کے سامنے اس کی وقعت نہ ہوتی یہاں تو دین و دنیا کا کوئی معاملہ نہ تھا فقط بعض ملت اس کو کہتے ہیں کہ قتل کیا نہ ملک ہاتھ آیا نہ مال ہاتھ آیا۔ اس کے نتیجے میں زوال آیا۔ صوبہ اودھ سے فساد کی ابتداء ہوئی۔ بکھنوز پڑتا ہوا۔ وہاں تو انبہام مسجد کے انتقام کے ارادے پر مسلمان قتل ہوئے پھر کچھ قاتلہ پور میں بہت سے سید مع زن و ذرند ہاک کئے گئے۔ وہاں کلام اللہ یہاں شبیر رحمہ اللہ شہید ہوئے۔ بادشاہ ملقت نہ ہوئے۔ مگر منتقم حقیقی کی دن سے انتقام کی صورت ظہور پائی۔ آخر نتیجہ خوزیری کہ اس ملک میں عمل انگیزی ہوا۔ تین مہینے کے بعد یعنی ۲۹ صفر ۱۲۷۲ھ۔ مولف کو مسلمانوں کو قتل کیا اور ۲۹ جمادی الاول ۱۲۷۲ھ ہجری (مطابق ۶ فروری ۱۸۵۶ء)۔ مولف کو اشتہار ضبطی ملک شہر میں آویزاں ہوا۔ جو شریک مشورت تھے۔ تباہ و خراب ہوئے۔ کتنے ہذیت و خواری مرے اور مارے گئے۔ نام کیا ذکر نشان تک نہ باقی رہے۔ اور جو افسر شریک معرکہ قتل تھے وہ ہنگام اتراع سلطنت پیادے و سواروں کے ہاتھ سے ذلیل و رسوا ہوئے۔ ملک کے ساتھ ملک و خزانہ و دواب بلکہ جو کچھ سلطنت سے متعلق تھا ضبط ہوا۔ نواب ابوالمنصور خاں کے زمانہ سے جو کچھ جمع ہوا تھا، سب نیلام کر لیا۔ پھر شہر کے مکانات

کھدے۔ باشندے آوارہ وطن ہوئے۔ غریبکہ ہر طرح کی تباہی
ہوئی۔ جس نے یہ حرکت کی تھی اس کو دارین کی رو سیامی ہوئی۔ یہ
ربائی جربہ یاد آئی۔

اے یار جو کون کسی کو کھپا دے گا
یہ یاد رہے وہ بھی نہ کل پاوے گا
اس داہ مکافات میں سن اے غافل
بیدار کرے گا آج تو کل پاوے گا

جو اس سانحہ کے بعد ہوا، چاروں طرف اس کی پکار رہے۔ کاشمیر
فی نصف النہار ہے۔ جو قصہ اس قدر مشہور ہے۔ جس کا شمار
نزدیک و دور ہو۔ مگر اس کا اظہار مرمر پر ہے۔ دنیا میں چپ رہنا
کھلا ہے۔ حقیقت میں یہ فسانہ عبرت الناظرین و تنبیہ الغافلین ہے جو
حق پسند صاحب دل میں انکو سیر سے مزہ آئے گا اور کور باطل سے
دیکھانہ جائیگا۔

قلم بشکن۔ سیاہی ریزہ۔ کاغذ سوز۔ دم درکش
حسن این قصہ پر در در دفتر نمی گنجد

مولانا سید امیر علی صاحب کے حالات زندگی اور اس معرکہ جہاد کی تفصیل
پر ذرا مشہور کتابیں ہیں۔ ایک حدیقہ شہداء ہے جو شری ہے۔ اس کے مصنف
مزا جان صاحب ہیں۔ دوسری کتاب آئینہ آخری ہے جو اردو نظم میں ہے اور صغیر بکھنوی
کی تصنیف ہے۔ حدیقہ شہداء میں تاریخ ہے۔ (مخلص)۔

— اچوڑھیا میں ہنومان گڑھی کے حدود میں واقع عہد مانگیری کی
 قتلاتی مسجد کا نام و نشان مٹا دیا گیا۔ مقامی اور فیض آباد کے لاتعداد
 افراد نے جام شہادت نوش کیا۔ موہوی امیر علی امیتھوی اور ان کے
 خلع رفقاء نے سلطان عالم اور اعیان ملکیت کی توجہ اس طرف
 مبذول کرنے کی سعی لا حاصل فرمائی۔ آخر الامر شاہ صاحب نے
 مسجد لی تمپہ نوکا بیڑا اٹھایا۔ عوام اناس کے جوش و خروش کو دیکھ
 کر کہ شاید حکومت وقت مطابق عملی شکل دے دے، جسے وہ
 سیاسی تقاضوں کے تحت ٹال رہی تھی۔

خلوص نیت اور جذبہ ایانی کے زیر اثر مکھنورے، امیتھی،
 بانسہ شریف، سہالی، دریا آباد ہوتے ہوئے موضع رحیم گنج کی باغی
 امیر المجاہدین قیام پذیر ہوئے۔ متززوں حکومت نے شاہی فوج کو
 حکم دیا کہ مجاہدین کو ہر قیمت پر فیض آباد کے حدود میں داخل ہونے
 سے روک دیے۔ نیز علاقہ کے تعلقداروں کو ہدایت جاری کی
 کہ وہ کرنل بارو کی مدد کریں۔

کرنل بارو نے شیخ حسین علی کارندہ نواب علی خاں محمود آباد
 منصرم علاقہ دریا آباد کو جنگی مصلحت کے پیش نظر تھیں کیا کہ وہ موہوی
 صاحب کو محمد پور میں ضلع فیض آباد جانے والے راستے سے باز رکھے
 تاکہ وہ مسلم علاقہ میں نہ جانے پائیں ورنہ انکی پیش قدمی کو روکنا

نامکن ہو جائے گا۔ حسین علی کو روانہ کر کے کرنل بارٹون فوج لیکر چلا۔
 حسین علی مولوی صاحب کو یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا کہ نواب صاحب
 نے مسجد کی دوبارہ تعمیر کا حکم جاری کر دیا ہے۔ لہذا فیض آباد جانے
 سے بہتر ہے کہ اس بات کی تصدیق کیلئے درہ تین دن وہ ردولی
 میں ٹھہر جائیں۔ انکو ردولی کے راستہ پر گامزن کر کے حسین علی نے
 اپنی راہ لی۔ کرنل بارٹون فوج لیکر پیچ گیا۔ اور فوراً گورہاری مشرورع
 کردی۔ مولوی صاحب شدید بخیر صحت ہو کر گر پڑے۔ عقب سے ٹھاکر سنگھ
 بھلیہ اور شیہ بہادر بھی ٹوٹ پڑے۔ شیر بہادر نے سر کو تلوار
 سے تار لیا۔

دوسرے دن چودھری ردولی اور مسلمان زینداروں وغیرہ
 نے بے گورہ کفن لاشوں کی تجیز و تکفین کی۔ شہداء میں ذر عورتیں بھی
 شامل تھیں۔ مولوی صاحب کی نعش کے سر غائب تھا۔

بہر حال مولوی سید امیر علی صاحب کا یہ واقعہ شہادت اپنی نظیر
 آپ ہے۔ عبدالرحیم خاں سکین نے اس غیر معمولی اہمیت کے واقعہ
 کو اپنے ایک قطعہ میں اس طرح ظاہر کیا ہے۔

عیاں کر بلا کا ہوا معرکہ

وہی سب طریقہ وہی سب طریق

پیاسے شہیدوں کی تاریخ ہے

حق۔ حق۔ حق۔ حق۔ حق۔ حق۔

جوناہی ہوئے تحت تیغ نکال سال

حرقی۔ حرقی۔ حرقی۔ حرقی

گم گشتہ حالات اچھوڑ دھیا کے رہ تب اور عاشق نگار مولوی عبدالغفار نے تاریخ
 باریہ مدنیۃ الاولیاء کے مصنف مولوی عبدلکریم انصاری مرحوم کے منجملہ بھائی مولوی
 عبدالرحیم انصاری کے متعلق لکھا ہے کہ جس وقت مولوی عبدالرحیم صاحب نے مساکہ
 مولوی سید امیر علی رحمۃ اللہ علیہ نے علم جہاد بند کیا ہے تو انھیں پید خوشی ہوئی۔ اور
 شوق شہادت میں فوراً ہی جہاد کی تیاری شروع کر دیا۔ اور ایک دن بال بچوں کو اللہ تعالیٰ
 سے پیر کے گھوڑے پر سوار ہو کر رخصت ہو گئے۔ اور مولوی سید امیر علی صاحب کے دوست
 بہ نثرین سے گئے۔ لشکر مجاہدین میں شامل ہو کر مولوی صاحب کے ہاتھ کے ساتھ حرم نگر
 میں اپنے بھی جام شہادت نوش فرمایا انا للہ وانا الیہ راجعون — شہادت کے وقت
 آپ کی عمر اٹھائیس سال نو ماہ اور چھ دن تھی۔

چند حقائق متعلقہ جہاد مولوی امیر علیؒ

محترم بزرگ جناب مفتی محمد رضا صاحب انصاری فرنگی محلّی موجودہ صدر اتر پردیس اور واکاڑی، کھنوسے مولوی سید امیر علی، میٹھوی کے جہاد سے متعلق جو تاریخی حقائق قلم بند فرمائے ہیں انکے بموجب ہنومان گڑھی کی مسجد کے سلسلہ میں بیڑگیوں اور مسلمانوں میں جو شکار ہوا تھا، اس وقت یہ بحث اٹھی تھی کہ ہنومان گڑھی میں جو مسجد کہا جاتا ہے کہ مشہد کر دی گئی۔ وہاں کوئی مسجد ہی نہیں تھی۔ اس کی تحقیقات پر حکومت اوردھ نے جب آمادگی ظاہر کی تو کھنوسے مولوی نہال الدین بکار مرکز موقع کے معائنہ کیلئے بھیجے گئے اس وقت فیض آباد میں داروغہ عدالت فرنگی محلّی کے مولانا محمد حفیظ اللہ تھے، حکم سرکار سے وہ بھی تحقیقاتی کمیشن کے رکن بنائے گئے۔ مولوی نہال الدین صاحب اور مولوی محمد حفیظ اللہ صاحب فرنگی محلّی نے اپنے دستخطوں سے جو رپورٹ موقع پر گواہیاں لیکر جن میں غیر مسلم گواہ بھی شامل تھے دی۔ اس سے مسجد کا ہونا ثابت ہوا۔

جب حکومت اوردھ اپنی کمزوری کی وجہ سے اسکے تدارک میں بے بس ثابت ہوئی تو مسلمانوں نے بطور خود انتقام لینے کیلئے لشکر تیار کیا جس کے سپہ سالار مولانا سید امیر الدین علی، میٹھوی بنائے گئے۔ جنھیں امیر الجاہدین کہا جانے لگا۔ یہ آغاز ماہ جولائی ۱۸۵۷ء کی بات ہے جو اوردھ کے آخری تاجدار، جالتا عالم واجد علی شاہ بادشاہ کی حکمرانی کا آخری سال ثابت ہوا۔ اس وقت حکومت اوردھ کے وزیر اعظم، واجد علی شاہ بادشاہ

۲۲۰۔ اخبار قومی آواز کھنوسہ مورخہ ۱۰/۱۲/۱۸۵۷ء

۲۲۱۔ امیر الجاہدین مولوی سید امیر علی، میٹھوی طلعت فرنگی محلّی کے شاعر تھے اور عبدالرحمن مومند کھنوسی کے مرید تھے۔ (ایضاً۔)

کے خسرو اب علی نقی خاں تھے جو اپنی انگریزی پرستی میں مشہور و معروف تھے۔

اکثر کتابوں میں مرقوم ہے کہ سلطان العلماء سید محمد (ابن سید ولد علی۔ غفران تاب) نے مولوی سید امیر علی امیٹھوی کی حمایت میں فتویٰ دیا تھا۔ لیکن مرقوم مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی کی تحقیق کے بموجب سلطان العلماء نے مولوی سید امیر علی صاحب کی حمایت میں کوئی فتویٰ دیا تھا۔ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ تاریخ اردھ کے مصنف محمد نجم نقی خاں کا کہنا ہے کہ:

”میں نے اس کے متعلق جو قلمی کاغذات کا مجموعہ دیکھا ہے، میں مہنتوں کے بیانات، موافق تنازعہ کا نقشہ اور اسے لکھنے والے کے نام اور نگلے والیاں، اردھ کے ذریعہ درجہ عیشہ کا شفق علی نقی خاں وزیر کے خطوط بہتہ کے نام بہتہ کے خطوط مولوی امیر علی کے نام اور مولوی صاحب کے جوابات اور سرے البکار ان مسئلہ کی تحریریں، علماء کے فتوے، سب کچھ موجود ہیں۔ ان میں بہتہ صاحب کی کوئی تحریر مولوی امیر علی کے موافق موجود نہیں بلکہ خلاف ہے۔“

بہر حال یہ مشہور ضرور ہے کہ سلطان العلماء نے امیر امجد دین کے نقطہ نظر کی یک گوز حمایت کی تھی۔ یعنی جس معاملہ کو امیر امجد دین اٹھے تھے مسلمانوں کے خون ناحق کا بدلہ لینا، وہ برحق تھا۔ امیر امجد دین کے اقدام اور عزم کی حمایت نہ تھی۔ اس مسئلہ پر جو استفتا کیا گیا تھا، اس پر سلطان العلماء نے لکھا تھا:

”برحکم اسلام دفع شرکفر، و السلام اذ اب ایمان و اسلام لازم است۔“

و نہ یقلیم

دستخط امیر محمد بن سید ولد علی۔ ۲۳۱

اسی طرح بعض لوگوں کی طرف سے علمائے فرنگی محل پر یہ الزام عاید کیا جاتا ہے کہ اس موقع پرستی علمائے فرنگی محل نے "شیعہ بادشاہ" کی حمایت میں فتویٰ دیا تھا۔ اس سلسلہ میں جناب مفتی محمد رضا انصاری صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"اگر الزام عاید کرنے والوں کا مطلب یہ ہے کہ علمائے فرنگی محل شیعہ بادشاہ کی طرف سے امیر المہاجرین کے مقابلہ و مقابلہ کرنے میں بادشاہی لشکر میں شامل تھے، جس نے امیر المہاجرین کو شہید کیا تھا۔ یہ بات تاریخ اودھ کے کسی جانب دار یا غیر جانب دار مورخ نے نہیں لکھا ہے۔"

اس کے برعکس علمائے فرنگی محل میں سے مولانا شاہ عبدالرزاق صاحب، مولانا محمد برہان، بحق صاحب، مولانا خمد معان، حق صاحب، امیر المہاجرین کے لشکر میں شامل تھے، ایک اور عالم مولانا تراز علی صاحب رحمہمیں غلطی سے تاریخوں میں فرنگی محل لکھا ہے، مجاہدین کے ساتھ تھے۔

در بار اودھ نے سمجھوتے کیلئے سب امیر المہاجرین سے ناندہ بھیجنے کی درخواست کی تو مولانا محمد عبدالرزاق صاحب اور مولانا تراز علی صاحب کو امیر المہاجرین نے ناندہ بنا کر بھیجا لیکن سمجھوتے کی گفتگو

۲۲۰۔ (ترجمہ) کفار و مشرکین کی طرف سے مسلمانوں کو بیچنے والے شر و فساد کا تدارک کرنا مسلمان حکام پر لازم ہے۔ اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

۲۲۱۔ اخبار قومی آواز، کھنؤ۔ مورخہ ۲۵ اپریل ۱۹۴۷ء

۲۲۲۔ مولانا تراز علی صاحب علمائے فرنگی محل کے شاگرد تھے اور مولانا محمد عبدالوالی صاحب فرنگی محل کے مرید تھے۔ اخبار قومی آواز، کھنؤ۔ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۴۷ء

عبید اللہ۔ مولوی ابوالحسن۔ — نام طر سے ان حضرات کو فرنگی محل سے تعلق سمجھانا
سبب کیونکہ اس وقت مرکزِ تباع اور دارالافتار فرنگی محل ہی تھا اور راج بھی ہے۔

جناب نقوی صاحب نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ چونکہ ان حضرات میں سے صرف
مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محل تھے۔ باقی چار حضرات نسبتاً ہی غیر فرنگی محل تھے یا
دائرہ استفادہ دہلی سے بھی خارج تھے؟

خرم بزرگ مفتی محمد رضا انصاری صاحب نے معزز نقوی صاحب کے سوال کے
جواب میں تفصیلات تحریر فرمایا ہے وہ اس طرح ہیں:

” — جہاد کے خلاف فتویٰ دینے والوں میں جن پانچ کئی مل
کے دستخط ہیں، ان میں سے تین دستخط کتدہ علماء دہلی فرنگی محل
سے کسی تعلق کسی طرح کا نہیں ہے۔ ان میں سے دو کاتدہ کا تعلق
ضرور ہے۔ یعنی مفتی سعد اللہ اور مولانا حسین احمد کا۔

مفتی محمد سعد اللہ مراد آباد کے رہنے والے تھے، ان کے
والد کا نام مولوی نظام الدین مراد آبادی تھا۔ مفتی محمد سعد اللہ
مفتی محمد ظہور اللہ فرنگی محل کے شاگرد تھے۔ شروع ہی سے سرکار
اور دھ میں ملازم رہے۔ اور سلطانہ شاہی مدرسہ کے بعد شاہی
چھاپے خانہ میں بسلسلہ ترتیب مفت اور اسکے بعد مفتی عدالت

ہوئے۔ انتظام سلطنت اور دھ کے بعد ریاست رامپور میں ملازم ہو گئے۔ وہیں
مکان بنوایا۔ وہیں آخری عمر گزاری۔ اہل و عیال سب وہیں رہنے
لگے تھے۔ مراد آباد سے کچھ علاقہ نہ رہا۔

— دوسرے، مولانا حسین احمد نام کے کوئی عالم دین عالم خاندان فرنگی محل
میں نہیں گذرے ہیں۔ یہ مولانا حسین احمد (دستخط کنندہ) کون ہیں؟
غالباً مولانا حسین احمد محدث بیچ آبادی ہیں جو علوم میں علمائے فرنگی
محل کے شاگرد تھے اور حدیث میں شاہ عبدالعزیز صاحب محدث
دہلوی کے بلا واسطہ شاگرد تھے..... واقعہ امیر المجاہدین
کے وقت انکا شمار متاخر علماء میں ہوتا تھا۔

— تیسرے دستخط کرنے والے مولوی عبداللہ ہیں۔ اس نام کے
کوئی صاحب خاندان فرنگی محل میں نہ اُس وقت تھے۔ نہ اُس سر
پہلے اور نہ بعد اور ان مولوی صاحب کا تذکرہ بھی کہیں نظر سے نہیں
گذرا ہے۔

— چوتھے دستخط کنندہ کا نام "ابو الحسن" ہے۔ اُس زمانے
میں خاندان فرنگی محل میں ایک عالم "ابو الحسن محمد صالح" ضرور تھے
مگر انکا منصب اُتار سے تعلق کا پتہ نہیں چلتا۔

علمائے فرنگی محل میں فتویٰ نویسی کا تعلق زمانہ سابق میں انھیں
علمائے رہا ہے جو فقہ اور اصول فقہ میں تخصص اختیار کر لیتے تھے
تلاش کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ مولوی ابو الحسن دستخط کنندہ کوئی

اور میں یا "ابو الحسن محمد صالح" ہی ہیں۔ جو بھی ہوں انھوں نے
 کا جواب ایسا درٹوک دیا ہے جس سے واقعہ امیر المجاہدین کے بارے
 میں علماء کے نقطہ نظر میں اختلاف کا پورا پورا سراغ مل جاتا ہے۔
 بہر حال مولوی ابو الحسن کا نسبتاً فرنگی محلی ہونا مشکوک ہے۔

دریاد اور دھ کو اپنی بقا کیلئے ہر اقدام کے سلسلہ میں لکھنؤ سے کلکتے تک کے رقبہ عمل
 کو پیش نظر رکھنا لازم ہو گیا تھا۔ امیر المجاہدین اور ان کے تمام لشکر "حکام اسلام" کے
 بیت و محل سے مایوس ہو کر ہی بذات خود میدان میں اترے تھے۔^{۲۳}

اس استفتا کی عبارت بھی دیکھنے کے لائق ہے جس پر پانچ سنی علماء
 بشمول مفتی محمد یوسف فرنگی محلی کے دستخط ہیں۔ ایک جملہ اس کا یہ تھا: ^{۲۴}

— "بادشاہ باعث فساد حاکم بالامست مجبور شدہ۔ برائے

مصلحت، چند ایام منع روانگی می فرماید۔"

یعنی حاکم بالا (انگریز) کے فساد کے باعث مجبور ہو کر بادشاہ نے کچھ دنوں کیلئے
 روانگی منع فرمادیا ہے۔

مولوی ابو الحسن کا جواب بھی ملاحظہ فرمائیے:-

— "اگر از حاکم بالا است استرااع سلطنت واجرائے کلمۃ انصاری

نظن قوی تصور متیقن باشد حکم من اثنی یقین قال لازم علیہ ان یختار
 اہونہا ۲۲۲

کہتے ہیں کہ جب مولانا سید امیر الدین علی امیٹھوی شہید ہو گئے تو انکا سرفیج کی خوشخبری
 کے ساتھ دربار اردھ میں پیش کر دیا گیا۔ ۲۲۱ لیکن اس سلسلہ میں مختلف حکایات مشہور ہیں
 کوئی کہتا ہے کہ نواب نے منگایا تھا۔ لکھنؤ میں آیا تھا۔ بعضے کہتے ہیں کہ پھر اس طفر
 روانہ کیا۔ لوگوں سے بہانہ کیا۔ بعض کہتے ہیں کہ نواب گنج تک شتر سوار لایا تھا۔ یہاں
 پہنچنے نہ پایا تھا کہ بخون ہوائے مسلمانان رحمت قہقری کا پروانہ پہنچا۔ ۲۲۲
 مشہور مختلف روایات اور حقیقت کے متعلق عزت اکب مولانا سید کلب صادق صاحب
 مجتہد فرماتے ہیں: ۲۲۵

— تاہم میں اس قدر ضرور عرض کر دینگا کہ بہت کم ایسا ہوتا ہے جب
 کوئی بات بالکل بے بنیاد طریقہ پر یوں مشہور ہو جائے۔ اس لئے بہت
 نامہ اسکان یہاں ہے کہ اس روایت (دربار اردھ میں مولوی امیر علی صاحب کے
 سر پیش کرنے کی — مولف) کی تہ میں کوئی ذکر کوئی حقیقت ضرور ہوگی.....

۲۲۲۔ ترجمہ :- اگر اندیشہ قوی اور یقین کی حد تک پہنچا ہوا ہے کہ مجاہدین کے اقدام کے نتیجہ میں حاکم
 بالا (انگریز) کی طرف سے سلطنت چین جائیگی اور یہاں نصاریٰ کا اقتدار قائم ہو جائیگا تو حکم شرعی یہی ہے
 کہ دو مصیبتوں میں سے کسی ایک میں پھنسنے والے کو چاہیے کہ مصیبت کم تر درجے کی ہو اسے قبول کرے۔
 (یعنی انگریزوں کا اقتدار قبول نہ کرے)۔

۲۲۳۔ اخبار قوی آواز، لکھنؤ۔ مورخہ ۲۲ اپریل ۱۹۸۲ء

۲۲۴۔ اخبار قوی آواز، لکھنؤ۔ مورخہ ۲ مئی ۱۹۸۲ء

۲۲۵۔ اخبار قوی آواز، لکھنؤ۔ مورخہ ۳۰ جولائی ۱۹۸۲ء

روزنامہ چمک مسافت

ہندوستان میں بھلی سلطنت کے خلاف تمام مخالف قوتوں میں سب سے زیادہ صلاح
قوت روہیلوں کی تھی۔ جو ترائی کے علاقہ میں اپنی قوت بڑھا رہے تھے۔ نواب صاحب جنگ نے
محمد شاہ بادشاہ کو بن گڑھ پر حملہ کرنے کیلئے آمادہ کیا اور وہ بنفس نفیس نواب سید علی محمد خاں راولپ
پر حملہ آور ہوئے۔

بن گڑھ کے سفر کا یہ روزنامہ پیش بہا معلومات کا خزانہ ہے کیونکہ یہ لشکر کشی ہندوستان
کے شہنشاہ نے شخصاً انجام دیا تھا۔ اور آئندہ تمام مخلص اس لشکر کشی میں بذات خود شریک تھا۔
"شہر ادیب" کے مصنف نے آئندہ تمام مخلص کے فارسی سفرنامہ کا "روزنامہ چمک مسافت" کے
ناکسے اردو میں ترجمہ کیا ہے

لکھائی چھپائی عمدہ۔ بہترین گٹ اپ اور عمدہ کامند